فکر پرویز اور قرآن

تحریر و تحقیق:

حیدر علی

نام کتاب: فکرِ پرویز اور قرآن

مصنف: حیدر علی

سنِ اشاعت: 2008ء

اہتمام:

مطبع:

تعداد:

قیمت:

انٹرنیٹ ورژن: www.ebooksland.blogspot.com

انتساب

زندگی میں اپنے بہترین دوستوں

محمد شاہد پرویز اور محمد اشرف مغل

کے نام

فہرست عنوانات

تمہید

الحمد للہ، آج میں اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ اس کام کی تکمیل اللہ تعالی کی مدد اور دوستوں کے تعاون کی وجہ سے ممکن ہو سکی ہے۔ میں نے قریباً دس سال فکرِ پرویز کی نشرواشاعت میں گزارے۔ پرویز صاحب سے میرا تعارف 1989ء میں ہوا۔ جب میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اور پھر میں نے باقاعدہ طور پر ان کے (ویڈیو) دروس میں جانا شروع کیا۔ جس کا اہتمام مقامی بزم طلوع اسلام کر رہی تھی۔ لیکن کتب کی بہ نسبت پرویز صاحب کا اندازِ تقریر زیادہ مسحور کن تھا۔ ضمناً عرض کرتا چلوں کہ اس وقت مختلف دوستوں کے ساتھ بحث کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ اتفاق سے ایک دوست کا رابطہ جامعہ سلفیہ کے کچھ غیر ملکی طلباء سے ہو گیا ان سے اکثر دینی موضوعات پر گھنٹوں بحث ہوا کرتی تھی۔ اور کتب کا بھی تبادلہ ہوا کرتا تھا۔ ایک دن ہم نے ان طلباء کو پرویز صاحب کا درس سنوایا۔ اور درس کے اختتام پر ہم نے کہا کہ اب بحث کا آغاز کریں۔ مگر ان دوستوں نے کہا کہ "پرویز صاحب نے ہمیں ہپناٹائز کر دیا ہے۔"

اس وقت فکرِ پرویز کی بنیاد پر کچھ عملی تحریکیں موجود تھیں۔ جن میں سے میرا تعلق 'اقراء' سے ہو گیا۔ جس نے بعد میں تین تحریکوں کے ادغام سے 'المسلمون' کے نام سے کام کا آغاز کیا۔ میری زندگی کا فکری موڑ اس وقت آیا جب تحریک کے اندر نماز کے مسئلہ نے شدت سے سر اٹھایا۔ اور اس پر باقاعدہ طور پر نشستوں کا آغاز ہوا۔ تو تیاری کے دوران میں نے مختلف موضوعات کا مطالعہ شروع کیا اور 'عبادت' کے موضوع پر جب قرآنی آیات کو اکٹھا کیا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہ ہم تو عبادت کو اللہ کی محکومیت اور اس کے قوانین کی اطاعت ہی سمجھتے تھے۔ مگر جب قرآن نے یہ الفاظ استعمال کئے قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَالَا یَنۡفَعُکُمۡ شَیۡئًا وَّلَا یَضُرُّکُمۡ ۵ اُفٍّ لَّکُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۵ (21/66-67) (حضرت ابراہیمؑ) نے کہا کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی

پرستش کرتے ہو جو تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکیں اور نہ کوئی نقصان (تکلیف)۔ تف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے۔" من دون اللہ کے الفاظ نے عبادت کے مفہوم کو واضح کر دیا۔ یعنی جیسی عبادت بتوں کی کی جاتی تھی، ویسی ہی اللہ تعالی کی کرنے کا زور دیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے قرآن کریم کا باقاعدہ ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے میں پڑھتا گیا میری فکر کا زاویہ 360° پر گھوم چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے نماز میں باقاعدگی پیدا کر لی اور اللہ تعالی کے حضور توبہ کی۔

2008ء میں میں نے باقاعدہ طور پر پرویز صاحب پر تنقید لکھنا شروع کی۔ اور حافظ محمد یوسف صاحب نے میری حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ چونکہ تم اس فکر سے عرصہ دراز تک وابستہ رہے ہو۔ اس لیے تم جو بھی لکھو گے اس میں باقی لوگوں کی بہ نسبت تمہاری بات زیادہ وزنی ہو گی۔ اس طرح میں نے مختلف دوستوں سے پرویز صاحب کی کتب لے کر دوبارہ سے ان کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ان پر تنقید لکھتا رہا۔ اس عرصہ میں معاش کے سلسلہ میں اڑھائی سال تک سعودیہ مقیم رہا۔ جہاں اس کام کو بالکل بھی ہاتھ نہ لگا سکا۔ اس کے بعد واپسی پر میں نے تنقید لکھنے کا فیصلہ منسوخ کیا۔ کیونکہ میں نے سمجھا کہ آخر یہ لوگ تعداد میں ہیں ہی کتنے کہ ان پر کچھ لکھا جائے۔ لیکن دوبارہ حافظ محمد یوسف صاحب کی رغبت پر کام کا آغاز کیا۔ کام خاصا کٹھن تھا، اور معاشی معاملات سے فراغت کے بعد بہت ہی کم وقت دستیاب تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے یہ کام مکمل کر لیا۔ اس کے بعد کا مرحلہ زیادہ کٹھن تھا یعنی نظر ثانی کا۔ اس کے لیے میرے ذہن میں دو شخصیات تھیں کہ جن میں سے ایک، اس کام پر نظر ڈال دے اور مجھے تسلی ہو جائے کہ فکری اعتبار سے میرے کام میں کجی تو نہیں ہے۔ وہ تھے جناب عبید الحمید فاروقی صاحب اور جناب افتخار تبسم صاحب۔ افتخار صاحب سے عرصہ دراز سے رابطہ نہیں تھا۔ مگر قدرتی طور پر ان سے دوبارہ رابطہ ہو گیا۔ اور پھر فطرت نے ایسا سبب پیدا کیا کہ ضروری کام کے سلسلہ میں ان کو فیصل آباد میں دس دن تک قیام کرنا پڑا۔ اس دوران میں انہوں نے مسودہ ملاحظہ کیا۔ اور میری مزید حوصلہ افزائی کی اور راہنمائی کی۔

اور پھر جناب افتخار تبسم صاحب کی کاوشوں سے محترم امتیاز صاحب نے اس کتاب کی اشاعت کا بار اٹھایا۔ اور پروف ریڈنگ بھی کی۔ اور ساتھ ہی میری تحریر پر تنقیدی نوٹ لکھے۔ جن کو اس کتاب کے آخر میں من وعن شائع کیا جارہا ہے۔

میری یہ کاوش کیلانی صاحب اور قاسمی صاحب سے کچھ مختلف ہے۔ کیونکہ اس میں الفاظ یا جملوں پر پکڑ نہیں کی گئی۔ بلکہ تصورات اور اساسات پر تنقید کی گئی ہے۔ اور اس کو خالص قرآن کریم کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ چونکہ پرویز صاحب کا یہ دعوی رہا ہے کہ اگر کوئی فرد ان کی فکر پر قرآن کریم سے کوئی دلیل لاتا ہے تو وہ فوری رجوع کرلیں گے۔ اب پرویز صاحب تو دنیا میں نہیں رہے۔ اس لیے متبعین پرویز سے گزارش ہے کہ وہ اپنی فکر پر دوبارہ سے تدبر کریں اور میرے اٹھائے گئے نکات کا قرآن کریم کی روشنی میں جواب دیں۔ یا پھر اس کو قبول کر کے فکر پرویز سے تائب ہو جائیں۔

میری پرویز صاحب سے کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے مجھے سکھایا ہے کہ کوئی بھی بات یا نظریہ سامنے آجائے تو اس کی پرکھ صرف اور صرف قرآن کریم ہی کی روشنی میں کرنی ہے۔ اب میں نے ان کی فکر کو ہی قرآن کریم کی روشنی میں پرکھا ہے۔ ان کی تعلیم نے مجھے قرآن کریم کے بہت قریب کر دیا ہے۔ اور غیر از قرآن چیزوں سے بہت دور کر دیا ہے۔ اسی لیے میں نے آخری باب ان کے نام کیا ہے۔

آخر میں پرویز صاحب کے الفاظ میں، اگر میری اس کاوش سے کسی ایک فرد نے بھی فکر پرویز چھوڑ کر خالص قرآن کی تعلیمات کو قبول کر لیا، تو میں سمجھوں گا مجھے میری عرق ریزیوں کا صلہ مل گیا۔

حیدر علی

فیصل آباد ستمبر 2008ء

باب اول: قرآن فہمی

ہم سب سے پہلے علامہ غلام احمد پرویز کے قرآن کریم سمجھنے کے انداز کا جائزہ لیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا انداز دیگر اکابرین امت کے انداز سے بالکل مختلف ہے لیکن نیا نہیں۔ تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو پرویز صاحب کا کام آئمہ معتزلہ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور برصغیر میں اس انداز کے کام کا آغاز سر سید احمد خان نے کیا لیکن پرویز صاحب نے اسے تحریر و تقریر کے ذریعے تکمیل کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ سر سید احمد خان کا بنیادی نقطہ نظر یہ تھا کہ تمام کائنات work of God ہے اور قرآن کریم word of God۔ اس لیے ان دونوں میں تضاد ناممکن ہے۔ چونکہ سلسلہء کائنات علت و معلول کی جکڑبندیوں پر مشتمل ہے اور اسے بعید از عقل چیزوں سے کوئی کلام نہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ اصول متعین کر لیا کہ قرآن کریم میں کوئی بھی چیز ماورائے عقل نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ایسی چیزیں موجود ہیں تو ان کا مفہوم اس طریقہ سے بیان کیا جائے کہ وہ عقل کی کسوٹی پر پورا پورا اتریں۔ اسی اصول کو پرویز صاحب نے مدّ نظر رکھا اور اسی کے مطابق ہی قرآنی تعلیمات کو بیان کیا۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے چند اصول متعین کئے ہیں ہم ایک ایک کر کے ان کا جائزہ لیں گے۔

ترجمہ

پرویز صاحب کا تصور ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا صرف مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم مروجہ تراجم سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں

-" کتب احادیث و تفاسیر کے بعد تراجم کی طرف آیئے۔ اردو کے موجود تراجم میں شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ مستند ترین سمجھا جاتا ہے۔ اس ترجمہ کا انداز اس قسم کا ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ج فَلَمَّآ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ٥ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ٥ لا أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ط وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكٰفِرِينَ ٥ (2/17-19)

مثال ان کی ہے جیسے مثال اس شخص کی جلاوے آگ۔ پس جب روشن کیا جو کچھ گرد اس کے تھا، لے گیا اللہ روشنی ان کی اور چھوڑ دیا ان کو بیچ اندھیروں کے نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں پھر آتے۔ یا مانند مینہ کے آسمان سے بیچ اس کے اندھیرے ہیں اور گرج ہے اور بجلی۔ کرتے ہیں انگلیاں اپنی بیچ کانوں اپنے کے کڑک سے ڈر موت کے سے۔ اور اللہ گھیرنے والا ہے کافروں کو۔

اس ترجمہ پر تنقید مقصود نہیں، لیکن یہ تو واضح ہے کہ جب ایک تعلیم یافتہ نوجوان اس کی شکایت کرے کہ اس ترجمہ سے قرآن کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کی یہ بات ایسی نہیں جس پر اسے جھڑک دیا جائے۔ اس پر توجہ دینا ضروری ہے۔

ترجمہ مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ، خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو، قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا۔۔۔ حتیٰ کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ کی جگہ، خود عربی زبان کے دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو بھی بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ قرآن کریم کا انداز اور اسلوب بالکل نرالا ہے۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ تو اس کے عربی زبان ہی کے ہیں، لیکن ان میں جامعیت اس قدر ہے کہ نہ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لے سکتے ہیں اور نہ ہی ترتیب میں ردّوبدل کرنے سے وہ بات باقی رہ سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے ترجمہ میں اس

کا پورا پورا مفہوم آ نہیں سکتا۔ اس باب میں امام ابن قتیبہؒ (متوفی 728ھ) کتاب القرطین میں عربوں کے مختلف اسالیب بیان کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں

" قرآن کریم کا نزول، ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں (کماحقّہ) نہیں کر سکتا، جیسا کہ ترجمہ کرنے والوں نے انجیل کا ترجمہ سریانی زبان سے حبشی یا رومی زبان میں کر لیا تھا، ایسے ہی زبور اور تورات کے تراجم کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ اگر آپ قرآن کریم کی اس آیت کا ترجمہ کرنا چاہیں وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡہِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ط (8/58) تو آپ قیامت تک ایسے الفاظ مہیا نہیں کر سکتے جو ان معنوں کو ادا کر دیں جو اس آیت میں ودیعت ہیں بجز اس کے کہ آپ اس نظم و ترتیب کو توڑ کر الگ الگ چیزوں کو ملائیں اور جو چیزیں اس میں ودیعت کی گئی تھیں انہیں اس طرح ظاہر کر دیں، اور یوں کہیں کہ " اگر تمہارے درمیان اور کسی قوم کے درمیان صلح اور معاہدہ ہو، اور تمہیں ان سے خیانت اور نقض عہد کا اندیشہ ہو، تو پہلے انہیں بتادو کہ جو شرائط تم نے ان کے لئے منظور کی تھیں، تم نے انہیں توڑ دیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان کے خلاف اعلان جنگ کر دو تاکہ تم اور وہ دونوں نقض عہد کو جان لینے میں برابر برابر ہو جائو۔"

ایسے ہی قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ہے۔

فَضَرَبۡنَا عَلٰۤی اٰذَانِہِمۡ فِی الۡکَہۡفِ سِنِیۡنَ عَدَدًا ۙ (18/11)

اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کر دیں تو اس سے وہ مضمون قطعاً نہیں سمجھا جاسکے گا جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ " ہم نے انہیں چند سال تک سلائے رکھا" تو اب بھی آپ نے مضمون کا ترجمہ تو کر دیا، مگر الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکے۔

ایسے ہی قرآن کریم کی تیسری آیت ہے

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۵ (73/25)

اگر آپ اس آیت کا ترجمہ اس کے الفاظ کے مطابق کریں گے تو وہ ایک معلق بات بن جائے گی۔ اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ " وہ لوگ اس سے تغافل نہیں برتتے۔" تو اس سے آپ نے مضمون کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ ترجمہ نہیں کیا۔ (قرطین جلد دوم۔ صفحہ 163)

ایک مستشرق کی رائے

یہ تو اپنوں کی رائے ہے۔ غیروں میں سے بھی جس نے قرآن کریم کا مطالعہ بنظر غائر کیا ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ (کماحقّہ) کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ مشہور مستشرق گب (H.A.R Gibb) اپنی کتاب (Modern Trends in Islam - 1945 ed.) میں لکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے۔۔۔ قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اس کے ۔'عربی زبان کے' تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن عام واقعات یا قوانین واحکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو، لیکن، بایں ہمہ، جو مدّ و جزر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں، اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آ سکے گا۔ ذرا اس صاف اور سیدھی آیت کو لیجئے

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ۵لا (43/50)

اور انگریزی ہی نہیں دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے اس کے چھ الفاظ میں جو پانچ مرتبہ "ہم" (We) کی تکرار ہے اسے کونسی زبان ادا کر سکے گی؟

(صفحہ۔4 ترجمہ رواں)" (مفہوم القرآن۔ تعارف صفحہ ح تا د)

اس کے علاوہ پرویز صاحب صفحہ "خ" کے فٹ نوٹ پر لکھتے ہیں۔

" اس میں شبہ نہیں کہ عجمی زبانوں میں، عربی زبان کی سی وسعت نہیں، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ، عربی زبان کے علاوہ، اس میں قرآن کریم کے خاص اسلوب کو بنیادی دخل ہے۔ اور یہ خصوصیت ہر آسمانی کتاب کی ہوتی ہے۔ وحی کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے خواہ اس کی زبان کوئی بھی ہو۔ آج ہمارے سامنے قرآن کریم کے علاوہ، کوئی اور آسمانی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ورنہ ہم دیکھتے کہ وحی کی زبان کا ترجمہ (کماحقہٗ) ہو نہیں سکتا، خواہ وہ کوئی آسمانی کتاب ہو۔ انجیل اور تورات کے جو تراجم ہمارے سامنے ہیں، اوّل تو وہ اصل کتابوں کے براہ راست تراجم نہیں۔ اور اگر (بفرض محال) یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ اصل کتابوں کے تراجم ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اصل کیا تھا اور وہ ترجمہ میں آکر کیا ہو گیا؟"

یہ تھا پرویز صاحب کا ترجمہ کے بارے میں تصور۔ قرآن کریم نے اپنے بارے میں کہا ہے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۵(26/195) یہ قرآن واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ بات قرآن کریم میں دیگر کئی مقامات پر بھی بیان ہوئی ہے۔ زبان میں سب سے بنیادی چیز "لفظ" یا "نام" ہے۔ ہر چیز اپنے تعارف کے لئے "نام" رکھتی ہے اور ہر عمل اپنی پہچان کے لئے الفاظ کا محتاج ہے۔ اس کے بعد ہے ان اعمال یا افعال کو بیان کرنے کا طریقہ۔ اس کے لئے ہر زبان میں گرائمر کے قواعد، بلاغت کے اسلوب، ایک ہی لفظ کے مختلف المعانی استعمالات، ضرب الامثال اور محاورات موجود ہوتے ہیں۔ اور ہر زبان میں یہ قواعد اختلاف کے ساتھ پائے جاتے

ہیں۔ مثلاً اردو میں ایک اور زیادہ چیزوں کے لئے۔"واحد اور جمع" کے صیغے موجود ہیں لیکن عربی میں دو کے لئے تثنیہ کا صیغہ بھی موجود ہے۔ یا اردو میں تم، تو اور آپ، مخاطب کے لئے استعمال ہوتے ہیں لیکن انگریزی میں صرف ایک لفظ You ہی کافی ہے۔ اسی طرح دیگر اختلافات بھی موجود ہیں۔ ترجمہ کرنا ایک فن ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے والا دونوں زبانوں کے اسالیب سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔ اب قرآن کریم میں یہ چیز بتکرار موجود ہے کہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اور یہ ویسی ہی زبان ہے جس پر قواعد و ضوابط کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ آج تک کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت گرائمر کے اصولوں یا بلاغت کے کسی اسلوب کے خلاف ہے۔ اسی طرح آج تک کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ کسی عالم نے قرآن کریم کا یا اس کی کسی آیت کا ترجمہ غلط کر دیا ہے۔ اور وہ جملہ قواعد گرائمر کے بالکل برعکس ہے۔ اب رہی یہ آیت۔

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ اِلَیۡنَا الۡمَصِیۡرُ ۵لا (50/43)

"ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔"

تو اس آیت میں عربی اسلوب استعمال ہوا ہے۔ وہ اسلوب یا قاعدہ اردو میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اس کی بجائے اردو زبان کا جو اسلوب ہے وہی استعمال کیا جائے گا لیکن کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن کی اس آیت کا یہ ترجمہ از روئے قوانین زبان غلط ہے۔ یہاں تک کہ پرویز صاحب نے بھی آج تک کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ قرآن کی فلاں آیت کا ترجمہ عربی کے فلاں قاعدے کی رو سے درست نہیں ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے اپنے اس تصور کہ قرآن کریم کا ترجمہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے کی خوب تشہیر کی ہے اور ترجمے کی جگہ مفہوم کیسا ہے؟ اس کی ایک مثال حاضر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۵

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

اوپر قرآن کریم کی ایک آیت دی گئی ہے اور ساتھ اس کا ترجمہ۔ اردو زبان بولنے والے کسی بھی شخص کو اس ترجمہ پر اعتراض نہیں ہے لیکن چونکہ پرویز صاحب نے بذات خود ایک اصول متعین کر لیا کہ ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ اس آیت کا مفہوم اس انداز میں کرتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۵

خدائے رحمن و رحیم نے اس کتاب عظیم کو اس لئے نازل کیا ہے کہ اس نے اشیائے کائنات اور نوع انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری لے رکھی ہے وہ پوری ہو جائے (6/6:54/12) یہ نشوونما وحی کی راہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ (17/82،10/57-58)

چونکہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں اس لئے خدا کے بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بھی ارادہ کریں اس سے مقصد خدا کے اس پروگرام کی تکمیل ہو۔ (6/16) "

(مفہوم القرآن۔ صفحہ 1)

پرویز صاحب نے اس بات کی بالکل وضاحت نہیں کی کہ زبان دانی کے وہ کونسے قواعد و ضوابط ہیں جن کی بنا پر عربی الفاظ کا یہ مفہوم نکلتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر کوئی کام اصول و ضوابط کی بنا پر ہو تو ایک ہزار آدمی بھی کرے تو ایک جیسا کرے گا۔ مگر پرویز صاحب نے جو مفہوم متعین کیا ہے چودہ سو سال میں اس کی کوئی ایک بھی مثال پیش نہیں کی کہ ان کا مفہوم کسی ایک سے بھی ملتا جلتا ہے۔ آخر ایسے کونسے قواعد ہیں جن سے ہمارے آباؤ اجداد محروم رہے۔

اب ایک طرف تو پرویز صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کی آیات کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر مقام حیرت ہے کہ اپنے لٹریچر میں جہاں بھی حوالہ کی آیات آتی ہیں وہاں ان کا ترجمہ ہی دیا گیا ہے۔ مثلاً

قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ج اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ٥ (20/94)

"ہارون بولا! اے میرے عزیز بھائی میری داڑھی اور سر کے بال نہ نوچ (میں نے اگر سختی میں کمی کی تو صرف اس خیال سے کہ) میں ڈرا، کہیں تم یہ نہ کہو، تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کی راہ نہ دیکھی۔"

قَالَ فَمَا خَطْبُکَ یٰسَامِرِیُّ ٥ (20/95)

"تب موسیٰؑ نے (سامری سے) کہا، سامری! یہ تیرا کیا حال ہوا۔"

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ یَبْصُرُوْا بِہٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُھَا وَکَذٰلِکَ سَوَّلَتْ لِیْ نَفْسِیْ ٥ (20/96)

"کہا کہ میں نے وہ بات دیکھ لی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی۔ اس لیے (اللہ کے) رسول کی پیروی میں، میں نے بھی کچھ حصّہ لیا تھا۔ پھر اسے چھوڑ دیا، کیا کہوں میرے جی نے ایسی ہی بات مجھے سمجھائی۔"

قَالَ فَاذْھَبْ فَاِنَّ لَکَ فِی الْحَیٰوۃِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَکَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَہٗ ج وَانْظُرْ اِلٰٓی اِلٰھِکَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْہِ عَاکِفًا طلَنُحَرِّقَنَّہٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّہٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ٥ (20/97)

موسیٰؑ نے کہا اگر ایسا ہے تو جا، زندگی میں تیرے لیے یہ ہونا ہے کہ کہے میں اچھوت ہوں، اور (آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں۔ اور دیکھ تیرے (گھڑے ہوئے) معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جما بیٹھا تھا۔ ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے۔ اور راکھ میں اڑا کر بہا دیں گے۔

اِنَّمَآ اِلٰھُکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ٥ (20/98)

"معبود تمہارا بس اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی ہے جو ہر چیز پر اپنے علم سے چھایا ہوا ہے۔" (برق طور صفحہ۔117-118)

اس کے علاوہ دیکھئے۔

" صَدَقَ کے معنی ہیں اس نے جو کچھ کہا اس پر عمل کر کے اسے سچ کر دکھایا۔ سورہ احزاب میں ہے مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ (33/23) مومنوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا۔ اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے وَلَقَدْ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (3/152) یقیناً اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ سورۃ زمر میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ (39/74) حمد اللہ کے لیے ہے جس نے اس وعدہ کو جو اس نے ہم سے کیا تھا سچ کر دکھایا۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشاد کی راہ یہ ہے کہ تم صحیح تصورات حیات کے بعد، اپنے اعمال و کردار سے انہیں سچ کر کے دکھادو۔ ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط (2/177) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ عمل سے سچ کر دکھانے کے علاوہ، اعتقادات و تصورات حیات کے معاملہ میں صادق وہ ہے جو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کر سکے (2/11) اسی میں اس دعویٰ کی تقویت کا راز ہے۔ (لغات القرآن صفحہ۔1014 ص دق)

علامہ پرویز صاحب کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھئے وہاں قرآنی آیات کا ترجمہ ہی دیا گیا ہے مگر یہ عجیب تضاد ہے کہ ایک طرف یہ دعویٰ کہ ترجمہ ہونا ناممکن ہے مگر دوسری طرف اس کا استعمال بھی ہو رہا ہے۔ اس لئے ترجمہ کے بارے میں پرویز صاحب کا تصور درست نہیں ہے۔ کیونکہ بہر حال ترجمہ عربی زبان کے موجود قواعد کے مطابق ہی ہوتا ہے

مادہ(Root)

عربی زبان کی ایک خصوصیت ہے کہ اس میں ہر لفظ کا ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے۔ جس میں اس لفظ کے بنیادی معانی موجود ہوتے ہیں۔ الفاظ اپنی اشکال بدلتے رہتے ہیں مگر مادہ کا بنیادی مفہوم تمام الفاظ میں موجود رہتا ہے۔

یہ بات دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے کہ ایک ایک لفظ کے بہت سے معانی ہوتے ہیں۔ لیکن کسی مقام پر کوئی لفظ کیا معانی دیتا ہے اس کا تعین سیاق وسباق کرتا ہے مثلاً عربی کا ایک لفظ ہے ضَرَبَ، اس کا معنی ہے مارنا۔ اور قرآن کریم کی اس آیت میں مارنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فَاضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ اپنے عصا کو پتھر پر مارو، لیکن ایک اور آیت ہے ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا، یعنی اللہ مثال بیان کرتا ہے۔ اب یہاں اس کا مطلب مثال مارنا نہیں کئے جاسکتے۔ کیونکہ سیاق وسباق اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی طرح کی اور بھی بے شمار مثالیں ہیں۔

اب علامہ پرویز صاحب الفاظ کے مادہ کو بنیاد بنا کر کس طرح مفہوم اخذ کرتے ہیں، آیئے دیکھتے ہیں۔

" مادہ کے بنیادی مفہوم اور ان صحرا نشینوں کے ہاں ان الفاظ کے عملی استعمال سے الفاظ کا صحیح مفہوم کس طرح سامنے آجاتا ہے۔ اسکا اندازہ ایک مثال سے لگایئے۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ٥ (2/153) یہ حقیقت ہے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ لفظ صبر کے جو معنی ہمارے ہاں مروّج ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب کسی پر ایسی مصیبت آپڑے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ جہاں انسان یکسر بے چارہ اور بے کس و بے بس ہو کر رہ جائے۔ جہاں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، وہاں ہم کہتے ہیں کہ میاں صبر کرو۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ حتیٰ کہ جب کوئی کمزور وناتواں مظلوم کسی کے ظلم وزیادتی کے خلاف کچھ نہ کر سکے تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ " اچھا! میرا صبر "۔ لیکن عربی مبین میں اس مادہ (ص۔ب۔ر) کے بنیادی معنی ہیں، کسی شخص کا مطلوبہ شے کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا، جم کر کھڑے ہو جانا، ثابت قدم رہنا۔ اب دیکھئے کہ صحرا نشین عرب اس مادہ کو کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ بادل کا وہ ٹکڑا جو چوبیس گھنٹے

ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر ادھر نہ ہو، الصبیر کہلاتا تھا۔ الاصبیرہ ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے تھے جو صبح جنگل میں چرنے کے لیے چلے جائیں اور شام کو ٹھیک انہی قدموں پر واپس آجائیں۔ نہ کوئی ادھر ادھر ہو، نہ پیچھے رہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان (عربوں) کے ہاں صبر کے معنی تھے استقامت، استقلال، استواری، ثابت قدمی، ایک اصول اور روش پر جم کر کھڑے رہنا، عمل میں دوام واستمرار۔ یہ ہے صبر کی وہ کیفیت جو انسان کے اپنے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اب اس سے آگے بڑھئے۔ اگر کبھی بوجھ یا سواریوں کی کمی بیشی سے کشتی کا توازن بگڑ جائے اور وہ ڈگمگانے لگے تو ملاح ایک بڑا سا پتھر کشتی میں رکھ دیتے تھے جس سے اسکا وزن ہموار ہو جاتا تھا۔ (ہمارے ہاں تانگے والے اکثر ایسا کرتے ہیں)۔ اس پتھر کو الصابورہ کہتے ہیں۔ لہذا صبر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کسی کے پائوں ڈگمگانے لگیں تو "صبر" سے اس کا توازن برقرار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے پائوں میں لغزش نہیں آتی۔ چونکہ اس قسم کے عمل پیہم اور ثبات وقرار کا نتیجہ کامرانیاں اور کامیابیاں ہوتا ہے۔ اسی لئے الصبیرۃ غلے کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو۔

اس لفظ (صبر) کے طریق استعمال کی ان محسوس مثالوں سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں عربوں کے ہاں اس کا مفہوم کیا تھا۔ اس مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

(لغات القرآن صفحہ 14-15)

مزید لکھتے ہیں

" سورۃ بقرہ میں ہے فَمَآ اَصۡبَرَ ھُمۡ عَلَی النَّارِ ۵ (2/175) اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان میں آگ کے مقابلہ کی تاب کس قدر ہے اور یہ بھی کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے انہیں آگ کے عذاب کو جم کر برداشت کرنے پر آمادہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان معانی میں جرأت کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا لَن نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ (2/61) ہم ایک ہی کھانے پر ہمیشہ کے لئے نہیں رہ سکتے۔ اسی سورۃ (بقرہ) میں ہے۔ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (2/250) یہاں "ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا" کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے فَمَا وَهَنُوا لِمَا اَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ط (3/146) انہیں خدا کی راہ میں جس قدر بھی مشکلات کا سامنا ہوا ان سے وہ نہ تو سست گام ہوئے، نہ ان میں کمزوری آئی اور نہ ہی وہ مغلوب ہوئے۔ اگلی آیت میں اسی کو پھر "ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا" سے تعبیر کیا گیا ہے (3/147)۔ سورۃ الفرقان میں ہے کہ کفار کہتے تھے کہ یہ (رسولؐ) ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا دیتا لَوْ لَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ط (25/42) اگر ایسا نہ ہوتا کہ ہم مستقل مزاجی سے ان کی پرستش پر قائم رہتے۔ یہی معنے سورۃ ص میں وَاصْبِرُوْا عَلٰی اٰلِهَتِكُمْ (38/6) کے ہیں۔ (14/21) میں صَبَرْنَا بمقابلہ جَزِعْنَا آیا ہے۔ جَزْعٌ کے معنی ہیں رسی کو درمیان سے کاٹ دینا۔ لہذا صبر کے معنی کسی کام کو مسلسل کئے جانا ہونگے۔ سورۃ کہف و حجرات میں صبر کا لفظ ان معنوں میں بھی آیا ہے جس کے لئے ہم کہتے ہیں کہ بے صبرے کیوں ہوتے ہو؟ (Don't be impatient)، ذرا ٹھہرو۔ یونہی بے چین مت ہو۔ (68/5:18/49) سورۃ انفال میں ہے کہ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ج (8/65) اگر تم میں سے بیس مجاہد بھی ایسے ہوں جو جم کر مقابلہ کریں تو فریق مخالف کے دو سو پر غالب آجائیں گے۔ انہی کو اَلصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (2/177) کہا گیا ہے سورہ مریم میں ہے وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ط (19/65) خدا کی عبادت نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے اختیار کرو۔

یہ ہے وہ صبر جسکے متعلق کہا گیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط (2/153) اپنی قوتوں کی پوری نشوونما اور اعتدال و تناسب کے لئے صبر اور صلوۃ کی راہ اختیار کرو۔ اور اس کے بعد ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ٥ اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں۔ اور مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہیں وہ صابر جن کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف (2/157)

یہ ہے صَبۡرٌ کا قرآنی مفہوم۔ اس کے بر عکس صبر کے جو معنے ہمارے ہاں مروج ہیں وہ بالکل اس کی ضد ہیں۔ ہمارے ہاں صبر کے معنے یہ ہیں کہ انسان بے کس اور بے بس، مجبور بن کر بیٹھا رہے اور زبردست اور ظالم کے ظلم و زیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ ہم اپنی انتہائی بے چارگی میں کہتے ہیں کہ ''اچھا جو تمہارے جی میں آئے کر لو۔ میں صبر کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔'' اور اسی صبر کی تلقین یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ '' میاں! صبر کرو، صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔''یعنی صبر انتہائی بے چارگی کا نام ہے۔ غور کیجئے کہ نگاہوں کا زاویہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ قرآنی صبر کا مفہوم تھاڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ اور ہمارے صبر کا مفہوم ہے انتہائی بے چارگی میں سپر ڈال دینا۔

مختصراً یہ کہ صَبۡرٌ کے معنی ہیں اپنے پروگرام پر استقامت اور استقلال سے کاربند رہنا اور اس کے راستہ میں جو مشکلات آئیں ان کا ہمت اور استقلال سے اس طرح مقابلہ کرنا کہ پاؤں میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ قرآن کریم میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ اِصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا (3/199) اِصۡبِرُوۡا کے معنے ہیں ہمت اور استقلال سے اپنے موقف پر قائم رہنا۔ اور صَابِرُوۡا کے معنے ہیں اس استقلال اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنا۔ یا دوسروں کے مقابلہ میں استقامت دکھانا یا ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بننا۔

دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، نہ آگے بڑھ سکتی ہے، جب تک وہ (قرآنی مفہوم) میں الصابر نہ ہو۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں '' صابر و شاکر'' ہو۔ اسے کبھی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ (لغات القرآن۔ 1005-1003)

ہم یہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ عربی کے ایک لفظ کے مختلف معانی ہو سکتے ہیں۔ اور سیاق و سباق ہی ایک ایسا پیمانہ ہے جو کسی خاص مقام پر اس لفظ کا معانی متعین کر سکتا ہے۔ پرویز صاحب نے صبر کے معانی استقامت، ثابت قدمی، استقلال اور بلند ہمتی کئے ہیں جس کے لیے انہوں نے قرآنی مثالیں بھی دی ہیں۔ ہمیں ان معانی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر اعتراض کی بات یہ ہے کہ پرویز صاحب نے صرف یہی معانی اور ان سے

متعلقہ قرآنی مثالیں اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے لی ہیں۔ اور صبر کا جو مفہوم ہمارے ہاں رائج ہے اس کی نہ صرف انہوں نے نفی کی ہے بلکہ اس سے متعلقہ قرآنی آیات بھی لغت کے اس حصے میں شامل نہیں کیں۔ علاوہ ازیں رائج مفہوم کے مطابق "صابر و شاکر" قوم کو زندگی نہ نصیب ہونے کی سند عطا کی ہے۔

اب ہم چند قرآنی آیات پیش کریں گے جن سے یہ واضح ہو گا کہ صبر کا وہ مفہوم بھی قرآن کریم کے عین مطابق ہے جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے یعنی انسان کی ایسی کیفیت جس میں وہ بالکل بے کس اور بے بس ہو جائے اور اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دے۔ اس سے پہلے ہم صبر کے وہ معانی بیان کر رہے ہیں جو "فیروز اللغات" (اردو لغت) میں درج ہیں۔

۱۔ شکیبائی، خاموشی ۲۔ برداشت، بردباری، تحمل ۳۔ توقف، تامّل ۴۔ خدا کی مار، کسی کا دل دکھانے کی آفت ۵۔ توکّل، قناعت

۱۔ قَالُوا یٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَھَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَکْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَہُ الذِّئْبُ ج وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ کُنَّا صٰدِقِیْنَ ۵ وَجَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِہٖ بِدَمٍ کَذِبٍ ۵ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ط وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ۵ (12/17-18)

"کہنے لگے کہ ابا جی ہم تو آپس میں دوڑ میں لگ گئے اور یوسفؑ کو ہم نے اسباب کے پاس چھوڑا پس اسے بھیڑیا کھا گیا۔ آپ ہماری بات ماننے کے نہیں گو ہم بالکل سچے ہی ہوں۔ اور یوسفؑ کے کُرتے کو جھوٹ موٹ کے خون سے خون آلود بھی کر لائے تھے باپ نے کہا یوں نہیں! بلکہ تم نے اپنے دل ہی سے ایک بات بنالی ہے۔ پس صبر ہی بہتر ہے۔ اور تمہاری بنائی ہوئی باتوں پر اللہ ہی سے مدد طلب کی ہے۔"

اب یہاں کیا کیفیت سامنے آتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ بالکل بے بس ہیں۔ جان سے پیارے بیٹے کے بارے میں آکر کہا جا رہا ہے کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے اور اس کی خون آلود قمیض بھی پیش کی جا رہی ہے۔ مگر ایسی حالت میں آپؑ یہی جواب دیتے ہیں کہ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اور اللہ سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ تو

ایک پیغمبر کی کیفیت ہے ہمارے ہاں کسی شخص کا کوئی عزیز وفات پا جائے یا کوئی اور متاع چھن جائے تو اسے یہی کہا جاتا ہے کہ خدا کا یہی فیصلہ ہے اس لیے صبر کرو۔ یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان پر کوئی ایسی آفت آپڑے جس کا مداوانہ کیا جاسکے تو سب سے بہتر راہ برداشت اور صبر ہی کی ہے۔

۲۔ اِرْجِعُوْا اِلٰی اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ج وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ ۵ وَسْــٴَـلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ط وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۵ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ط عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۵ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ ۵ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِیْنَ ۵ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۵ (12/81-86)

” تم سب والد کی خدمت میں واپس جائو اور کہو کہ ابّا جی آپ کے صاحبزادے نے چوری کی اور ہم نے وہی گواہی دی تھی جو ہم جانتے تھے۔ ہم کچھ غیب کی حفاظت کرنے والے تو نہ تھے آپ اس شہر کے لوگوں سے دریافت فرمالیں جہاں ہم تھے اور اس قافلہ سے بھی پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آئے ہیں اور یقینا ہم بالکل سچے ہیں۔ (یعقوبؑ نے) کہا یہ تو نہیں، بلکہ تم نے اپنی طرف سے بات بنالی۔ پس اب صبر ہی بہتر ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالی ان سب کو میرے پاس پہنچا ہی دے۔ وہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ پھر ان سے منہ پھیر لیا اور کہا آہ یوسف! ان کی آنکھیں بوجہ رنج و غم کے سفید ہو چکی تھیں اور وہ غم کے مارے گھٹے جا رہے تھے۔ بیٹوں نے کہا واللہ آپ ہمیشہ یوسفؑ کی یاد ہی میں لگے رہیں گے یہاں تک کہ گھل جائیں۔ یا ختم ہی ہو جائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں تو اپنی پریشانیوں اور رنج کی فریاد اللہ ہی سے کر رہا ہوں۔ مجھے اللہ کی طرف سے وہ باتیں معلوم ہیں جن سے تم سراسر بے خبر ہو۔“

اب یہ دوسرا غم تھا پہلے ایک بیٹا جدا ہو گیا اب بڑھاپے میں دوسرا بھی چوری کے الزام میں جدا ہو گیا۔ پہلے بیٹے کے غم میں کئی برس بیت گئے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں مارے غم کے سفید ہو گئیں لیکن ان کا جواب

اب بھی وہی تھا یعنی صبر ہی بہتر ہے۔ اور حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ میں تو اپنی پریشانی اور رنج کی فریاد اللہ ہی سے کرتا ہوں۔ کیا یہ بے کسی اور بے چارگی نہیں ہے کہ اس قدر رنج و غم کے باوجود بھی آپؑ نے فیصلہ اللہ تعالی کی ذات پر چھوڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد بیٹوں کو دوبارہ روانہ کرتے ہیں تو ان کی ملاقات یوسفؑ سے ہوتی ہے اب یہاں بھی یوسفؑ کے الفاظ ملاحظہ کیجئے۔

قَالُوٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوسُفُ ط قَالَ اَنَا يُوسُفُ وَهٰذَآ اَخِىْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ط اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۵ (90/12)

”انہوں نے کہا شاید تو ہی یوسفؑ ہے۔ جواب دیا کہ ہاں میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر فضل و کرم کیا۔ بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیز گاری اور صبر کرے تو اللہ تعالی کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

اس سے واضح ہے کہ زندگی میں مصائب، تکالیف اور دکھوں کو برداشت کرنا اور اللہ پر توکل رکھنا ہی صبر ہے۔

۳۔ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ط وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۵ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۵ (16/41-42)

” جن لوگوں نے ظلم برداشت کرنے کے بعد اللہ کی راہ میں ترک وطن کیا ہے ہم ضرور انہیں دنیا میں بھلائی عطا فرمائیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت ہی بڑا ہے کاش کہ لوگ اس سے واقف ہوتے۔ وہ جنھوں نے دامن صبر نہ چھوڑا اور اپنے پالنے والے پر ہی بھروسہ کرتے رہے۔“

یہاں صبر کرنے والے وہی لوگ ہیں جنھوں نے ظلم برداشت کرنے کے بعد ہجرت کی۔ اور اپنا فیصلہ خدا کی ذات پر چھوڑا۔

۴۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِىْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ ج صلے وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۵ لا وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ج وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۵ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ

اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ ج فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ ۵ وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ھُوَ ج وَاِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِہٖ ط یُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ط وَھُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۵ قُلۡ یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ج فَمَنِ اھۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَھۡتَدِیۡ لِنَفۡسِہٖ ج وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡھَا ط وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ ۵ ط وَاتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَاصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ج وَھُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ۵ (10/104-109)

"آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف شک میں ہو تو میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ لیکن ہاں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان قبض کرتا ہے اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ اور یہ کہ اپنے آپ کو اس دین کی طرف اس طرح متوجہ رکھنا کہ اور سب طریقوں سے علیحدہ ہو جائے اور کبھی مشرک مت بننا۔ اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت مت کرنا جو تجھ کو نہ کوئی نفع پہنچا سکے اور نہ کوئی ضرر پہنچا سکے۔ پھر اگر ایسا کیا تو تم اس حالت میں حق ضائع کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ اور اگر تم کو اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو بجز اس کے اور کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں ہے۔ اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے مبذول فرما دے اور وہ بڑی مغفرت، بڑی رحمت والا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے پہنچ چکا ہے۔ اس لیے جو شخص راہ راست پر آ جائے سو وہ اپنے واسطے راہ راست پر آئے گا اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا اور میں تم پر مسلط نہیں کیا گیا۔ اور آپ اس کا اتباع کرتے رہیے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے اور صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں اچھا ہے۔"

ان آیات میں حضورؐ مشرکوں سے مخاطب ہیں کہ جن چیزوں کی پرستش وہ کرتے ہیں آپؐ ان سے بے زار ہیں اور صرف خدائے واحد کی پرستش کے داعی ہیں اس کے علاوہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی حق کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کی ذات کو ہے اور اگر کوئی بے راہ ہوتا ہے تو اس کا نقصان بھی اسی کو پہنچے گا۔ اور آخری

آیت میں حضورؐ سے واضح انداز میں کہا گیا کہ آپ وحی کا اتباع کریں اور صبر کریں۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ کر دے۔ یعنی اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ برداشت سے کام لیں۔ اور خدا کے فیصلہ تک صبر کریں۔

۵۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۵ ج وَلَا تَقْعُدُوْا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِہٖ وَتَبْغُوْنَھَا عِوَجًا ج وَاذْکُرُوْٓا اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا فَکَثَّرَکُمْ ص وَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ ۵ وَاِنْ کَانَ طَآئِفَۃٌ مِّنْکُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِہٖ وَطَآئِفَۃٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ بَیْنَنَا ج وَھُوَ خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ ۵ (7/85-87)

"اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے پس تم ناپ اور تول پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے مت دو اور روئے زمین میں اس کے بعد کہ اس کی درستی کر دی گئی فساد مت پھیلائو۔ یہ تمہارے لیے نافع ہے۔ اگر تم مومن ہو۔ اور تم راستوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو دھمکیاں دو، اور اللہ کی راہ سے روکو، اور اس میں کجی کی تلاش میں لگے رہو۔ اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم کم تھے پھر اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا اور دیکھو کہ کیسا انجام ہوا فساد کرنے والوں کا۔ اور اگر تم میں سے کچھ لوگ اس حکم پر جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا ایمان لے آئے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لائے ہیں تو ذرا ٹھہر جائو یہاں تک کہ ہمارے درمیان اللہ فیصلہ کئے دیتا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔"

اس آیت میں بھی صاف ظاہر ہے کہ صبر کا حکم اس وقت دیا جا رہا ہے جب فیصلہ کن قوت اللہ کی رہ جاتی ہے اور پھر کسی شخص نے کچھ نہیں کرنا۔ فقط اللہ کے حکم کا انتظار۔

۶۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ۵ وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ط بَلۡ اَحۡیَآءٌ وَّ لٰکِنۡ لَّا تَشۡعُرُوۡنَ ۵ وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۵ لا الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡھُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ لا قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ۵ ط اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ قف وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ ۵ (2/153-157)

”اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد چاہو، اللہ تعالی صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے اور اللہ تعالی کی راہ کے شہیدوں کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے۔ اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے۔ دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے، انھیں جب کبھی کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالی کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔“

اب بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ اللہ کی طرف سے انسان کی مختلف حالتوں میں آزمائش ہے اور کامیاب لوگ وہی ہیں جو صبر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام مصیبتوں میں اللہ ہی کی ذات ہے جو فیصلہ کن ہے اور ہم نے اسی کی طرف واپس جانا ہے۔ ان حالتوں میں انسان بالکل بے بس ہوتا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کرے۔ وہاں یہی کیا جاسکتا ہے کہ ” اب تو میرا صبر ہے اور اللہ ہی میری مدد کرے۔“ اب تو آنے والی مصیبت کو برداشت کرنا ہی ہے۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن اس کے اجر میں رب کی رحمتیں اور سرفرازیاں ہیں۔

۷۔ اَلَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُھُمۡ وَالصّٰبِرِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَھُمۡ وَالۡمُقِیۡمِی الصَّلٰوۃِ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۵ (22/35)

وہ لوگ کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل تھرا جاتے ہیں اور جو برائی انہیں پہنچے اس پر صبر کرتے ہیں نمازوں کی حفاظت و اقامت کرنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات قرآنیہ سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ صبر کا جو مفہوم اس وقت معاشرے میں رائج ہے وہ نصوص قرآنی کے عین مطابق ہے۔ اس لیے پرویز صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ جو قوم ہمارے مفہوم کے مطابق "صابر و شاکر" ہو، اسے زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایسی اور بھی بہت سی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جو اس مفہوم کا اثبات کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے وہ طریقہ دیکھ لیا جس کے مطابق "مادہ" کو بنیاد بنا کر پرویز صاحب الفاظ کا مفہوم بناتے ہیں۔ حالانکہ مفہوم وہی لیا جا سکتا ہے جو سیاق و سباق میں موجود ہو اور یہ بات غیر حقیقی ہے کہ ہم چند آیات پیش کر کے الفاظ کا مفہوم پہلے متعین کریں اور پھر بعد میں دوسری آیات پر اسی مفہوم کو لاگو کرنے کی کوشش کریں۔ اس بات کی مزید وضاحت آئندہ عنوانات میں آجائے گی۔ مادہ کے لحاظ سے ہم نے صرف ایک ہی موضوع پر بات کی ہے۔ حالانکہ پرویز صاحب نے اپنی پوری لغت اسی انداز میں مرتب کی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس کا جائزہ بھی قرآنی آیات اور سیاق و سباق کے پس منظر میں لیں۔

تصریف آیات

پرویز صاحب نے قرآن فہمی کے جو اصول خود متعین کئے ہیں ان میں ایک "تصریف آیات" بھی ہے۔ جس سے وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ ایک موضوع سے متعلقہ قرآن کریم کی تمام آیات کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے تو پھر وہ موضوع سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

" مذکورہ بالا ہر سہ عناصر عربی زبان کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اسکے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں زیادہ دشواری نہیں رہتی۔ لیکن "بایں ہمہ" صرف اتنی خصوصیات سے قرآن کریم جیسی کتاب کے الفاظ کے صحیح صحیح معانی متعین نہیں کئے جاسکتے۔ اس لیے کہ یہ کتاب زندگی کے ان اصولوں کا ضابطہ ہے جن میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور جن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا صحیح مفہوم یقینی طور پر ہمارے سامنے آجائے۔ تنہا لغت سے یہ نہیں ہو سکتا۔ لغت انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے جس سے سہو و

خطا اور خارجی اثرات کا امکان بہر حال باقی رہتا ہے۔ علاوہ بریں، قرآن کریم نے بعض الفاظ کو اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاحات اسقدر جامع ہیں کہ تنہا لغت سے وہ عظیم تصورات سامنے نہیں آسکتے جنہیں قرآن نے ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً صلٰوۃ۔ زکٰوۃ۔ تقویٰ۔ ایمان۔ اسلام۔ کفر۔ فسق۔ فجور۔ دنیا۔ آخرت وغیرہ۔ ان اصطلاحات میں قرآنی تعلیم کے بنیادی تصوّرات بڑی جامعیت سے سمو دئے گئے ہیں۔ ان کی اس جامعیت کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ جوں جوں انسانی علم کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ان کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان اصطلاحات کا مفہوم خود قرآن کریم ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

قرآن کا انداز یہ ہے کہ اس میں اگر ایک مقام پر ایک بات کہی گئی ہے تو دوسرے مقام پر اس کی وضاحت اس انداز سے کر دی گئی ہے کہ اس سے مقام اوّل کی بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اس انداز کو قرآن نے "تصریف آیات" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا اور اس طرح مطالب کی وضاحت کر دینا۔ سورۃ انعام میں ہے

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۝ (6/105)

"اور اس طرح ہم آیات کو لوٹا کر لاتے ہیں تاکہ یہ لوگ کہیں کہ تونے بات ذہن نشین کرادی ہے اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لیے واضح کردیں جو علم و بصیرت سے کام لیں۔" قرآن کریم کا یہ وہ خصوصی انداز ہے جس سے اس کے مطالب واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں اور اس کے الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ مثلاً لفظ (صبر) کے جو لغوی معنی اوپر دئے گئے ہیں انہیں پیش نظر رکھئے اور پھر قرآن کریم کی طرف آیئے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ۝ (2/153) "یقیناً اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔" یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ الصابرین کن لوگوں کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝(3/146) "کتنے ہی انبیاء (ایسے گزرے) ہیں جن کی معیت میں بہت سے ربّانی لوگوں نے (مخالفین کے مقابلے میں) جنگ کی۔ پھر ان تکالیف کی

وجہ سے جو انہیں اس طرح اللہ کی راہ میں پیش آئیں نہ وہ سست گام ہوئے۔ نہ ان میں کمزوری آئی۔ اور نہ ہی وہ مخالفین سے مغلوب ہوئے۔ (یہی وہ) الصابرین ہیں جنہیں اللہ دوست رکھتا ہے۔" اگلی آیت میں ان کی اس کیفیت کو ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (3/146) دعا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ دعا کہ " ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ"۔ عین میدان جنگ کی حالت میں کہا ہے فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ (8/66) اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائینگے۔" ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح اور متعین طور پر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کریم میں صبر سے مفہوم کیا ہے اور صابر کسے کہتے ہیں۔

یہی کیفیت قرآنی اصطلاحات کی بھی ہے۔ قرآن کریم ان کے مفہوم کی وضاحت بھی تصریف آیات کی رو سے کر دیتا ہے۔ لہٰذا کوئی عام لفظ ہو یا قرآنی اصطلاح، اگر وہ تمام آیات بیک وقت سامنے رکھ لی جائیں جن میں قرآن کریم نے انہیں استعمال کیا ہے یا ان کے مفہوم کو بیان کیا ہے، تو ان الفاظ و اصطلاحات کے معانی متعین کرنے میں دشواری نہیں رہتی۔ ان مقامات پر غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ " قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔" (لغات القرآن۔ 15-17)

یہ ہے وہ طریقہ جسے پرویز صاحب نے "تصریف آیات" سے تعبیر کیا ہے، یہاں ہم یہ واضح کر دیں کہ یہ اصطلاح پرویز صاحب نے خود متعارف کروائی ہے، قرآن کریم نے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی۔ اور نہ ہی (ص رف) کے مادہ سے جتنے الفاظ قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں ان کا یہ مطلب نکلتا ہے جو پرویز صاحب لیتے ہیں (یعنی آیات کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا اور اس طرح مطالب کی وضاحت کر دینا)۔ اب ہم قرآن کریم کی چند آیات پیش کرتے ہیں جن سے "تصریف آیات" کا مطلب واضح ہو جائے گا۔ لفظ "تصریف" قرآن کریم میں دو مقامات پر بیان ہوا ہے جہاں اس کے معانی "ہوائوں کے رخ بدلنے" کے ہیں تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ (164/5:2/45)

۱۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِکَ فَاَخَذْنٰھُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّھُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ ۵ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَھُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۵ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُکِّرُوْا بِہٖ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ کُلِّ شَیْءٍ ط حَتّٰٓی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۵ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ط وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ مَّنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِہٖ ط اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ ھُمْ یَصْدِفُوْنَ ۵ (6/42-46)

”اور ہم نے اور امتوں کی طرف بھی جو کہ آپ سے پہلے گزر چکی ہیں پیغمبر بھیجے تھے۔ سو ہم نے ان کو تنگ دستی اور بیماری سے پکڑا تا کہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں۔ سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے؟ لیکن ان کے قلوب سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے خیال میں آراستہ کر دیا۔ پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں وہ خوب اترا گئے ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا۔ پھر تو وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔ آپ کہیے کہ یہ بتلاؤ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری سماعت اور بصارت بالکل لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود ہے کہ یہ تم کو پھر دے دے۔ آپ دیکھئے تو ہم کس طرح نشانیوں کو مختلف پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں۔ پھر بھی یہ اعراض کرتے ہیں۔“

پہلے اللہ تعالیٰ نے کچھ نشانیاں اور دلائل دیئے ہیں پھر یہ کہا ہے کہ ان کو اللہ کیسے بیان کر رہے ہیں۔ یہی انداز قرآن کریم کا دیگر مقامات پر بھی ہے۔

۲۔ قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَہٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً ج لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ ھٰذِہٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ۵ قُلِ اللّٰہُ یُنَجِّیْکُمْ مِّنْھَا وَمِنْ کُلِّ کَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِکُوْنَ ۵ قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّھُمْ یَفْقَھُوْنَ ۵ (6/63-65)

"آپ کہیے کہ وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور تری کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے۔ تم اس کو پکارتے ہو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے۔ کہ اگر تو ہم کو ان سے نجات دے دے تو ہم ضرور حق شناسی کرنیوالوں میں سے ہو جائیں گے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو ان سے نجات دیتا ہے اور ہر غم سے، تم پھر بھی شرک کرنے لگتے ہو، آپ کہیے کہ اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے یا تمہارے پاؤں تلے سے یا کہ تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑا دے، اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی چکھادے۔ آپ دیکھئے تو سہی ہم کس طرح نشانیاں مختلف پہلوئوں سے بیان کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں۔

۳۔ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ فَاعۡبُدُوۡہُ ۚ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ۝ لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَہُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ۝ قَدۡ جَآءَکُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ عَمِیَ فَعَلَیۡہَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ۝ وَکَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ وَلِیَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَلِنُبَیِّنَہٗ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۝ (6/101-105)

"وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اللہ تعالی کے اولاد کہاں ہو سکتی ہے حالاں کہ اس کے کوئی بیوی تو ہے نہیں، اور اللہ تعالی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ یہ ہے اللہ تعالی تمہارا رب! اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، ہر چیز کا پیدا کرنے والا، تو تم اس کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے اور وہی بڑا باریک بیں باخبر ہے۔ اب بلا شبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بینی کے ذرائع پہنچ چکے ہیں سو جو شخص دیکھ لے گا اپنا فائدہ کرے گا اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا۔ اور میں تمہارا نگران نہیں ہوں اور ہم اس طور پر نشانیوں کو مختلف پہلوئوں سے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ کہیں کہ آپ نے خوب بیان کر دیا ہے اور تاکہ ہم اس کو دانشمندوں کے لیے خوب ظاہر کر دیں۔"

یہاں بیان کردہ آخری آیت کو پرویز صاحب اپنے " تصریف آیات " کے تصور کی دلیل میں پیش کرتے ہیں لیکن یہاں یہ واضح ہے کہ پیچھے جو دلائل اور نشانیاں چلی آرہی ہیں ان کے بارے میں ہی بات ہو رہی ہے۔ یہ مطلب کہیں سے نہیں نکلتا کہ کسی موضوع سے متعلقہ تمام آیات کو ایک جگہ اکٹھا کر لو تو مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

۴۔ وَھُوَالَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا م بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِہٖ ط حَتّٰٓی اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰہُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِہِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِہٖ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ط کَذٰلِکَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۵ وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ ج وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا ط کَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْکُرُوْنَ ۵ (7/57-58)

اور وہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں۔ پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم سمجھو۔ اور جو ستھری زمین ہوتی ہے اس کی پیداوار تو اللہ کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار بہت کم نکلتی ہے اسی طرح ہم نشانیوں کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو قدر کرتے ہیں۔"

پرویز صاحب اس بارے میں مزید لکھتے ہیں

" سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ (18/54:17/89:17/41) ہم نے اس قرآن کریم میں حقائق و قوانین کے مختلف پہلوئوں کو لوٹا لوٹا کر بیان کیا ہے لِیَذَّکَّرُوْا (17/41) تاکہ لوگ انھیں اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ تاکہ ان کے تمام پہلو لوگوں کی نگاہ کے سامنے آجائیں۔ قرآن کریم نے اپنے مطالب کو واضح

کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ایک چیز کو بار بار پھرا کر لانا تاکہ اس کے متعدد گوشے سامنے آجائیں۔ یہ چیز ہے جسے سطح بین نگاہیں "تکرار" ٹھہراتی ہیں۔" (لغات القرآن 1021-1022)

گزشتہ آیات کو سامنے لانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالی یہ سب نشانیاں اور دلائل اس لئے بتلا رہے ہیں تاکہ لوگ سمجھ کر سیدھے راستے پر آجائیں اور اسی کا خوف کھائیں۔ مگر پرویز صاحب نے اس کا مقصد یہ سمجھ لیا کہ آیات کو بار بار سامنے اس لئے لایا جا رہا ہے کہ ان کا مفہوم سمجھ میں آجائے۔ حالانکہ نشانیاں ہر جگہ مختلف بیان کی گئی ہیں۔ اب اوپر والے پیرا میں پرویز صاحب نے جن آیات کے حوالہ جات دیئے ہیں انہیں بھی دیکھ لیجئے (17 / 41) کے ساتھ نشانیوں کی تفصیل ذرا لمبی ہے اس لیے یہاں صرف ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

۵۔" اور تیرا پروردگار صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا یہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ کہنا نہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا بلکہ ان کے ساتھ ادب اور احترام سے بات چیت کرنا۔ اور عاجزی اور محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کا بازو پست رکھے رکھنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے تمہارا رب بخوبی جانتا ہے۔ اگر تم نیک ہو تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے اور رشتے داروں کا اور مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو اور اسراف اور بے جا خرچ سے بچو۔ بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر تجھے ان سے منہ پھیر لینا پڑے اپنے رب کی اس رحمت کی جستجو میں جس کی تو امید رکھتا ہے تو یہی تجھے چاہیے کہ عمدگی اور نرمی سے انہیں سمجھا دے۔ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہوا اور پچھتاتا ہوا بیٹھ جائے۔ یقینا تیرا رب جس کے لئے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ۔ یقیناوہ اپنے بندوں سے باخبر اور خوب دیکھنے والا ہے۔ اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولادوں کو نہ مار ڈالو! ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں یقینا ان کا قتل

کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ خبر دار زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیوں کہ وہ بڑی بے حیائی ہے۔ اور بہت ہی بری راہ ہے۔ اور کسی جان کو جس کا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے ہر گز ناحق قتل نہ کرنا۔ اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے رکھی پس اسے چاہیے کہ مار ڈالنے میں زیادتی نہ کرے بے شک وہ مدد کیا گیا ہے۔ اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ بجز اس طریقہ کے جو بہت ہی بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی بلوغت کو پہنچ جائے اور وعدے پورے کرو کیونکہ قول و قرار کی باز پرس ہونے والی ہے اور جب ناپنے لگو تو بھر پور پیمانے سے ناپو۔ اور سیدھی ترازو سے تولا کرو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت اچھا ہے۔ جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چل کہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتا ہے۔ ان سب کاموں کی برائی تیرے رب کے نزدیک سخت ناپسند ہے۔ یہ بھی منجملہ اس وحی کے ہے جو تیری جانب تیرے رب نے حکمت سے اتاری ہے تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنانا کہ ملامت خوردہ اور راندہء درگاہ ہو کر دوزخ میں ڈال دیا جائے۔ کیا بیٹوں کے لئے تو اللہ نے تمہیں چھانٹ لیا ہے اور خود اپنے لیے فرشتوں کو لڑکیاں بنالیں؟ بے شک تم بہت بڑا بول بول رہے ہو۔" (17/23-40)

یہ سب احکامات دینے کے بعد اللہ نے فرمایا

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّکَّرُوْا ط وَمَا یَزِیْدُھُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۵ (17/41)

ہم نے تو اس قرآن میں ہر ہر طرح بیان فرما دیا ہے کہ لوگ سمجھ جائیں لیکن اس پر بھی ان کی تو نفرت ہی بڑھتی ہے۔

۶۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ۵ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ ز فَاَبٰٓی اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا ۵ (17/88-89)

"اعلان کر دیجئے کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ناممکن ہے گو وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ ہم نے تو اس قرآن میں لوگوں کے سمجھنے کے لیے ہر طرح پھیر پھیر کر تمام مثالیں بیان کر دی ہیں مگر اکثر لوگ ناشکری سے باز نہیں آتے۔"

٦۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ط اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ط بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۵ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ص وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۵ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۵ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۵ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ط وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۵ (18/50-54)

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کے سامنے سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر لیا، یہ جنوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔ کیا پھر بھی تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالاں کہ وہ تم سب کا دشمن ہے۔ ایسے ظالموں کا بہت برا بدلہ ہے۔ میں نے انہیں آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت موجود نہیں رکھا تھا اور نہ خود ان کی اپنی پیدائش میں۔ اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا زور بازو بنانے والا بھی نہیں۔ اور جس دن وہ فرمائے گا کہ تمہارے خیال میں جو میرے شریک تھے انہیں پکارو! یہ پکاریں گے لیکن ان میں سے کوئی بھی جواب نہ دیگا ہم ان کے درمیان ہلاکت کا سامان کر دیں گے اور گناہ گار جہنم کو دیکھ کر سمجھ لیں گے کہ وہ اسی میں جھونکے جانے والے ہیں۔ لیکن ان سے بچنے کی جگہ نہ پائیں گے۔ ہم نے اس قرآن میں ہر ہر طریقے سے تمام کی تمام مثالیں لوگوں کے لیے بیان کر دی ہیں۔ لیکن انسان تمام چیزوں سے زیادہ جھگڑالو ہے۔"

ہم نے قرآن کریم کی چند آیات کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن یہ بات ایک حقیقت ہے کہ (ص۔ر۔ف) کے مادہ سے جتنے بھی الفاظ قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں ان کا قطعاً یہ مفہوم نہیں بنتا جو پرویز صاحب نے لیا ہے۔ اور

جن آیات کو انہوں نے بطور حوالہ پیش کیا ہے وہاں بھی بات خدا کی ان نشانیوں کی ہو رہی ہے جو محولہ بالا آیت کے پچھلی آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ اور 17/89، 18/54 میں تو "مِنْ كُلِّ مَثَلٍ" کے الفاظ سے یہ واضح کر دیا کہ "صَرَّفْنَا" کا تعلق "مِنْ كُلِّ مَثَلٍ" سے ہے یعنی ہر طرح کی مثال بیان کی۔ اور یہ نشانیاں اور دلائل بیان کئے گئے تا کہ لوگ اللہ کا خوف کھائیں۔ اس بات کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝ (20/113)

"اسی طرح ہم نے تجھ پر عربی قرآن نازل فرمایا ہے اور طرح طرح سے اس میں ڈر کا بیان سنایا ہے تا کہ لوگ پرہیز گار بن جائیں یا ان کے دل میں سوچ سمجھ تو پیدا کرے۔"

پرویز صاحب نے اس تصور کی وضاحت میں "صبر" کی مثال دی ہے۔ پچھلے عنوان میں ہم اس پر تفصیل سے بات کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہیں گے کہ صبر کے موضوع پر پرویز صاحب نے صرف وہی آیات بیان کی ہیں جو ان کے مفہوم کے مطابق ہیں۔ جن آیتوں سے صبر کا مروجہ مفہوم ہو سکتا ہے وہ انہوں نے بیان نہیں کیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی ہر آیت اور لفظ اپنی جگہ اٹل ہے اور اس کا اپنے مقام پر ایک متعین مفہوم موجود ہے۔ قرآن نے بار بار یہ بات واضح کی ہے کہ وہ واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے تا کہ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ اس لیے جب "تصریف آیات" کا تصور عربی زبان میں موجود نہیں ہے تو پھر قرآن کو اس کا کیونکر پابند بنایا جا سکتا ہے۔

اب مادہ اور تصریف آیات کے تصور سے کس قسم کا مفہوم نکلتا ہے۔ اس کی رو سے پرویز صاحب نے تقویٰ کا جو مفہوم بیان کیا ہے آیئے اسے دیکھتے ہیں۔

تقویٰ (و۔ق۔ی): یہ لفظ قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر آیا ہے اور مختلف المعانی ہے اس کے معنوں میں بچنا، ڈرنا، خوف کھانا، پرہیز گاری، لہو و لعب سے دور رہنا، نیکی کی زندگی گزارنا وغیرہ آتا ہے۔ اور ان معانی کا تعین

متعلقہ مقامات کے سیاق و سباق سے کیا جا سکتا ہے اب پرویز صاحب تصریف آیات کی رو سے اس کا جو مفہوم لیتے ہیں وہ دیکھتے ہیں۔

" قرآن کریم میں وَاقٍ بمعنی محفوظ رکھنے والا، بچانے والا آیا ہے۔ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا وَاقٍ (37/13) "تیرے لیے اللہ کے مقابلہ پر نہ کوئی سرپرست ہو گا، نہ بچانے والا۔" دوسرے مقام پر یہ مادہ محتاط رہنے اور اپنی حفاظت کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسے فَاتَّقُوا النَّارَ (2/24) اپنے آپ کو عذاب آتش سے محفوظ رکھو۔ یا اس سے محتاط رہو۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ (جو قرآن کریم میں بار بار آتا ہے) کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ احکام خداوندی کا اتباع کرنا۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ ان سے ہم آہنگ رہنا۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ مفہوم دیگر مقامات میں واضح کر دیا ہے۔ سورہ مائدہ میں تَقۡوٰی کے مقابلہ میں عُدۡوَانٌ کا لفظ آیا ہے۔ (5/2) اور عُدۡوَانٌ کے معنی سرکشی کے ہیں۔ لہٰذا تقویٰ کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہوا۔ سورہ آل عمران میں اسکی مزید تشریح کر دی گئی ہے۔ جہاں فرمایا یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (3/101) اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہوتا ہے۔ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۵ (3/101) یعنی تمام عمر قوانین خداوندی کے سامنے جھکے رہو۔ بالفاظ دیگر وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا (3/103) سب کے سب مل کر اللہ کے ضابطہء ہدایت کے ساتھ متمسک رہو۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (قرآن کریم) سے ہم آہنگ رہنا۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنا، ان کی پوری پوری نگہداشت کرنا۔" (لغات القرآن 1732)

ذرا آگے جا کر لکھتے ہیں

" لہٰذا مُتَّقِیۡن وہ ہیں جو غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کر کے اپنی ذات کی نشو و نما کریں۔ تخریبی قوتوں کے تباہ کن اثرات سے حفاظت (تُقَاۃٌ) کی ایک ہی شکل ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرے (تَقۡوٰی)۔ ان کا ہر وقت خیال رکھے۔

(تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ) اور اپنا ہر قدم ان کے مطابق اٹھائے۔ اسی کا نام ان سے متمسک یا ہم آہنگ رہنا ہے۔ ایسا تمسک جیسے زین گھوڑے کی پیٹھ پر فٹ آجاتی ہے اور اسے زخمی نہیں ہونے دیتی۔

قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں یہ کہدیا ہے کہ یہ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (2/2) ہے۔ یعنی یہ صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ لیکن صرف ان کی جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خاردار وادیوں سے محفوظ رہ کر چلنا چاہیں۔ جو شخص تباہ ہونا چاہے اسے صحیح اور غلط راستے کے امتیاز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ خودکشی کرنے والے سے یہ کہنا کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اس سے بچنا، بے سود ہوتا ہے۔ سَوَآءٌ عَلَیۡھِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَھُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡھُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝ (2/6) "ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ وہ صحیح بات کو مانیں گے ہی نہیں۔" قرآن کریم کے مختلف مقامات میں دیکھنا چاہیئے کہ کہاں اس کے معنی قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ہیں اور کہاں تباہیوں اور ہلاکتوں سے بچنا۔ مثلاً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔۔ قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (6/66) مَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ (9/59) وَقِھِمُ السَّیِّاٰتِ اور مَنۡ تَقِ السَّیِّاٰتِ (9/40) میں معنی بچانے کے ہیں لیکن وَاتَّقُوا اللّٰہَ (18/59) کے معنی یہ نہیں کہ اللہ سے بچو۔ اس کے معنی ہیں قوانین خداوندی کو توڑنے یا ان سے سرکشی برتنے سے بچو۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

اور جو اَتۡقٰی (سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے۔ (13/49)

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور اس لفظ کو اس نے اس قدر اہمیت دی ہے کہ یہ بجائے خویش گویا ایک مادہ بن گیا ہے۔ جس سے قرآن کریم مختلف الفاظ لایا ہے۔ اس کے معنی "پرہیزگاری" نہیں۔ "پرہیزگاری" محض سلبی صفت (Negative Virtue) ہے۔ لیکن تقویٰ میں زندگی کی تباہیوں سے بچ کر چلنے کے ساتھ ساتھ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ہے۔ یعنی اس میں سلبی

صفت کے ساتھ ایجابی پہلو(Positive Side) بھی ہے اور ایجابی پہلو غالب ہے۔" (لغات القرآن 1733-1734)

یعنی پرویز صاحب کے مفہوم کے مطابق تقویٰ کے معنی" قوانین خداوندی کی نگہداشت" ہو سکتا ہے مگر معروف معنوں میں اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیز گار نہیں ہو سکتا۔ آیئے اس کے بارے میں چند آیات قرآنی پیش کرتے ہیں۔

ا۔ یَآیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَایَنۡتُمۡ بِدَیۡنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکۡتُبُوۡہُ طوَلۡیَکۡتُبۡ بَّیۡنَکُمۡ کَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ص وَلَا یَاۡبَ کَاتِبٌ اَنۡ یَّکۡتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ فَلۡیَکۡتُبۡ ج وَلۡیُمۡلِلِ الَّذِیۡ عَلَیۡہِ الۡحَقُّ وَلۡیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ وَلَا یَبۡخَسۡ مِنۡہُ شَیۡئًا۔۔۔۔(2/282)

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہئے کہ تمہارا آپس کا معاملہ عدل سے لکھے، کاتب کو چاہئے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالی نے اسے سکھایا ہے پس اسے بھی لکھ دینا چاہیے اور جس کے ذمہ حق ہو وہ لکھوائے اور اپنے اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور حق میں سے کچھ گھٹائے نہیں۔"

۲۔ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡھَا عَدۡلٌ وَّلَا ھُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ۵(2/48)

اور اس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کو نفع نہ دے سکے گا اور نہ شفاعت اور سفارش قبول ہو گی اور نہ کوئی بدلہ اور فدیہ لیا جائے گا اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔

۳۔ وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ط فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ج وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ لِمَنِ اتَّقٰی ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ۵(2/203)

اور اللہ کی یاد ان گنتی کے چند دنوں میں کرو، دو دن کی جلدی کرنے والے پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو پیچھے رہ جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ پرہیز گار کے لیے ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان رکھو کہ تم سب اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے۔

۴۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ وَلَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْھَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرِضْوَانًا ط وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ط وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا م وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ص وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۵ (2/5)

"اے ایمان والو! اللہ تعالی کے نشانوں کی بے حرمتی نہ کرو، نہ ادب والے مہینوں کی، نہ حرم میں قربان ہونے والے اور پٹے پہنائے گئے جانوروں کی (جو کعبہ کو جا رہے ہوں) اور نہ ان لوگوں کی جو بیت اللہ کے قصد سے اپنے رب تعالی کے فضل اور اس اسکی رضا جوئی کی نیت سے جا رہے ہوں۔ ہاں جب تم احرام اتار ڈالو تو شکار کھیل سکتے ہو، جن لوگوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا ان کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم حد سے گزر جاؤ، نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو اور گناہ اور ظلم و زیادتی میں مدد نہ کرو، اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالی سخت سزا دینے والا ہے۔"

۵۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ ط قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ لا وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَھُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ ز فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ ص وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۵ (4/5)

"آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ انکے لیے کیا کچھ حلال ہے؟ آپ کہہ دیجئے تمام پاک چیزیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں اور جن شکار کھیلنے والے جانوروں کو تم نے سدھار رکھا ہے یعنی جنہیں تم تھوڑا بہت وہ سکھاتے ہو جسکی تعلیم اللہ تعالی نے تمہیں دے رکھی ہے۔ پس جس شکار کو وہ تمہارے لئے پکڑ کر روک رکھیں تو تم اس سے کھالو اور اس پر اللہ تعالی کا نام ذکر کر لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ تعالی جلد حساب لینے والا ہے۔"

۶۔وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ لا اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ م بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۵ (7/5)

" تم اللہ تعالی کی جو نعمتیں نازل ہوئی ہیں انہیں یاد رکھو اور اس کے عہد کو بھی جس کا تم سے معاہدہ ہوا ہے۔ جبکہ تم نے کہا ہم نے سنا اور مانا اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ تعالی دلوں کی باتوں کا جاننے والا ہے۔"

۷۔قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ۵لا وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ۵ (15/68-69)

" (لوطؑ نے) کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں تم مجھے رسوانہ کرو۔ اللہ تعالی سے ڈرو اور مجھے رسوانہ کرو۔"

۸۔يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ج وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌم بِمَا تَعْمَلُوْنَ۵ (59/18)

" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے اعمال کا کیا ذخیرہ رکھ چھوڑا ہے اور (ہر وقت) اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔"

۹۔وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۵ (29/16)

" اور ابراہیمؑ نے بھی اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرتے رہو، اگر تم میں دانائی ہے تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔"

۱۰۔لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ط ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ط يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ۵ (39/16)

" انہیں نیچے اوپر سے آگ کے شعلے مثل سائبان کے ڈھانک رہے ہوں گے۔ یہی عذاب ہیں جن سے اللہ تعالی اپنے بندوں کو ڈرا رہا ہے۔ اے میرے بندو! پس مجھ سے ڈرتے رہو۔"

۱۱۔وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ م اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا۵لا فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا قف فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۵ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۵ (19/16-18)

" اس کتاب میں مریمؑ کا بھی واقعہ بیان کر۔ جب کہ وہ اپنے گھر کے لوگوں سے علیحدہ ہو کر ایک مشرقی مکان میں آئیں اور ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا۔ پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا پس وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ یہ کہنے لگیں میں تجھ سے رحمن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو کچھ بھی اللہ سے ڈرنے والا ہے۔"

درج بالا تمام آیات میں تقویٰ سے مراد ڈرنا اور بالخصوص اللہ تعالی سے ڈرنا ہے۔ اب "تصریف آیات" کی رو سے یہ بات سمجھ سے بالا ہے کہ اس کا معنی " قوانین خداوندی کی نگہداشت" کیسے ہو گیا۔ اگلے عنوان میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جائے گی کہ کیسے پرویز صاحب نے اسی انداز سے قرآن کریم کی بہت سی اصطلاحات کا مفہوم تبدیل کر دیا ہے۔ ذیل میں ہم چند اصطلاحات دے رہے ہیں جن کا مطلب پرویز صاحب نے "قوانین خداوندی" لیا ہے۔

ا۔ خشوع: "یہ ہے خشوع سے مقصود۔ قلب سلیم سے قوانین خداوندی کے سامنے جھک جانا۔" (لغات القرآن 544)

۲۔ خشیۃ اللہ: "یعنی قوانین خداوندی سے سرکشی کے نتائج وعواقب کا احساس"۔

(لغات القرآن 595)

۳۔ اذن اللہ: " بہر کیف اذن اللہ کے معنی ہیں خدا کا قانون۔ خواہ وہ قانون کائنات ہو یا قانون ہدایت جو قرآن کے اندر ہے۔" (لغات القرآن 219)

۴۔ امر: "امر کا دوسرا حصہ جس سے مفہوم وہ قانون خداوندی ہے جو کائنات کے رگ و پے میں کار فرما ہے۔" (لغات القرآن 258)

۵۔دعا:" دعا سے مفہوم ہے خدا کے قوانین کا اتباع کرنا۔ اور اس کی طرف سے جواب کے معنی ہیں ان قوانین کا نتیجہ خیز ہونا۔"(لغات القرآن 456)نیز" خدا کو پکارنے" سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔(لغات القرآن 656)

٦۔بقیۃ اللہ:" اس دولت اور سامان کو کہا گیا ہے جو خدا کے قانون کی رو سے حاصل ہو۔"

(لغات القرآن 339)

۷۔حب: " لہٰذا اس آیت میں اللہ کی محبت کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت۔"

(لغات القرآن 465)

۸۔خوف خداوندی:" لہٰذا خوف خداوندی کے معنی یہ ہیں کہ اس احساس سے کہ قوانین خداوندی کو چھوڑ دینے میں میرا کسقدر نقصان ہوگا ان قوانین کا اتباع کرنا۔"

(لغات القرآن 624)

۹۔ذکر:" لہٰذا ذکر اللہ کے معنی قوانین خداوندی کا اتباع ہیں۔" (لغات القرآن 700)

۱۰۔رکوع:" رکوع و سجود در حقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔"

(لغات القرآن 778)

۱۱۔مشیت:" اس گوشے میں مشیت خداوندی کے معنی ہونگے خدا کے وہ قوانین جن کے مطابق یہ تمام سلسلہ کائنات چل رہا ہے۔" (لغات القرآن 990)

۱۲۔ صلوٰۃ: ” اس سے بھی صلوٰۃ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔یعنی زندگی کے ہر شعبے میں قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلوٰۃ ہے۔“(لغات القرآن 1038)

۱۳۔ عبادت:” قرآن کریم میں جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہو گا اس کے معنی ہونگے قوانین خداوندی کی برضاو رغبت اطاعت جس سے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہونگے۔“

(لغات القرآن 1125)

۱۴۔ اعوذ:” قل اعوذبرب الناس یعنی ہر وقت قوانین خداوندی اور نظام کے ساتھ چمٹے رہنا۔“

(لغات القرآن 1209)

۱۵۔ کلمہ:”ان مقامات میں خدا کے کلمہ کے سیدھے سادھے معنی ”خدا کی بات“ ہی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ خدا کی بات سے مراد خدا کا قانون ہے۔“ (لغات القرآن 1455)

۱۶۔ کتاب: ” قرآن کریم میں کتاب کا لفظ قانون خداوندی یا ضابطہ قوانین خداوندی کے لیے آیا ہے۔“ (لغات القرآن 1416)

۱۷۔ لقاءرب:” قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا چاہیے کہ لقاءرب سے مراد نظام کائنات میں خدا کے قانون ربوبیت کو بے نقاب دیکھنا ہے یا اس کے قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج کو اپنے سامنے دیکھنا۔“ (لغات القرآن 1500)

پرویز صاحب نے ان تمام الفاظ و اصطلاحات کی طرح تقویٰ سے مراد بھی ”قوانین خداوندی“ لیا ہے۔ حالانکہ یہ تمام الفاظ مادہ، قواعد لغت اور سیاق و سباق کی رو سے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ان کا معنی ” قوانین خداوندی“ لیا جائے۔

ایک بڑی عجیب چیز یہ ہے کہ پرویز صاحب بڑے فخر سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے جو لغت مرتب کیا ہے وہ سارا آئمہ لغت کی کتابوں کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے اور ہمیں یہ نظر بھی آتا ہے کہ مادہ کے لحاظ سے الفاظ کے بنیادی معانی مرتب کرتے ہوئے آئمہ لغت کے حوالے ملتے ہیں جیسے تاج العروس، محیط المحیط اور امام راغب وغیرہ (لغات القرآن صفحہ 23 اور 24 میں پرویز صاحب نے ان تمام کتب کی تفصیل بیان کی ہے جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔) لیکن جہاں جہاں پرویز صاحب نے اصطلاحات کا مفہوم "قوانین خداوندی" کیا ہے وہاں کسی ایک کتاب کا حوالہ بھی نہیں ملتا۔ یعنی آئمہ لغت نے ان الفاظ کو کسی مقام پر بھی ان معنوں استعمال نہیں کیا۔

اب ہم سورہ الشعرآء کے ان پانچ مقامات کو بیان کرتے ہیں جہاں سے تقویٰ کا مطلب مزید نکھر کر سامنے آجائے گا۔ یہ پانچ برگزیدہ پیغمبروں کے واقعات ہیں جنہوں نے اپنی اپنی قوم کو دعوت حق دی۔ قرآن کریم نے ایک ہی انداز بیاں میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۔ کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ نِالْمُرْسَلِيْنَ ج۵ صلے اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ نُوحٌ اَلَا تَتَّقُونَ ۵ ج اِنِّی لَكُمْ رَسُولٌ اَمِيْنٌ۵ لا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۵ ج وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ج اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۵ ج فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۵ (26/105-110)

" قوم نوحؑ نے بھی نبیوں کو جھٹلایا۔ جب کہ ان کے بھائی نوحؑ نے کہا کہ کیا تمھیں اللہ کا خوف نہیں؟ سنو میں تمھاری طرف اللہ کا امانتدار رسول ہوں۔ پس تمھیں اللہ سے ڈرنا چاہیے اور میری بات ماننی چاہیے۔ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ نہیں چاہتا، میرا بدلہ تو صرف رب العلمین کے ہاں ہے۔ پس تم اللہ کا خوف رکھو اور میری فرمانبرداری کرو۔"

۲۔ کَذَّبَتْ عَادُنِالْمُرْسَلِیْنَ ج۵صلے اِذْ قَالَ لَھُمْ اَخُوْھُمْ ھُوْدٌ اَلاَ تَتَّقُوْنَ ۵ج اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ۵لا فَاتَّقُوااللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ۵ج وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍج اِنْ اَجْرِیَ اِلاَّ عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۵ج اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ۵لا وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ۵ج وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ۵ج فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنَ۵ج وَاتَّقُوالَّذِیْ اَمَدَّکُمْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۵(26/123-132)

"عاد والوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔ جب کہ ان سے ان کے بھائی ہودؑ نے کہا کہ کیا تمھیں ڈر نہیں؟ میں تمھارا امانتدار معتبر پیغمبر ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو، میں اس پر تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا، میرا ثواب تو تمام جہان کے پروردگار کے پاس ہی ہے۔ کیا تم ایک ایک ٹیلے پر بطور کھیل تماشا نشان لگا رہے ہو، اور بڑی صنعت والے مضبوط محل تعمیر کر رہے ہو، گویا کہ تم ہمیشہ یہیں رہو گے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو سختی اور ظلم سے پکڑتے ہو، اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔ اس سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمہاری امداد کی جنہیں تم جانتے ہو۔"

۳۔ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ ج۵صلے اِذْ قَالَ لَھُمْ اَخُوْھُمْ صٰلِحٌ اَلاَ تَتَّقُوْنَ۵ج اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ۵لا فَاتَّقُوااللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ۵ج وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍج اِنْ اَجْرِیَ اِلاَّ عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۵ج اَتُتْرَکُوْنَ فِیْ مَا ھٰھُنَآ اٰمِنِیْنَ۵لا فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ۵لا وَزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُھَا ھَضِیْمٌ۵ج وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِھِیْنَ۵ج فَاتَّقُوااللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ۵(26/141-150)

"قوم ثمودؑ نے بھی نبیوں کو جھٹلایا، ان سے ان کے بھائی صالحؑ نے کہا کہ تم اللہ کا خوف نہیں رکھتے؟ میں تمھاری طرف امانت دار رسول ہوں، پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف اللہ تعالی پر ہے جو تمام جہان کا رب ہے۔ کیا ان چیزوں میں جو یہاں ہیں تم امن کے ساتھ چھوڑ دیئے جاؤ گے؟ یعنی ان باغوں اور ان چشموں اور ان کھیتوں اور ان کھجوروں کے باغوں میں جن کے شگوفے بوجھ

کے مارے ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر پر تکلف مکانات بنا رہے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"

۴۔ کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِنِالْمُرْسَلِیْنَ ج۵صلے اِذْ قَالَ لَھُمْ اَخُوْھُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۵ج اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۵لا فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۵ج وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍج اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵ (26/160-164)

"قوم لوطؑ نے بھی نبیوں کو جھٹلایا، ان سے ان کے بھائی لوطؑ نے کہا کہ تم اللہ کا خوف نہیں رکھتے؟ میں تمھاری طرف امانت دار رسول ہوں، پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف اللہ تعالی پر ہے جو تمام جہان کا رب ہے"

۵۔ کَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَیْکَۃِ الْمُرْسَلِیْنَ ج۵صلے اِذْ قَالَ لَھُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۵ج اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۵لا فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ۵ج وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍج اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵(26/176-180)

" ایکہ والوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا جب کہ ان سے شعیبؑ نے کہا کہ کیا تمھیں ڈر خوف نہیں، میں تمھاری طرف امانت دار رسول ہوں، تو تم اللہ کا خوف کھائو اور میری فرمانبرداری کرو۔ میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ میرا اجر تمام جہانوں کے پالنے والے کے پاس ہے۔"

یہ تھی مختلف انبیاء کرامؑ کی اپنی اپنی قوم کو دعوت توحید۔ جہاں انسانوں کے ظلم و استبداد اور اس کے مقابلے میں اللہ کی طاقت، قدرت، غلبہ اور مختلف نشانیوں کا ذکر ہے اور ہر نبیؑ نے اپنی قوم کو اللہ سے ڈرنے کی تعلیم دی ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے گذشتہ صفحات میں پیش کردہ آیات میں تقویٰ کا معنی" قوانین خداوندی" لیا ہے۔

تصریف آیات کی رو سے ہم نے پرویز صاحب کے موقف اور اس کی بنیا پر قائم کردہ "تقویٰ" کے مفہوم کا جائزہ لیا۔ جس سے یہ بات سامنے آئی کہ مادہ، اس سے بننے والے الفاظ اور ان کے بنیادی استعمالات میں

تو پرویز صاحب نے اسلاف کے آئمہ لغت سے مدد لی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو مفہوم بیان ہوا ہے وہ پرویز صاحب کا ذاتی فہم ہے جو عربی لغت، قواعد گرائمر اور اسلوب زبان سے ماورا ہے۔ جو کہ ”لغات القرآن“ اور ”مفہوم القرآن“ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور زبان میں اصلاً جو قواعد وضوابط موجود ہوتے ہیں ان میں حک واضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ” تصریف آیات“ کو قرآن سمجھنے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ علاوہ ازیں فرض کریں کہ اگر کوئی لفظ قرآن کریم میں پانچ مقامات پر استعمال ہوا ہے تو کسی ایک مقام کے مفہوم کو دوسرے مقامات پر حاوی نہیں کیا جا سکتا، ہر مقام پر استعمال ہونے والا معنی اپنی جگہ پر اٹل اور محکم ہے۔

دین اور مذہب کا فرق

علّامہ غلام احمد پرویز نے اپنے افکار کی ترویج میں جن چیزوں کو نمایاں طور پر ابھارا ہے ان میں ایک ”دین اور مذہب کا فرق“ ہے۔ ان کا تصور یہ ہے کہ اسلام بحیثیت دین، قَرن اوّل میں رائج تھا لیکن اس کے بعد سارے کا سارا اسلام بدل گیا اور اس وقت امت میں اسلام کی جو شکل موجود ہے وہ مذہب ہے۔ مزید بر آں، جو طریق عبادات و قوانین شرعی نیز اصطلاحات قرآنی اور مفاہیم و مطالب اس وقت رائج ہیں وہ مذہب کی غمازی کرتے ہیں نہ کہ دین کی۔ فلہٰذا وہ غیر قرآنی ہیں۔ اور اسلام کے خلاف ایک سازش ہیں۔ تقریباً اپنے تمام مقالات اور دروس میں انہوں نے اس تصور کا نہایت شدّ و مد سے پروپیگنڈا کیا ہے۔ اور اس کے بعد اسلام کا جو مفہوم انہوں نے بیان کیا ہے وہ بقول ان کے صحیح دین کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ امت مسلمہ آج کل جن مشکلات سے دوچار ہے اس کا سبب بھی مذہب ہے اور ان مشکلات اور پستی سے نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ مذہب کو چھوڑ کر دین کا نظام قائم کیا جائے۔ اور دین سے مراد پرویز صاحب اسلام کا وہ مفہوم لیتے ہیں جو انہوں نے اپنے دواوین و دروس میں بیان کیا ہے۔ جن کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ قرن اوّل کے بعد دین کا اصل

مفہوم انہوں نے ہی منضبط کیا ہے۔ دین اور مذہب کے فرق سے متعلق پرویز صاحب کے تصور کا ہم قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لیں گے لیکن اس سے پہلے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں جو ان کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔

" دین کیا ہے؟ تمام انسان ایک خاندان کے افراد، ایک درخت کے پتے اور ایک سمندر کے قطرے ہیں۔ جن کی اصل بنیاد (Base) ایک ہے۔ یہ تھی وہ عظیم القدر حقیقت (یعنی وحدت خالق سے وحدت مخلوق اور وحدت قانون کا تصور) جسے قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس نے اس حقیقت کو بطور ایک نظریہ ہی کے پیش نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ انسانی نظام تمدن و معاشرت میں اس وحدت حیات کا عملی مظاہرہ کس طرح ہو گا۔ یہ عملی طریق جس سے یہ عظیم المرتبت حقیقت ایک زندہ پیکر کی صورت میں سامنے آجاتی ہے۔ دین کہلاتا ہے۔ لہذا دین نام تھا اس طریق عمل کا جس سے ایک طرف حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) ایک غیر منقسم وحدت بن جاتے ہیں اور دوسری طرف تمام افراد نوع انسانی ایک عالمگیر برادری کے ایسے اجزاء جیسے سمندر کے قطرات۔ دین کے ارکان و مناسک اسی غیر مرئی حقیقت کو محسوس و مشہود شکل میں لانے کے ذرائع و اسباب تھے جن سے اس نظام زندگی کو عملاً متشکل ہونا تھا۔ جسے اس نے الدین کہہ کر پکارا ہے۔ دین کے اس نظام کی خصوصیت یہ تھی (یا یوں کہئے کہ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا) کہ تمام اقتدار انسانوں کے ہاتھوں سے چھن کر اس قانون کے ہاتھ میں آگیا جو اپنی اصل کے اعتبار سے انسانوں کا خود ساختہ نہ تھا بلکہ وہاں سے ملا تھا جو ہدایت کا سرچشمہ ہے اور جسے خدا کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں اطاعت فقط قانون خداوندی کی تھی اور قانون کی اطاعت بھی غلام کی سی بالجبر اطاعت نہیں، بلکہ اس طرح کہ انسان ان قوانین پر پورے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ واقعی اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کو خوشگوار اور تابناک بنانے کا ذریعہ ہیں اور اس طرح دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے بعد ان پر عمل کرنا شروع کر دے۔ (اسباب زوال امت 44-45)

یہ ہے پرویز صاحب کا تصور دین۔ اب مذہب کے بارے میں ان کا کیا نظریہ ہے وہ بھی دیکھئے۔

"وہ ضابطہ جو صرف آخرت کے متعلق ہو اور دنیا کے ساتھ اس کا کچھ واسطہ نہ ہو مذہب کہلاتا ہے۔(اس صفحہ کے فٹ نوٹ ۲ پر اس کی وضاحت کرتے ہیں۔) میں "مذہب" اور "دین" کے الفاظ الگ الگ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن مذہب نہیں لایا تھا حتیٰ کہ۔۔۔ "مذہب" کا لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔ وہ دین لایا تھا۔ مذہب اس وقت پیدا ہوا جب نظام دین مفقود ہو گیا۔ لہذا میری تحریروں میں جہاں "مذہب" کا لفظ آئے اس سے یہی مفہوم ہو گا۔ میں اسلام کو "دین" کہہ کر پکارتا ہوں (کہ قرآن نے اسے دین کہا ہے) اسے "مذہب" نہیں کہتا کیونکہ مذہب سے مفہوم ہے (Other worldliness) (اسباب زوال امت 52)

" مذہب" کا لفظ اگر قرآن میں نہیں آیا تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مگر اس کا جو مفہوم اس وقت معاشرہ میں رائج ہے اس کی رو سے یہ لفظ "دین" ہی کا ترجمہ ہے۔ اگر یہ کوئی قابل اعتراض بات ہے تو پھر پرویز صاحب نے اپنے سارے لٹریچر میں "نظام" اور "قانون" کے الفاظ بے تحاشا استعمال کئے ہیں وہ بھی غیر قرآنی قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ " خدا" کا لفظ قرآن میں استعمال نہیں ہوا۔ اس لیے یہ غیر قرآنی ہے۔ تو یہ سوچ ٹھیک نہیں کیونکہ ایک چھوٹے بچے سے لے کر ایک قابل فلسفی تک سارے یہ جانتے ہیں کہ "خدا" سے کیا مفہوم ہے۔ الفاظ بذات خود قرآنی یا غیر قرآنی نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ تصورات اور عقائد ہیں جن کو غیر قرآنی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مزید فرماتے ہیں۔

" مذہب سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی سے الگ کر کے اس زندگی کو ارباب سیاست کے سپرد کر دے اور آخرت کی زندگی کو ارباب شریعت کے حوالے کر دے۔ یعنی خدا کی دنیا الگ ہو اور قیصر کی الگ۔ بادشاہ (یا حکومت) اپنا ٹیکس وصول کرے اور مذہبی پیشوا اپنا خراج۔ حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی جرم کہلائے اور شریعت کے احکام کی خلاف ورزی سے گناہ لازم آئے۔ جرم کی سزا اس دنیا میں مل جائے اور گناہ کی سزا اگلی دنیا میں جا کر ملے۔ اسی طرح دنیاوی حکمرانوں کی خوشنودی کے انعامات یہاں ملیں اور

خدا کی خوشنودی کی جزا جنت میں پہنچ کر۔ یہ ہے وہ تصور زندگی جسے "مذہب" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

(اسباب زوال امت 53)

یہ مذہب کا ایک خود ساختہ تصور ہے حالانکہ دنیا کے کسی مذہب نے ایسی تعلیم نہیں دی۔ حیرت ہے کہ پرویز صاحب نے کتب سماوی کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس کا نام " مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" رکھا ہے۔ جس میں توریت، انجیل، قرآن کریم، ویدوں اور دیگر اقوام سے منسوب صحائف کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ موسیٰؑ اور دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی پیروی کے دعویدار "یہودی مذہب" سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کے دعویدار "عیسائی مذہب" سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح حضرت محمدؐ کی لائی ہوئی شریعت پر چلنے والے "مذہب اسلام" سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہاں یہودیت اور عیسائیت تو مذاہب ٹھہرے۔ اور اسلام "دین"۔

دین اور مذہب کا یہ تصور دینے کے بعد پرویز صاحب چند نکات میں اس موضوع پر حتمی رائے دیتے ہیں آیئے اسے بھی دیکھ لیں۔

"ہم دیکھ چکے ہیں کہ:۔

۱۔ قوموں کی زندگی اور عروج کے راستے میں سب سے بڑا روڑا "مذہب" ہوتا ہے۔

۲۔ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ " مذہب" کو نہ چھوڑے۔

۳۔ دنیا کی دیگر اقوام نے جب ترقی کی طرف قدم اٹھانا چاہا تو انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا چونکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے دیا ہوا دین نہیں تھا۔ اس لیے ان میں سے بعض نے:

ا۔ مذہب کو مندر یا گرجا کی چار دیواری میں محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات، اپنی مصلحتوں کے مطابق طے کرنے شروع کر دیئے، اسے سیکولر ازم کہتے ہیں اور یا

ب۔انہوں نے مذہب کو بالکل خیر باد کہہ دیا۔یہ بھی سیکولرازم ہی ہے۔

۴۔ مسلمانوں کے پاس خدا کا دین اس کی اصل شکل میں، قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔اس لیے اگر انہوں نے زندگی اور عروج حاصل کرنا ہے تو انہیں موجودہ مذہب کی جگہ خدا کا دین اختیار کرنا ہوگا۔

۵۔لیکن اگر مذہب پرست طبقہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور قوم سے یہی کہتا رہا کہ دین وہی ہے جو ان کے ہاں اس وقت رائج ہے تو اس کے بعد، دوشکلوں میں سے ایک شکل پیدا ہو کر رہے گی یعنی

ا۔یا یہ قوم بالکل تباہ ہو جائے گی اور

ب۔یا یہ بھی مذہب کو مسجدوں کی چار دیواری میں محدود کر کے اپنے ہاں سیکولرازم رائج کر لے گی۔(اسباب زوال امت 112-114)

دین اور مذہب کے فرق کا شدید پروپیگنڈا کر کے ایک بنیاد قائم کی گئی اور پھر اس کے اوپر اپنے قائم کردہ تصورات کے عمارت تعمیر کی گئی جس کے مطابق مسلمانوں میں موجود تمام طریق عبادات اور عقائد ''مذہبی'' قرار دیئے گئے اور اپنے پیش کردہ تصورات کو دینی درجہ پر فائز کیا۔

اب ہم دیکھتے ہیں آیا قرآن کریم میں بھی دین اور مذہب کی اس قسم کی تفریق سامنے آتی ہے یا نہیں۔اس سلسلہ میں چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ج وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ٥ (3/85)

''جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے اس کا دین قبول نہ کیا جائیگا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔''

۲۔هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ لا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ٥(9/33)

" اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے کہ اسے دیگر تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرک برا مانیں۔"

۳۔وَذَرِ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَھُمۡ لَعِبًا وَّلَھۡوًا وَّغَرَّتۡھُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا۔۔۔۔(70/6)

" اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہیں جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنا رکھا ہے۔ اور دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔"

۴۔وَ قَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَ لۡیَدۡعُ رَبَّہٗ ۚ ط ج اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ اَوۡ اَنۡ یُّظۡھِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ ۵(26/40)

"اور فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰؑ کو مار ڈالوں۔ اسے چاہیے کہ اپنے رب کو پکارے، مجھے تو ڈر ہے کہ یہ کہیں تمہارا دین نہ بدل ڈالے یا ملک میں کوئی بڑا فساد برپا نہ کر دے۔"

۵۔ قُلۡ یٰۤاَیُّھَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۵لا لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۵لا وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۵ج وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۵لا وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۵ج لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ۵(109/1-6)

" آپؐ کہہ دیجئے کہ اے کافرو! نہ میں تمہارے معبودوں کو پوجتا ہوں نہ تم میرے معبود کو پوجتے ہو۔ اور نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا۔ نہ تم اس کی پرستش کرو گے جس کی میں پرستش کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔"

مذکورہ بالا تمام آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چاہے کفار اور مشرکین کا طرز حیات ہو یا مومنین کا، دونوں کو دین کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور حضورؐ کے بارے میں کہا گیا کہ آپ اسلام کو دیگر ادیان پر غالب کر دیں۔ پھر آخری آیات میں یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے جہاں فرمایا کہ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔ کفار مکہ کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ وہ شرک اور اخلاقی پستی کی گہرائیوں ڈوبے ہوئے تھے۔ مگر

ان کے اس طریقے کو بھی قرآن نے دین کہا ہے۔ اس لیے پرویز صاحب کا یہ تصور درست نہیں کہ جب خالص اسلامی طرز حکومت ہو تو وہ دین بن جائے گا۔ اور جب محض ظاہری رسوم ادا کی جارہی ہوں تو وہ مذہب ہو گا۔ یا یہ کہ وحی حضرات انبیائے کرامؑ پر اپنی خالص شکل میں نازل ہوتی رہی مگر بعد میں ان کے متبعین نے اس کی صورت مسخ کر ڈالی اور اپنی طرف سے تحریف کر ڈالی۔ تو اس سلسلے میں یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ چاہے وحی اپنی خالص شکل میں موجود ہو یا منحرف کردہ۔ وہ دین ہی کہلائے گی۔ قرآنی آیات سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ فرعون کا طرز حیات ہو یا کفار مکہ کا، وہ ان کا دین کہلائے گا۔ اور مسلمانوں کا دین اسلام ہے۔ یعنی ان تمام عقائد اور طریق رسوم کو اللہ کے لیے خالص کر دینا۔ اس کے علاوہ اگر آج کے اسلام میں کچھ غلط عقائد اور تصورات داخل ہو گئے ہیں تو ان کے ختم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے نا کہ ہم اس اسلام کو "مذہب" قرار دے دیں۔ اور یہ تصور کر لیں کہ دین کچھ اور چیز ہے۔

دین اور مذہب کے فرق کا یہ تھا پرویز صاحب کا تصور۔ اور اس کا اتنا زیادہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ تقریباً ہر کتاب، پمفلٹ، رسالہ اور دروس کے ذریعے اس کو پختہ کیا گیا پھر اس وقت مسلمانوں میں رائج عقائد، عبادات حتیٰ کہ قرآنی مفاہیم اور اصطلاحات کو بھی "مذہبی" قرار دے دیا گیا۔ پھر ان سب چیزوں کے مقابلہ میں جو تصورات خود دیئے ان کے متعلق کہا گیا کہ یہی دینی ہیں۔

قرآنی اصطلاحات

ہر زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں اصطلاحات بکثرت موجود ہوتی ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جن کے لغوی معانی کوئی اور لیکن طرز بیان میں ان کے کچھ اور معانی لیے جاتے ہیں۔ اور اپنے استعمالات کے لحاظ سے

یہ معانی ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یعنی اگر ایک لفظ کسی جگہ پر اصطلاحاً استعمال ہو رہا ہے تو ہم اس کا لغوی معنی نہیں لے سکتے۔ الفاظ کا سیاق وسباق اس بات کو متعین کر دیتا ہے۔ مثلاً قائد اعظم کے معنی ہیں بہت بڑا رہنما۔ لیکن ہمارے ہاں یہ الفاظ اصطلاحاً جناب محمد علی جناحؒ سے منسوب ہو چکے ہیں۔ یا انگریزی لفظ Holiday کا مطلب ہے مقدس دن۔ لیکن یہ سبھی جانتے ہیں کہ یہی لفظ ہفتہ وار یا دیگر چھٹی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح حکیم کا مطلب دانا ہے لیکن ہم یہ لفظ جڑی بوٹیوں کے ساتھ علاج کرنے والے کے لیے بولتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں پچھلے سال مدینہ گیا تھا۔ تو یہاں مدینہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ وہ مدینۃ النبیؐ گیا تھا حالانکہ مدینہ کے معنی ''شہر'' کے ہوتے ہیں۔ یا زکوٰۃ کا لغوی معنی ہے بڑھوتری، زیادہ ہونا۔ لیکن کوئی بھی شخص لفظ زکوٰۃ کو لغوی معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ سب اصطلاحی معنوں میں زکوٰۃ کا رائج مفہوم ہی لیتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ ہم اسم معرفہ کے لغوی معنی نہیں لے سکتے۔ یعنی وہ نام جو مخصوص شخصیات، اشیاء، مقامات یا اعمال سے منسوب ہوں۔ مثلاً اللہ، قرآن، رسول، نبی، مدینہ منوّرہ، اسلام آباد، گلاس اور ٹیلی ویژن وغیرہ۔

علاّمہ غلام احمد پرویز نے قرآن کریم کی اصطلاحات کے لغوی معانی استعمال کر کے ان کا مفہوم بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اسی بنیاد پر اپنے تمام تصورات کی عمارت تعمیر کی ہے۔ اب یہ بات ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ الفاظ اپنے معانی سیاق وسباق کی رو سے متعین کرتے ہیں لیکن پرویز صاحب کا انداز یہ ہے کہ وہ الفاظ کا مفہوم پہلے متعین کر لیتے ہیں اور پھر اس مفہوم کو قرآن کریم کے دیگر مقامات پر منطبق کر دیتے ہیں چاہے وہ مقام اس کی اجازت دیتا ہو یا نہ۔ اب آیئے اصطلاحات کے بارے میں پہلے پرویز صاحب کا نقطہ نظر دیکھتے ہیں۔

قرآنی اصطلاحات: جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، قرآن فہمی کے سلسلہ میں، سب سے اہم سوال، قرآنی اصطلاحات کے صحیح مفہوم کی تعیین ہے۔ کوئی فن یا موضوع ہو، اس میں اصطلاحات کی حیثیت بنیادی اور کلیدی ہوتی ہے۔ اور جب تک ان اصطلاحات کا صحیح تصور سامنے نہ آئے، متعلقہ موضوع یا فن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اصطلاحات کے الفاظ تو اسی زبان کے ہوتے ہیں جس میں باقی کتاب لکھی گئی ہو، لیکن ان کا مفہوم بڑا جامع اور مخصوص ہوتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو الفاظ اصطلاحات کے لیے استعمال کئے جائیں، ان کے معانی کا اصطلاحات کے معانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہے۔ اصطلاحات کے معانی کی بنیاد، ان الفاظ کے معانی ہی پر رکھی جاتی ہے۔ البتہ ان کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بھی اپنی اصطلاحات اسی طرح وضع کی ہیں۔ اور ان کے معانی کی خود ہی وضاحت کر دی ہے۔ ان معانی کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ پہلے ان الفاظ کے بنیادی معانی کو سمجھا جائے جن سے وہ اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ اس کے بعد، قرآن کریم کے ان تمام مقامات کو سامنے لایا جائے۔ جن میں وہ اصطلاحات آئی ہیں۔ ایسا کرنے سے ان کے معانی واضح طور پر سامنے آجائیں گے۔ میں نے لغات القرآن میں، ان اصطلاحات کے معانی اسی طرح متعین اور بیان کئے ہیں اور وہی معانی اب مفہوم القرآن میں پیش کئے گئے ہیں مثلاً

صلٰوۃ: قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح "اقامت صلٰوۃ" ہے جس کے عام معنی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کئے جاتے ہیں۔ لفظ صلٰوۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے۔ جس کے بنیادی معانی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس لیے صلٰوۃ میں قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنابریں اقامت صلٰوۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانین خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں، قوانین خداوندی کے اتباع کا تصور محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر اقامت صلٰوۃ سے مراد اجتماعات نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔ مفہوم القرآن میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیئے گئے ہیں۔

زکٰوۃ: اسی طرح مثلاً زکٰوۃ کی اصطلاح ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ز۔ک۔و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی بڑھنا، پھولنا، نشوونما پانا ہیں۔ قرآن کریم نے اسلامی نظام یا مملکت کا فریضہ ایتائے زکٰوۃ بتایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ

نظام قائم اس لیے کیا جاتا ہے کہ نوع انسان کو سامان نشو و نما فراہم کیا جائے۔ زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ اپنی دولت میں سے ایک خاص شرح کے مطابق روپیہ نکال کر خیرات کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بھی زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کی ایک جھلک پائی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اسے، ان خاص معانی میں استعمال نہیں کیا۔ اس لیے اس اصطلاح کو انہی معانی کے لیے مخصوص کر دینا قرآنی مفہوم کی وسعت اور ہمہ گیری کو مقید کر دینا ہو گا۔

دیگر اصطلاحات: یہی صورت قرآن کریم کی دیگر اصطلاحات کی ہے۔۔۔ مثلاً کتاب، حکمت، ملائکہ، دین، دنیا، آخرت، قیامت، ساعت، جنت، جہنم، ایمان، کفر، نفاق، فسق، اثم، عدوان، تقوی اور عبادت وغیرہ۔ مروجہ تراجم میں ان اصطلاحات کے صرف وہی معنی دیئے گئے ہیں جو ہمارے ہاں متداول ہیں۔ لیکن مفہوم القرآن میں ان کے وسیع اور ہمہ گیر معانی دیئے گئے ہیں جو مذکورہ بالا طریق سے متعین کئے گئے ہیں۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ان اصطلاحات کے مروجہ مقید مفہوم سے قرآنی تعلیم کس طرح سمٹ جاتی ہے۔ اور ان کے قرآنی مفہوم سے اس کی وسعتیں کس طرح حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسی کتاب کو، جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، اور تمام نوع انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطہ ہدایت ہو، ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔" (مفہوم القرآن۔ تعارف صفحہ ذ تاز)

یہ ہے وہ طریقہ جس کے مطابق ہر اصطلاح کو پرویز صاحب نے ایک نئے معانی پہنا دیئے ہیں۔ اب صلوٰۃ کا مطلب وہ بتا رہے ہیں پیچھے پیچھے چلنا۔ اور مفہوم اس کا لے رہے ہیں "قوانین خداوندی کا اتباع"۔ اور اس مفہوم کے لیے لغت، محاورہ عرب اور تصریف آیات وغیرہ سے کوئی دلیل نہیں دے رہے۔ صلوٰۃ کے بارے میں ہم علیحدہ سے ایک باب "نماز" میں تفصیلی بحث کریں گے۔ اس وقت ہم چند دیگر اصطلاحات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ زکوٰۃ (ز۔ ک۔ و): قرآن کریم میں یہ لفظ بے شمار مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ حقیقت میں یہ اسلام کا ایک اہم ستون ہے۔ لغت میں اس کے معانی نشو و نما، بالیدگی، پھولنا، پھلنا اور پاکیزگی وغیرہ آتے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً اپنے مال میں سے کچھ متعین حصہ حکومت کو دے دینا ہوتا ہے۔ اور انہی معانی میں قرآن کریم نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن پرویز صاحب کا کہنا یہ ہے کہ یہ لفظ ان معانی میں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ زکوٰۃ کا معنی نشو و نما ہے اور یہ حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ عوام کو نشو و نما دے۔ اس لیے زکوٰۃ حکومت دے گی۔ اس کے لیے وہ قرآن کریم کی ایک آیت (22/41) کو بنیاد بناتے ہیں۔ اور باقی تمام آیات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس آیت کو ہم اپنے مقام پر درج کریں گے۔ ہم پہلے زکوٰۃ کے بارے میں پرویز صاحب کا تصور بیان کرتے ہیں۔

”زَکَا الْمَالُ وَالزَّرْعُ۔ یَزْکُوْ۔ زُکُوًّا وَاَزْکٰی۔ جانوروں کا اور کھیتی کا پھلنا، پھولنا، بڑھنا، نشو و نما پانا، اَزْکَی اللّٰہُ الْمَالَ وَزَکَّاہُ۔ خدا نے مال کو نشو و نما دی، بڑھایا۔ زَکَا الرَّجُلُ یَزْکُوْ۔ آدمی آسودہ اور خوش حال ہو گیا۔ اس کی صلاحیتوں میں نشو و نما آگئی۔ اس کی زندگی سرسبز و شاداب ہو گئی۔

لہٰذا زَکَا کے بنیادی معنے نشو و نما پانا، بڑھنا، پھولنا، پھلنا ہیں۔ راغب نے اس کے یہ معنی لکھ کر اس کی مثال میں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی ہے۔ فَلْیَنْظُرْ اَیُّھَا اَزْکٰی طَعَامًا (18/19) یہ دیکھو کہ کونسا کھانا ایسا ہے جو حلال اور خوش انجام ہے۔ یعنی جس میں نشو و نما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے، جو زیادہ (Nutritious) ہے۔“ (لغات القرآن 808)

اس کے بعد مزید لکھتے ہیں

” قرآن کریم میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہی دو ستون ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کے مفہوم کے لیے (ص۔ ل۔ و کے عنوان میں) ”صلوٰۃ“ کا لفظ دیکھئے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس سے مراد ہے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا

اتباع کرتے، اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ہے "ایتائے زکوٰۃ" ایتاء کے معنی ہیں دینا۔ اور (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں (زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما یعنی نوع انسان کی نشوونما (Growth) یا (Development) کا سامان بہم پہنچانا۔ اس "نشو ونما" میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما، دونوں شامل ہیں۔ سورۃ حج میں ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (41/22) "یہ (جماعت مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کرینگے۔" یعنی اسلامی مملکت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" ہوگا۔ یعنی دوسروں کو نشوونما دینا۔ اپنے افراد معاشرہ اور دیگر نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ اس کے متعلق دوسرے مقام پر ہے کہ مومن وہ ہیں هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ (4/23) جو زکوٰۃ (یعنی نوع انسان کی نشوونما) کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔"

(لغات القرآن 809-810)

اب پرویز صاحب کے نزدیک زکوٰۃ ایک ایسا فریضہ ہے جو حکومت ہی سرانجام دے گی۔ اس کے لیے انہوں نے ایک لفظ بکثرت استعمال کیا ہے اور وہ ہے "نظام"۔ یہ لفظ صلوٰۃ کے ساتھ لگا تو "نظام صلوٰۃ" بن گیا اور زکوٰۃ کے ساتھ استعمال ہوا تو "نظام زکوٰۃ"۔

اور جب کسی بھی اصطلاح یا عمل کے ساتھ "نظام" کا لفظ لگ جائے تو اس کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر حکومت وہ کام کرے تو ٹھیک ورنہ کسی کام کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ ذیل میں ہم چند آیات قرآنیہ پیش کرتے ہیں۔ جن سے زکوٰۃ کی وضاحت ہوتی ہے۔

۱۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۵ (43/2)

"اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔"

۲۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ قف وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ط ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۵(2/83)

" اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ تعالی کے سوا دوسروں کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اسی طرح قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور لوگوں کو اچھی باتیں کہنا۔ نمازیں قائم رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہا کرنا۔ لیکن تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ تم سب پھر گئے اور منہ موڑ لیا۔

۳۔ لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ لٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ الۡکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ وَ اٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ لا وَ السَّآئِلِیۡنَ وَ فِی الرِّقَابِ ج وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ ج وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ اِذَا عٰہَدُوۡا ج وَ الصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیۡنَ الۡبَاۡسِ ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ط وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ۵(2/177)

"ساری نیکی مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں۔ بلکہ حقیقتاً نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ تعالی پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت رکھنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرے۔ جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے، تنگدستی، دکھ درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے۔ یہی سچے لوگ ہیں۔ اور یہی پرہیز گار ہیں۔"

۴۔ فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡہِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَہُمۡ وَ بِصَدِّہِمۡ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ کَثِیۡرًا ۵ لا وَّ اَخۡذِہِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُہُوۡا عَنۡہُ وَ اَکۡلِہِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ط وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡکٰفِرِیۡنَ مِنۡہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۵ لٰکِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ مِنۡہُمۡ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَ الۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ط اُولٰٓئِکَ سَنُؤۡتِیۡہِمۡ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ۵(4/160-162)

”جو نفیس چیزیں ان کے لیے حلال کی گئی تھیں وہ ہم نے ان پر حرام کر دیں ان کے ظلم کے باعث اور اللہ تعالی کی راہ سے اکثر لوگوں کو روکنے کے باعث۔ اور سود جس سے منع کیے گئے تھے۔ اسے لینے کے باعث اور لوگوں کا مال ناحق مار کھانے کے باعث اور ان میں جو کفار ہیں ہم نے ان کے لیے المناک عذاب مہیا کر رکھے ہیں۔ لیکن ان میں سے جو کامل اور مضبوط علم والے ہیں اور ایمان والے ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا اور نمازوں کو قائم رکھنے والے ہیں۔ اور زکوۃ ادا کرنے والے ہیں اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے ہیں۔ یہ ہیں جنھیں ہم بہت بڑے اجر عطا فرمائیں گے۔“

۵۔ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ج فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵ (9/5)

” پھر حرمت والے مہینوں کے گزرتے ہی مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ انھیں گرفتار کرو، ان کا محاصرہ کر لو اور ان کی تاک میں ہر گھاٹی میں جا بیٹھو۔ ہاں اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں۔ اور زکوۃ ادا کرنے لگیں تو تم ان کی راہیں چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ تعالی بخشنے والا مہربان ہے۔“

٦۔ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ط وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۵ (9/11)

” اب بھی اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم تو جاننے والوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرما رہے ہیں۔“

درج بالا آیات میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ ایک انفرادی عمل ہے۔ اس کا نظام یا حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ (2/83) سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل سے دیگر معاملات کے علاوہ زکوٰۃ کا بھی وعدہ لیا گیا مگر سب پھر گئے سوائے چند ایک کے۔ علاوہ ازیں، نیکی کے دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی اپنی ایک متعین حیثیت ہے۔ جو کہ غریبوں، یتیموں اور دیگر کی مالی امداد کرنے کے علاوہ ہے۔ (2/77) اس کے

ساتھ ہی (9/5) اور (9/11) میں کہا گیا کہ اگر کافر لوگ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگ جائیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ اب وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں ورنہ ان کو جہاں پاؤ وہیں قتل کرو۔ ان سب مقامات میں یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ لوگوں نے ہی ادا کرنا ہے۔ جس سے یہ تمیز ہو گی کہ کون مسلم ہے اور کون کافر۔

اب آیئے اس آیت کی طرف جس سے پرویز صاحب نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی حکومت کا فریضہ ہے۔ اور پرویز صاحب نے آیت کا پہلا ٹکڑا ہی اکثر مقامات پر بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ ہم پوری آیت اور اس سے پیشتر کی دو آیات دیکھتے ہیں جس سے مفہوم واضح ہو جائیگا۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۵ لا الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ط وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۵ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۵ (22/39-41)

”جن مسلمانوں سے کافر جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں بے شک ان کی مدد پر اللہ قادر ہے۔ یہ وہ ہیں جنھیں بلا وجہ اپنے گھروں سے نکالا گیا صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے اور یہودیوں کے معبد اور مسجدیں ویران کر دی جاتیں جہاں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں ادا کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔ تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔“

مندرجہ بالا آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ مظلوم تھا اور صرف مسلمان ہونے کی بنا پر اپنے گھروں سے نکالا گیا۔ پھر آیت کے آخر میں کہا گیا کہ اگر ہم ان کے پائوں زمین میں جمادیں یعنی انہیں غلبہ و اقتدار عطا کر دیں تو یہ لوگ بلا خوف و خطر نماز کی ادائیگی کریں اور زکوٰۃ دیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دیں۔ یہاں یہ بات نہیں کہی گئی کہ جب انہیں اقتدار حاصل ہو گا تو حکومت کا فریضہ ادائیگی زکوٰۃ ہو گا۔ بلکہ وہی لوگ یعنی عام مسلمان ہونگے جو کفر کی حکومت میں اپنے مذہبی فرائض آزادی سے ادا نہ کر سکتے تھے وہ لوگ اسلامی مملکت میں ان فرائض کو آزادی سے ادا کریں گے۔ حکومت سے مراد وہ ایک محدود طبقہ ہے جو انتظام مملکت سے وابستہ ہے۔ کوئی فریضہ حکومت کے ذمہ ہو تو باقی ساری امت اس سے بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ جبکہ قرآن کریم کے بے شمار مقامات سے واضح ہے کہ یہی بنیادی احکام ہیں جن سے یہ تمیز ہو گی کہ کون مسلم و مومن ہے اور کون کافر و مشرک۔ باقی رہی حکومت کے فرائض کی بات تو وہ احکام قرآن کریم میں بڑے واضح ہیں یعنی چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔ یا قتل کے بدلہ قتل کیا جائے۔ زنا کرنے والے کو سو کوڑے مارے جائیں وغیرہ وغیرہ۔ اور جو احکام پوری امت کے ذمہ ہیں وہ بھی قرآن کریم میں واضح ہیں۔ جیسے رمضان کے روزے، حج و عمرہ، انفاق فی سبیل اللہ، نماز کی ادائیگی اور زکوۃ وغیرہ۔ اسی طرح امر با لمعروف و نہی عن المنکر جو (22/41) میں آئے ہیں پوری امت کا فریضہ ہے جس کے بارے میں ارشاد فرمایا

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط۔۔۔(3/110)

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے ہی پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ تعالی پر ایمان رکھتے ہو۔“

اس سے چند آیات پیشتر یہ ارشاد فرمایا گیا

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (3/104)

” اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح و نجات پانے والے ہیں۔“

ان آیات اور زکوٰۃ کے ضمن میں پیش کی جانے والی آیات کو سامنے رکھئے اور پھر اس آیت پر غور کیجئے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْكَرِط وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۵(22/41)

حقیقت میں پرویز صاحب کا یہ پہلے ہی سے تصور قائم تھا کہ اسلامی احکام یا قرآنی قوانین پر عمل صرف اور صرف قرآنی مملکت ہی میں ہو سکتا ہے۔ اسے وہ سسٹم سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر پرویز صاحب کے پڑھنے اور سننے والوں میں یہ بات اچھی طرح رچ بس گئی کہ چونکہ سسٹم غیر قرآنی ہے اس لیے ہم قرآنی احکام پر عمل کی جوابدہی سے مبرّا ہیں۔ اور مکی (عبوری) دور میں ہیں اور اس سوچ سے ان لوگوں کی اکثریت نے نہ صرف، نماز، روزہ، حج، عمرہ، زکوٰۃ، صدقات و خیرات سے جان چھڑائی، بلکہ عمداً کچھ لوگوں نے ایسے خلاف قرآن کام کرنے شروع کئے جن کے لیے وہ مجبور بھی نہیں تھے۔ مثلاً سود کا لین دین، کاروباری بد دیانتی، دھوکہ اور فریب دہی وغیرہ۔ اور اس کے لیے بنیادی آڑ یہی تھی کہ سسٹم غیر قرآنی ہے۔ اور اسی آڑ میں تعیشات زندگی سے دل بہلاتے رہے۔

۲۔ ذکر (ذ۔ک۔ر): قرآن کریم کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں یاد کرنا۔ اور اصطلاحاً اللہ تعالی کو اس کی ذات، صفات اور قدرتوں کے ذریعے یاد کرنا۔ نماز میں بھی اللہ تعالی کی یاد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اللہ کا فرمان ہے کہ اسے اٹھتے، بیٹھتے، لیٹے ہر وقت یاد کیا جائے۔ اب پرویز صاحب نے اس اصطلاح کو کیا مفہوم پہنایا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

" قرآن کریم کو الذِّکرُ کہا گیا ہے(16 / 44) کیونکہ اس میں اقوام و ملل کے عروج و زوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یادداشتیں بھی۔ اشیائے فطرت پر غور و فکر کرنے والوں کو لِقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ (16 / 13) کہا گیا ہے۔ نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذِکرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان قوانین خداوندی کو سامنے لانے کی جد و جہد جنھیں انہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے (20/42, 20/34) اس لیے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور اس طرح قوانین خداوندی کو عملاً غالب کرنے کو بھی ذِکرٌ کہا گیا ہے (8/45) اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ زندگی کے کسی گوشہ میں، حتیٰ کہ میدان جنگ میں بھی، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔ خود قوانین خداوندی ذِکرُ اللّٰہِ (39 / 23) ہیں۔ شرف اور عظمت کے معنوں میں یہ لفظ (23 / 71) میں آیا ہے۔ نیز (43 / 44) میں، جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّہٗ لَذِکۡرٌ لَّکَ وَلِقَوۡمِکَ کہ تمہاری اور تمہاری قوم کی عظمت اور بڑائی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم قرآن کریم پر عمل پیرا رہو۔ سورۃ قمر میں مُدَّکِرٌ آیا ہے (54 / 15) سورۃ دہر میں جہاں آیا ہے کہ انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا (76 / 1) اس میں مَذۡکُوۡرًا کے معنے ہیں ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آ گئی ہو اور قائم ہو (Existing by itself)۔

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ (2/152) اس کے معنے یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کرونگا۔ اور تمہیں عظمت و سطوت عطا کرونگا۔ تم ان قوانین کا اتباع کرو تو انکے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آ جائینگے۔ (یہاں، علاوہ دیگر امور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور خدا اسکا جواب دیتا ہے۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے۔ اسی قسم کا ردعمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔) لہٰذا ذِکرُ اللّٰہِ کے معنے قوانین خداوندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ گنتے رہنا)۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف و عظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ و تسلط ہے۔ جیسا کہ سابقہ حوالوں میں بتایا جا چکا ہے، صاحب ضرب کلیمی کا فرعون کے

مقابلہ کے لئے جانا، ذکر اور تسبیح ہے۔ (تَسْبِیْحٌ کے لیے دیکھئے س۔ب۔ح کا عنوان)۔ میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذکر ہے۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت و موعظت حاصل کرنا ذکر ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ایک ایک قدم پر قانون خداوندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے۔ اسی کو آج کل کی اصطلاح میں نشر و اشاعت کرنا کہتے ہیں۔ یہی وہ ذِکْرُ اللّٰہِ ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے (28/13) ہم نے اطمینان کے ساتھ "سچے" کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ جھوٹا اطمینان، انسان کو ہر طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر جھوٹا اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو تو لوگ باطل مذاہب پر جمے کس طرح رہیں؟ سچا اطمینان، علی وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے۔ یعنی جب کسی بات پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرنے کے بعد، یا اس کے عملی نتائج سامنے آجانے کے بعد، ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ وہ بات حق و صداقت پر مبنی ہے۔ تو اس سے سچا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ جو دل اور دماغ دونوں کے لئے وجہ ءسکون ہوتا ہے۔ جھوٹا اطمینان، اپنے آپ کو فریب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ سچا اطمینان جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہوا تھا جب انہیں اپنے سے تین گنا فوج پر عظیم فتح حاصل ہوئی تھی (3/125) یہ حجروں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا۔" (لغات القرآن 699-700)

یہ تھا ذکر کے متعلق پرویز صاحب کا تصور۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم تحریر کر چکے ہیں کہ کسی بھی لفظ کے مادے کے لحاظ سے معانی اور اس کے استعمال کے بارے میں پرویز صاحب آئمہ لغت کے حوالہ جات درج کرتے ہیں لیکن اس کے بعد جو تحریر اور مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ وہ پرویز صاحب کا ذاتی فہم ہوتا ہے۔ اس کے لیے کتب لغت کے حوالہ جات نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ذکر کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی پر عمل ہے۔ جبکہ یہ نہیں بتاتے کہ "قوانین خداوندی" کے معنوں میں یہ لفظ لغت کی کس کتاب میں درج ہے۔ اور کس پیشرو، صاحب علم اور امام نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب ہم قرآن کریم کی چند آیات کو سامنے لاتے ہیں جو ذکر کے مفہوم کو واضح کریں گی۔

ا۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ط اُولٰٓئِکَ مَاکَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ۵ ط لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۵ (114/2)

”اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالی کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر کئے جانے کو روکے اور انکی بربادی کی کوشش کرے۔ ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی اس میں جانا چاہیے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑے بڑے عذاب ہیں۔“

۲۔ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ ۵ (152/2)

” پس تم میرا ذکر کرو میں بھی تمہیں یاد کرونگا میری شکر گذاری کرو اور ناشکری سے بچو۔“

۳۔ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ط فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ص وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰکُمْ ج وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ ۵ (198/2)

”تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس ذکر الٰہی کرو اور اس کا ذکر کرو جیسے کہ اس نے تمھیں ہدایت دی۔ حالانکہ تم اس سے پہلے بھولے ہوئے تھے۔“

۴۔ فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآئَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ط فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ ۵ (200/2)

”پھر جب تم ارکان حج ادا کر چکو تو اللہ تعالی کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔“

۵۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ج وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لا لِمَنِ اتَّقٰى ط وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۵ (203/2)

”اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان گنتی کے چند دنوں (ایام تشریق) میں کرو۔ دو دن کی جلدی کرنے والے پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو پیچھے رہ جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ پرہیز گار کے لیے ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تم سب اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے۔“

۶۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۵ (205/7)

”اور اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔ صبح اور شام اور اہل غفلت میں شمار مت ہونا۔“

۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۵ لا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۵ (33/41-42)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ذکر کرو۔ اور صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔“

۸۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ط اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۵ ط (28/13)

”جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی حاصل ہوتی ہے۔“

۹۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ج ۵ صلے (25/76)

” اور اپنے رب کے نام کا صبح و شام ذکر کیا کر۔“

۱۰۔ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ج (103/4)

" پس جب تم نماز مکمل کر چکو تو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اللہ تعالی کا ذکر کرو۔"

ان آیات نے ذکر کے مفہوم کی خود ہی وضاحت کر دی ہے۔ پرویز صاحب نے اپنے زور بیان کی ساری قوت اس نکتہ پر صرف کی ہے کہ "ذکر" سے مراد قانون خداوندی ہے۔ لیکن جب قرآن یہ الفاظ استعمال کرے۔"اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ(2/114)" ، " وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ(76/25) " اور "وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ(2/203) " تو یہاں قانون کے لفظ کا کیسے اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تو رب کریم کے نام کے ذکر کی بات ہو رہی ہے۔ پھر ان آیات میں ذکر پر ایسی بندشیں ہیں جو ہم "قانون" پر لاگو نہیں کر سکتے۔ مثلاً مساجد کے اندر ذکر، مشعر الحرام کے قریب ذکر، ایسا ذکر جیسا اپنے آبائو اجداد کا کرتے تھے، یا اس سے بھی بڑھ کر، گنتی کے چند دنوں کا ذکر، دل میں عاجزی سے ذکر، کثرت سے ذکر، پھر اللہ کے نام کا ذکر اور کھڑے، بیٹھے، لیٹے اللہ کا ذکر۔

قانون کے اوپر زمان و مکاں کی حدود نہیں لگائی جا سکتیں۔ مثلاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دو دن قانون پر عمل کرو۔ مسجد کے اندر قانون پر عمل کرو۔ مشعر الحرام کے قریب قانون پر عمل کرو یا دل میں قانون پر عمل کرو۔ اور صبح اور شام کو قانون پر عمل کرو۔ قانون ایک ہمہ گیر چیز ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت اور ہر حال میں موجود ہوتا ہے۔ اس لیے اوپر بیان کردہ آیات کا سیاق وسباق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ "ذکر" کے معنی "قانون" کے کئے جائیں۔ ذکر کے وہی معانی درست ہیں جو اصطلاحاً معاشرے میں مروج ہیں۔ اور قرآنی آیات ان کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور یہ ذکر صرف مساجد تک محدود نہیں اس کے بارے میں فرمایا۔

وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعۡضَہُمۡ بِبَعۡضٍ لَّہُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذۡکَرُ فِیۡہَا اسۡمُ اللّٰہِ کَثِیۡرًا ط(22/40)

" اگر اللہ تعالی لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے، گرجے اور یہودیوں کے معبد اور مسجدیں ویران ہو جاتیں جہاں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔"

اب یہ تمام مذاہب کی عبادت گاہیں ہیں جہاں اللہ کا نام پکارا جاتا ہے۔ اتنی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اگر کہا جائے کہ ان تمام عبادت گاہوں میں " قوانین خداوندی " پر عمل کیا جاتا ہے تو بات کہاں پہنچتی ہے۔ لیکن پرویز صاحب جو مفہوم ایک دفعہ طے کر لیں اسے تمام مقامات پر لاگو کر کے رہتے ہیں چاہے بات بنے یا نہ بنے۔ اور یہ ان کا عمومی انداز ہے جس میں وہ قرآنی آیات کی عبارت کو بھی نظر انداز کرتے ہیں اور مفہوم کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جس کا متعلقہ آیت سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا۔ اب اوپر بیان کردہ کچھ آیات کا مفہوم ہم پرویز صاحب کے مفہوم القرآن سے پیش کرتے ہیں

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًاۙ (33/41)

" (نبوت تو ختم ہو گئی۔ باقی رہا فریضہء "رسالت" یعنی خدا کے احکام کو لوگوں تک پہنچانا اور ان کے مطابق ایک نظام قائم کرنا۔ سو اسے امت محمدیہ کے سپرد کر دیا۔۔(35/32; 3/109) سو اے جماعت مومنین! تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کو خود اپنے سامنے بھی رکھو، اور ان کا چرچا بھی کرو۔" (مفہوم القرآن 977)

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًاؕ (2/200)

"وہاں سے واپسی کے بعد، تم یہ نہ سمجھ لو کہ جو کچھ تم پر واجب تھا، سب ادا ہو گیا اور اب تم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی۔ وہاں سے واپسی پر بھی تم قوانین خداوندی کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھو۔ اسی طرح جیسے تم، اس سے پہلے، اپنے اسلاف کے مسلک کو اپنے سامنے رکھا کرتے تھے۔۔۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت اور گہرائی کے ساتھ۔" (مفہوم القرآن 95)

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِص وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ۝ (2/198)

اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرو کہ یہ اجتماعات کوئی "یاترا" قسم کی چیز نہیں کہ وہاں دنیاداری کے دھندوں کی کوئی بات نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ان اجتماعات میں (ملت کے لیے) سامان نشو و نما اور معاشی وسائل کے اخذ و طلب کے لیے جدوجہد کرو۔ پھر جب تم، ان مسائل کو طے کر لینے کے بعد عرفات کے میدان سے واپس آجائو (جہاں تمہارا باہمی تعارف ہو چکا ہے) تو مشعر الحرام کے قریب آکر، پھر جمع ہو، اور قانون خداوندی کی راہ نمائی میں، نظام خداوندی کے مختلف گوشوں کو سامنے لائو۔ ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال گذرے کہ ہم توحج کو محض ایک "مذہبی فریضہ" سمجھتے تھے لیکن مذکورہ بالا احکام وہدایات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظام خداوندی کا ایک اہم گوشہ ہے جس کا تعلق ہماری معاشرتی اور تمدنی دنیا سے ہے۔ تو تمہارا پہلا نظریہ غلط تھا۔ صحیح بات وہی ہے جو تمہیں اب بتائی گئی ہے۔" (مفہوم القرآن 74-75)

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا ج ۵ صلے (76/25)

"اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ تو صبح و شام، ہر وقت خدا کی صفت ربوبیت کو اپنے سامنے رکھ اور اس کی روشنی میں نظام ربوبیت کی تشکیل میں سرگرم عمل رہ۔" (مفہوم القرآن 1396)

۳۔ سجدہ۔ مسجد (س۔ج۔د): ہم جن اصطلاحات کا ذکر کر رہے ہیں وہ اسلامی تعلیمات کے بنیادی ستون ہیں۔ اور مقصد ہمارا یہ ہے کہ جو اصطلاحات معاشرے میں رائج ہوں ان کے لغوی معانی کی بنیاد پر ان کے مفہوم میں تبدیلی نہیں پیدا کی جاسکتی۔ ایسا روزمرہ اصطلاحات میں بھی ممکن نہیں ہوتا کجا قرآنی تعلیم کے بنیادی ماخذوں کے ساتھ ہم ایسا سلوک کریں۔ اب ہمارے سامنے ایسا موضوع آرہا ہے کہ جس کا مفہوم بدل کر پرویز صاحب نے اپنے متبعین کا خدا سے تعلق جڑوں سے کاٹ دیا ہے اور اس تعلق کے بنیادی مرکز یعنی مسجد سے ان کو بہت دور کر دیا ہے۔ پہلے ہم سجدہ کے بارے میں پرویز صاحب کے موقف کو سامنے لاتے ہیں۔

"اَلسُّجُوْدُ کے معنی ہیں، سر کو جھکا دینا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی، پست ہونا اور جھک جانا لکھے ہیں۔ نَخْلَۃٌ سَاجِدَۃٌ جھکا ہوا کھجور کا درخت، بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے۔ سَجَدَ الْبَعِیْرُ۔ اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تاکہ سوار اس پر بیٹھ جائے۔ لہٰذا اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کار فرما ہے۔ جسے دور حاضرہ کی علمی اصطلاح میں متوازیت یا (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم (Body) کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ مثلاً جب آپ لیٹے لیٹے کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ یا جب آپ کسی بات پر ہاں کہتے ہیں تو ساتھ ہی سر ہلا دیتے ہیں (بلکہ یوں کہئے کہ آپ کا سر خود بخود غیر شعوری طور پر ہل جاتا ہے) جب آپ کسی کا احترام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے، اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اور ان الفاظ سے جن کا بدیہی مفہوم جسم کی طبعی حرکت ہوتا ہے، اس جذبہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو اس حرکت کا سبب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے میرے حکم کے سامنے "سر جھکا دیا" تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس حکم کو تسلیم کر لیا اور اس کی تعمیل کر دی۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے حکومت کے قانون کی "سرکشی" اختیار کی تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس قانون کے ماننے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف بغاوت اختیار کر لی۔ قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (عربی) میں بات کرتا ہے اس لیے اس کے ہاں بھی اظہار مطالب کا یہی انداز ہے۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ○ (16/49)

" اور جو جاندار کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ، سب خدا کے سامنے سربسجود ہیں اور وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے۔" یہاں یَسْجُدُ کا مفہوم لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ نے واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ احکام خداوندی سے سرکشی

اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی۔ جہاں کہا کہ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (16 / 50) انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س۔ج۔د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرماں پذیری کے) معنوں میں۔"

(اب یہاں پرویز صاحب نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ اس بات کا تعین کون کرے گا کہ کوئی بھی لفظ کسی مقام پر مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا حقیقی معنوں میں۔ اور نہ ہی انہوں نے مجازی معنوں میں استعمال کرتے ہوئے کسی صاحب لغت و تفسیر کا حوالہ دیا ہے۔ اب ایک مقام پر کسی لفظ کا لغوی، اصطلاحی یا مجازی صرف ایک ہی معنی لیا جا سکتا ہے۔ ایسا ناممکن ہے کہ کچھ لوگ تو کسی لفظ کا اصطلاحی مفہوم لیں اور کچھ مجازی۔ ایسی صورت میں قرآن کریم کی کیا صورت بن جائے گی۔ اللہ کی پناہ) آگے مزید لکھتے ہیں۔

"اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی (بیشتر) محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense-Perception) "حواس" کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصول علم یا اظہار خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اس کا اس زمانے کا مذہب، محسوسات کے دائرے میں گھرا ہوا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے "خدا" کے لیے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا تھا۔ بلکہ (Form) ہی کو مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو بالغ تصور کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ اسے عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور و بلوغت میں لانا چاہتا ہے۔ وہ علم بالحواس (Perceptual) کے ساتھ ساتھ تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) پر بھی زور دیتا ہے۔ اور دین کے معاملہ میں بھی شکل (Form) کی بجائے

معنویت (مقصود و مفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن وہ شکل (Form) کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ضرور باقی رکھتا ہے۔}] یہ پرویز صاحب کا ذاتی وضع کردہ تصور ہے۔ جس کے لیے وہ ناقص عقلی دلائل سامنے لا رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں کوئی قرآنی دلیل ان کے پاس نہیں۔ "مصنف"[{ اس لیے کہ (جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے) انسان کو تصورات (Ideas) کی تعبیر کے لیے (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لیے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اس طرح مجرد حقائق (Abstract Truth) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے۔) یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہونے کے باوجود، بعض مقامات میں اسے باقی رکھا ہے۔ صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کی مظہر ہیں مثلاً (سورۃ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے۔ وہاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسولؐ اللہ کی اقتدا میں کھڑا ہو جائے۔ فَاِذَا سَجَدُوْا (4/102) "پھر جب وہ سجدہ کر چکیں" تو وہ پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں "سجدہ" سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے۔ اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین میں رائج تھی۔ قرآن کریم میں صلوٰۃ اور حج ہی وہ "تقاریب" ہیں جن میں محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔"

(حالانکہ قرآن کریم میں ایسی کوئی تقسیم بیان نہیں کی گئی کہ کوئی عمل اپنی اصل میں کچھ اور ہے اور شکل (Form) کے لحاظ سے کچھ اور ہے۔ قرآن کریم نے ہر عمل کے لیے اپنی ہدایات دوٹوک انداز میں دی ہیں۔ چاہے عائلی زندگی ہو، قتال فی سبیل اللہ ہو یا عبادات سے متعلق احکام ہوں۔ اب اوپر سجدہ کے بارے میں پرویز صاحب نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے ہم اس آیت کو پورا درج کرتے ہیں۔ تاکہ یہ واضح ہو کہ یہ عمل (سجدہ اور صلوٰۃ) اپنی تھوڑی سی شکل (Form) میں بیان ہوا ہے یا فی الواقع مقصود بالذات ہے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ ق صلے اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ط اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ
کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۵ وَاِذَا کُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوۃَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَۃٌ مِّنْهُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْآ اَسْلِحَتَهُمْ قف فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا
مِنْ وَّرَآئِکُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَۃٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَکَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ج وَدَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ
اَسْلِحَتِکُمْ وَاَمْتِعَتِکُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْکُمْ مَّیْلَۃً وَّاحِدَۃً ط وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ کَانَ بِکُمْ اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَنْ تَضَعُوْآ اَسْلِحَتَکُمْ
وَخُذُوْا حِذْرَکُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۵ فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ
فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ج اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۵ (4/101-103)

"اور جب تم سفر میں جا رہے ہو تو تم پر نماز کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں، اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ یقیناً کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں اور جب تم ان میں ہو تو ان کے لیے نماز کھڑی کرو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لیے کھڑی ہو، پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمہارے پیچھے آ جائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آ جائے اور تیرے ساتھ نماز ادا کرے۔ اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لیے رہیں۔ کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے بے خبر ہو جاؤ تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں۔ ہاں اپنے ہتھیار اتار رکھنے میں اس وقت تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تمہیں تکلیف ہو یا بوجہ بارش کے یا بسبب بیمار ہو جانے کے، اور اپنے بچاؤ کی چیزیں ساتھ لیے رہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے منکروں کے لیے ذلت کی مار تیار کر رکھی ہے۔ پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے اللہ کا ذکر کرتے رہو، اور جب اطمینان پاؤ تو نماز قائم کرو۔ یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔"

(اگر صلوٰۃ کی اس صورت کی تھوڑی سی شکل (Form) باقی رکھنا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانا چاہیے تھا کہ یہ عمل مقصود بالذات نہیں اس لیے اسے حالت جنگ، حالت سفر اور حالت مرض میں چھوڑ دو۔ اور اصل کام کئے جاؤ جب اطمینان کی حالت آ جائے تو پھر دوبارہ یہ شکل (Form) پوری کر لینا۔ لیکن اس چیز کا حقیقت سے

کوئی تعلق نہیں۔ بات وہی حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے کہ جتنی بھی ہنگامی صورتحال ہو۔ فریضہء صلوٰۃ اپنی اسی شکل میں ہر حال میں پورا کر کے رہنا ہے۔ مصنف)

"یہ دونوں چیزیں (صلوٰۃ اور حج) اجتماعی عمل ہیں۔ اور اجتماعی عمل کے لیے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ اجتماعی عمل میں اگر ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے ، حرکات و سکنات کرے تو اس سے جس قدر انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان امور کی مزید تفصیل صلوٰۃ کے عنوان (باب ص۔ل۔و) میں ملے گی۔"

(اب پچھلے پیرا میں پرویز صاحب یہ بات کہہ چکے ہیں کہ فَاِذَا سَجَدُوْا (4/102) سجدہ سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے۔ لیکن اپنی تعقل پسندی اور مادہ پرستی کی بنا پر اتنی سی (Form) بھی ہضم نہیں کر پا رہے۔ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ پرویز صاحب کے نزدیک صرف وہ عمل قابل تسلیم ہے جو انسانی عقل کے احاطے میں آئے اور اس کا کوئی محسوس مادی نتیجہ ظاہر ہو۔ اب سجدہ و دیگر عبادات عقل کے دائرے سے ماوراہیں یعنی عقل منطق کی رو سے یہ تسلیم نہیں کرتی کہ کسی بھی ہستی کو سجدہ کیا جائے اور پھر اس کا کوئی نتیجہ بھی سامنے نہ آئے۔ یعنی ایسا نتیجہ جیسے فٹ بال کو ٹھوکر لگائی تو وہ بہت دور جا گرا۔ درخت پر زور سے لاٹھی ماری تو پتے نیچے گرنے لگے۔ آگ میں ہاتھ ڈال دیا تو ہاتھ جل اٹھا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ سجدہ ایسے مادی نتائج پیدا نہیں کرتا۔ یہ تو مالک کا حکم ہے اور حکم ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ اب اگلے پیرا میں پرویز صاحب نے سجدے کی تھوڑی سی شکل (Form) کو بھی حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے اور اس کا جو مفہوم بیان کیا ہے اسے دیکھتے ہیں۔ مصنف)

"لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے پر خلوص جذبہ کا بے ساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے تو اس

سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لیے قرآن کریم نے واضح طور پر کہدیا کہ لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ۔۔۔(2/177) نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اور کشاد کی راہ اسکی ہے جو خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ اور مال و دولت کو اس کی محبت کے باوجود، قرابت داروں، یتیموں، مساکین، ابن السبیل اور محتاجوں اور محکوموں کو دیتا ہے۔۔۔"۔ یعنی صلٰوۃ در حقیقت انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کی محسوس مظہر ہے۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے، تو خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، قرآن کریم کہتا ہے کہ فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۵لا الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۵لا الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ۵لا وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۵(107/5-7) ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور نماز کے ظاہرہ ارکان کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے ادا کرتے ہیں (اور سمجھ لیتے ہیں کہ صلٰوۃ کا فریضہ ادا ہو گیا۔ عملاً ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک تک پہنچنا چاہیے (بند لگا کر) روک رکھتے ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سجدہ سے کیا مفہوم ہے۔" (لغات القرآن 844-848)

یہ تھا پرویز صاحب کا تصور سجدہ کے بارے میں، اب ذیل میں ہم چند آیات قرآنیہ کا جائزہ لیتے ہیں جن سے صرف طبعی سجدہ مراد ہے اور کوئی اور مفہوم نہیں لیا جا سکتا۔

ا۔ اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيۡلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَيَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ ۵(39/9)

"بھلا ایک جو بندگی میں لگا ہے رات کی گھڑیوں میں اور سجدے کرتا ہے اور کھڑا رہتا ہے خطرہ رکھتا ہے آخرت کا اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت کی۔"

۲۔ وَعَهِدۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ۵(2/125)

" اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ سے عہد لیا کہ وہ میرے گھر کو پاک رکھیں گے طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔"

۳۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ج ۵ صلے وَّمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۵ (76/25-26)

"اور ذکر کرو اپنے رب کے نام کا صبح و شام، اور رات کے کچھ حصے میں اسے سجدے کرو اور زیادہ حصے میں اس کی تسبیح کرو۔"

۴۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۵ (22/77)

" اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور عبادت کرو اپنے رب کی اور بھلائی کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔"

۵۔ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۵ (53/62)

"پس سجدہ کرو اللہ کو اور عبادت کرو۔"

۶۔ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ط لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ط وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۵ (41/37)

"اور اس کی نشانیوں میں ہیں رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو۔"

۷۔ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۵ (3/43)

"اے مریم! بندگی کر اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر، ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔"

۸۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۵ (25/64)

" اور جو لوگ رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدے میں اور قیام میں۔"

۹۔ وَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْآ اَسْلِحَتَھُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِکُمْ ص(102/4)

" اور جب تو ان میں ہو تو ان کے لیے نماز کھڑی کر، پس ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو جائے اپنے ہتھیار اٹھائے ہوئے۔ پس جب وہ سجدہ کر چکیں تو تیرے پیچھے کھڑے ہو جائیں۔"

۱۰۔ وَجَدْتُّھَا وَقَوْمَھَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (24/27)

"میں نے پایا اسے اور اس کی قوم کو سجدہ کرتے ہوئے سورج کو، اللہ کو چھوڑ کر۔"

۱۱۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا ز سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط۔۔۔۔۔۔۔(29/48)

" محمد اللہ کے رسول اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلے میں سخت ہیں اور آپس میں نرم دل ہیں۔ تو انہیں دیکھے گا رکوع کرتے ہوئے اللہ کے فضل اور خوشی کی تلاش میں۔ ان کے چہروں پر نشانی ہے سجدے کے اثر سے۔"

یہ آیات درج ذیل نکات کی وضاحت کرتی ہیں۔

۱۔ رات کو سجدہ۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں رات کو سجدہ کرنے کا حکم ہے۔ یہاں پر سجدہ کا معنی حکم ماننا نہیں لیے جاسکتے۔ کیونکہ حکم کے لیے زمان کی شرط غیر ضروری ہے۔

۲۔ اللہ کے گھر میں سجدہ۔ اسی طرح حکم ماننے کے لیے کسی مخصوص مکاں، جگہ کی شرط غیر ضروری ہے۔ کیونکہ حکم کا ماننا ہر جگہ اور ہر وقت لازم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر مخصوص جگہ کا اشارہ کر کے سجدہ کے مروجہ مفہوم کی تصدیق کر دی۔

۳۔ رکوع، سجدہ، عبادت، بھلائی کے کام۔ اس آیت میں ان تصورات کی علیحدہ شناخت کر کے واضح کر دیا کہ ان سب کا ایک ہی مطلب نہیں لیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ سب علیحدہ چیزیں ہیں۔ ان سے اطاعت و محکومیت، فرماں پذیری کا مطلب مترشح نہیں ہوتا۔

۴۔ شمس و قمر کو سجدہ۔ یہاں پر سجدہ کا لفظ استعمال کر کے اس کی مزید وضاحت کر دی کہ لوگ سورج اور چاند کو سجدہ کرتے تھے۔ اور وہ سجدہ، سر کا زمین پر ٹیکنے کا ہی تھا۔ نہ کہ سورج اور چاند کی اطاعت یا محکومیت کا۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ وہ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کریں بلکہ سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے۔

۵۔ اللہ کو چھوڑ کر سجدہ۔ یہاں پر سجدہ کے مفہوم کو مروجہ معنی میں اس انداز سے واضح کیا ہے کہ اس کی تردید ممکن نہیں۔ یعنی جیسا "سجدہ" سورج اور چاند کے لیے ہے ویسا ہی "سجدہ" اللہ کے لیے ہے۔ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کے الفاظ نے اس چیز کی وضاحت کر دی کا اللہ کو چھوڑ کر سورج اور چاند کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ ناممکن ہے کہ ہم شمس و قمر کے لیے تو "سجدہ" سے مراد زمین پر سر کا لگانا لیں اور اللہ کے لیے اطاعت، فرماں پذیری، محکومیت۔ آیت کا متن اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

۶۔ سجدے کا نشان۔ اس آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مومنین کے چہرے سجدہ کرنے کے اثر سے مخصوص نشان کے حامل ہو جاتے ہیں ہمارے یہاں اس کے لیے "محراب" کا لفظ مستعمل ہے۔ اب یہ چیز واضح ہو گئی کہ کسی نظام کی اطاعت اور محکومیت سے ماتھے پر نشان نہیں پڑتا۔ بلکہ پیشانی کو زمین پر رکھنے سے ہی وہ نشان پیدا ہوتا ہے۔

پس قرآنی آیات اپنے مطالب و مفہوم کے لیے کافی ہیں ان کے مجازی معانی کی آڑ میں مفہوم بدلنے کے کوشش کسی کے ذاتی جذبات، مزاج اور میلان کی تسکین تو کر سکتی ہے مگر اس سے جو قرآن کہنا چاہتا ہے وہ واضح نہیں ہوتا۔

۴۔ مسجد۔ مسجد کے بارے میں ہمیں کوئی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ سارا عالم اسلام جانتا ہے کہ اس لفظ کا کیا معنی ہے اور قرآن کریم نے اس سے کیا مراد لی ہے۔ لیکن پرویز صاحب جو ہر چیز کی مادی توجیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

"اَلْمَسْجَدُ پیشانی کو کہتے ہیں۔ جو زمین پر رکھی جاتی ہے۔ اور اَلْمَسْجِدُ اس جگہ کو جہاں سجدہ کیا جائے۔ یہ اسم ظرف ہے۔ جس کے معنی سجدہ کرنے کی جگہ اور سجدہ کرنے کا وقت، دونوں ہوسکتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے کہ لوگوں نے ان نوجوانوں کے غار کے مقام پر مسجد بنادی (18/21) یعنی وہ مجاہدین تھے۔ لیکن بعد میں لوگوں کی نگاہوں سے یہ تصور تو اوجھل ہو گیا اور (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) ان کی یادگار میں ایک خانقاہ یا مقبرہ تعمیر کر دیا جو سجدہ گاہ، انام بن گیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہودیوں کے ہیکل کو مسجد کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (17/7) سورۃ التوبہ میں نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کی اس مسجد کا بھی ذکر ہے جس کی بنیاد تقوٰی پر رکھی گئی تھی (9/109) اور اس کا بھی جس کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا تھا۔ اور جسے قرآن کریم نے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اور خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لیے پناہ گاہ کہہ کر پکارا ہے۔ (9/107) قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30/31) اور واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ مشرکین کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ "اللہ کی مسجدوں" کو آباد کریں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَاتَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ۱۸ (72/18) مسجدیں صرف اللہ کے لیے ہیں۔ سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو" ۔ فرقہ بندی شرک اس لیے ہے کہ اس میں خالص خدا کی اطاعت نہیں ہوتی۔ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے امت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو ہی

نہیں سکتا کیونکہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے۔ اسی طرح مسجد سے مراد بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو اس نظام کا مرکز ہو۔ جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ کعبے کو جو مسجد الحرام کہا گیا ہے (27/48) تو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ہے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے۔ وہ اس امت کا مرکز محسوس ہے۔ جسکی خصوصیت مُسْلِمَۃً لَّکَ (128/2) بتائی گئی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ چونکہ نبی اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد، مدینہ کو حکومت خداوندی کا مرکز قرار پانا تھا۔ اس لیے قرآن کریم میں (شب ہجرت کے تذکرہ کے سلسلہ میں) مدینہ کو مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (1/17) وہ ذات جو نقائص سے بہت دور ہے جو اپنے بندے کو ایک رات، مسجد الحرام (مکہ) سے اس مسجد کی طرف لے گیا جو (مکہ سے) بہت دور تھی۔ جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا تھا۔ تاکہ ہم اسے اپنی آیات (نشانیاں) دکھائیں۔" اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں جہاں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف لے جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (23/20) "تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔" یہ آیات، آویزش حضرت موسیٰؑ اور فرعون میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی تھی۔ یہی وہ آیات خداوندی تھیں جن کا مظہر، ہجرت کے بعد، مدینہ کو بننا تھا۔ یعنی جماعت مومنین کا باطل قوتوں پر غلبہ اور کامرانی۔"

درج بالا پیرا سے یہ واضح ہے کہ پرویز صاحب نے اپنے ذاتی مفہوم کی فوقیت کے لیے کس قدر بیّن اور ٹھوس حقائق کا بطلان کیا ہے۔ ہم یہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اسم معرفہ کا لغوی آپریشن کر کے مفہوم تبدیل

نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پرویز صاحب نے مسجد اقصی کو" دور کی مسجد" مسجد الحرام کو "مکہ" اور سجدہ کی جگہ کی بجائے نظام توحید کا مرکز قرار دے کر صریحاً مفہوم بدل دیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں۔

" اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لیے مخصوص نہیں۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سر انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے "عبادت" اور عام دنیاوی امور میں فرق ہی نہیں کیا جاسکتا۔ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ (دیکھئے عنوان ع۔ب۔د) اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے۔ اس لیے وہ بھی عبادت ہے۔ "عبادت" کے لیے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جاسکے۔" اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"سورۃ الفتح میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے متعلق ہے تَرٰىھُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (48/29) "تو انہیں رکوع کرتے ہوئے۔ سجدے کرتے ہوئے دیکھے گا۔" یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لیے جائیں تو مطلب اجتماع صلوۃ کے رکوع و سجود ہونگے۔ اور اگر مجازی معنی لیے جائیں تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سر تسلیم خم کئے ہوئے ہونگے۔ اس کے بعد ہے۔ سِيْمَاھُمْ فِيْ وُجُوْھِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48/29) اس کے عام معنی ہیں۔ "ان کی نشانیاں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات سے ظاہر ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی کامل اطاعت سے ان کے قلب میں جو اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کا اثر، اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (55/41) مجرم اپنی علامات سے پہچانے جائیں گے۔ اس میں اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ اطاعت خداوندی سے قلبی سکون کی کیفیت مینائے رخ سے جھلک کر باہر آجاتی ہے۔" (لغات القرآن 848-851)

یہ تھا پرویز صاحب کے نزدیک مسجد کا مفہوم۔ اب ہم قرآن کریم کی چند آیات پیش کرتے ہیں جو مسجد کے مقام و مفہوم کو واضح کر دیں گی۔

ا۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ قف وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۵ط كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۵ط (29/7)

”آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا اور یہ کہ تم ہر مسجد میں اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھو۔ تم کو اللہ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا۔ اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہوگے۔“

۲۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ط اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ۵ط لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۵ (114/2)

” اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالی کی مسجدوں میں اللہ تعالی کے ذکر کئے جانے کو روکے اور انکی بربادی کی کوشش کرے، ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی ان میں جانا چاہیے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑے بڑے عذاب ہیں۔“

۳۔ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ ط(187/2)

”اور عورتوں کے پاس اس وقت نہ جاؤ جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو۔“

۴۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ط(40/22)

”اگر اللہ تعالی لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے اور مسجدیں اور یہودیوں کے معبد ویران کر دیئے جاتے جہاں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔“

۵۔وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَاتَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا۵ (18/72)

”اور یہ کہ مسجدیں صرف اللہ ہی کی ہیں پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔“

ان آیات سے واضح ہے کہ مسجد اللہ کے ذکر، اللہ کے پکارنے اور اعتکاف و دیگر عبادات کے لیے ہی مخصوص ہے۔ اس کا اور کوئی مقصد نہیں۔ یہ صرف اللہ کا نام لینے، اس کے سامنے جھکنے اور اسی کے سامنے اپنی مرادیں مانگنے کے لیے خالص ہے۔ ایسا کرنا صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ مومن صرف اللہ کو ہی وحدہٗ لاشریک مانتا ہے۔ کسی اور کے آستانے پر نہیں جاتا۔ باقی رہا مسجد کے نظام خداوندی کے مرکز ہونے کا تعلق۔ تو ایسا کرنا اسلام کا مقصود ہی نہ تھا۔ کیونکہ نبی کریمؐ نے بھی فتح مکہ کے بعد مرکز حکومت مدینہ منوّرہ کو ہی رکھا۔ اور دیگر خلفا و سلاطین نے بھی حکومتی و انتظامی سرگرمیوں کا مرکز مکہ کو نہیں بنایا۔ کیونکہ حکومت کی انتظامی مشینری کی نوعیت روبوٹ کی طرح نہیں ہوتی۔ اس میں بہر طور انسان ہی داخل ہوتے ہیں اور لامحالہ خرابی کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔ جیسا کہ دور خلافت کے بعد ہوا۔ اگر مکہ انتظامی مرکز ہوتا تو اس کی حرمت و تقدس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ لیکن یہ بات بر حق ہے کہ چودہ سو سالوں میں کیسے کیسے دور آئے لیکن مکۃ المکرمہ اور مساجد اسلامیہ کی حرمت و تقدس ہر دور میں باقی رہی۔ اس لیے مساجد کی نوعیت اور اہمیت اساساً مذہبی ہے۔ اس کو مادی نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے بعد خانہ کعبہ کو جو بیت اللہ کہا گیا تو اس کے متعلق بھی قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ا۔وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی ط وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۵ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط قَالَ وَمَنْ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّہٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۵ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۵ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ج اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۵ (2/125-128)

''ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے ٹھہرنے کی جگہ اور امن و امان کی جگہ بنائی۔ تم مقام ابراہیمؑ کو جائے نماز مقرر کرلو۔ ہم نے ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع، سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھو۔ جب ابراہیمؑ نے کہا۔ اے پروردگار! تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے باشندوں کو جو اللہ تعالی پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں پھلوں کی روزیاں دے۔ اللہ تعالی نے فرمایا۔ میں کافروں کو بھی تھوڑا دوں گا۔ پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کردوں گا۔ یہ پہنچنے کی جگہ بری ہے۔ ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کعبہ کی بنیادیں اور دیواریں اٹھاتے جاتے تھے۔ اور کہتے جارہے تھے کہ ہمارے پروردگار تو ہم سے قبول فرما۔ تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنالے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنی اطاعت گزار رکھ اور ہمیں اپنی عبادتیں سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ تو توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

۲۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ط وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا لا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۵ (2/158)

''صفا اور مروہ اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ہیں اس لیے بیت اللہ کا حج و عمرہ کرنے والے ان کا طواف کرلیں تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اپنی خوشی سے بھلائی کرنے والوں کا اللہ قدردان ہے۔ اور انہیں خوب جاننے والا ہے۔''

۳۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ط ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۵ (5/97)

'' اللہ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا اور عزت والے مہینہ کو بھی اور حرم میں قربان ہونے والے جانور کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے ہیں اس لیے تاکہ تم اس

بات کا یقین کر لو کہ بے شک اللہ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ اور بے شک اللہ سب چیزوں کو خوب جانتا ہے۔"

۴۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآئَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِط وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍم بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۵ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا وَّطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۵ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۵ لِّیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ م بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ ج فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ز ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَھُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَھُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ۵ (22/25-29)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور اس حرمت والی مسجد سے بھی جسے ہم نے تمام لوگوں کے لیے مساوی کر دیا ہے وہیں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے ہوں۔ جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں الحاد کا ارادہ کرے ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ اور جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کو کعبہ کے مکان کی جگہ مقرر کر دی اس شرط پر کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف قیام رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا۔ اور لوگوں میں حج کی منادی کر دے! لوگ تیرے پاس پاپیادہ بھی آئیں اور دبلے پتلے اونٹوں پر بھی دور دراز کی تمام راہوں سے آئیں۔ اپنے فائدے حاصل کرنے کو آجائیں۔ اور ان مقررہ دنوں میں اللہ کے نام کا ذکر کریں۔ ان چوپایوں پر جو پالتو ہیں۔ پس تم آپ بھی کھاؤ اور بھوکے فقیروں کو بھی کھلاؤ۔ پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں۔ اور اپنی نذریں پوری کریں اور اللہ کے قدیم گھر کا طواف کریں۔"

ان آیات سے ظاہر ہے کہ کعبہ صرف مناسک اسلام کے پورا کرنے کا مرکز ہے نہ کہ حکومتی مشینری کے نظام کا۔ اسی طرح مسجد بھی صرف اللہ کے آگے سر جھکانے کا مرکز ہے۔

درج بالا موضوعات سے ہم نے دیکھا کہ اصطلاحات کا کبھی بھی لغت اور مادے کے لحاظ سے معنی متعین نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ آیات کا سیاق وسباق یہ واضح کرتا ہے کہ کوئی لفظ کن معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔اس لیے پرویز صاحب نے اسلامی اصطلاحات کو لغت اور مادہ کی آڑ میں جو مفہوم پہنانے کی کوشش کی ہے وہ درست نہیں ہے۔

تضاد

قرآن کریم کی ایک آیت ہے اَفَلَایَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۵ (4/82)

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اگر یہ اللہ تعالی کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔"

یہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک چیلنج ہے کہ اس قرآن کریم میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تضاد موجود نہیں ہے۔ اور چودہ سو سال میں کسی بھی فردِ انسانی کو ایسی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ یہ دعویٰ کر سکے کہ قرآن کریم میں اختلاف موجود ہے۔ اب پرویز صاحب نے قرآن فہمی کے جو اصول متعین کئے ہیں ان میں ایک یہ ہے۔۔۔

"(د) سب سے بڑی چیز یہ کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہیے اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لیے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں" (لغات القرآن 17)

حیرت کی بات ہے قرآن کریم یہ چیلنج دے رہا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں اور پرویز صاحب دعویٰ کر رہے ہیں کہ "اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔" یعنی جہاں اختلاف نظر آئے وہاں اس آیت یا تصور کا مفہوم ایسا بیان کیا جائے جو قرآن کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ یا

للعجب! حالانکہ قرآن کریم کی کسی بھی آیت کا مفہوم وہی بیان کیا جاسکتا ہے جو اس آیت کا مفہوم بنتا ہے۔ اس میں کسی بھی فرد انسانی کو اختیار حاصل نہیں کہ وہ متعلقہ مفہوم چھوڑ کر کوئی اور مفہوم بیان کر دے۔ اور نہ ہی عربی زبان کے قواعد اس کی اجازت دیتے ہیں۔ بلکہ ایسا کرنا صریحاً گناہ ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے جیسے قرآن کریم کی دیگر اصطلاحات اور مفردات کا مفہوم بدلا ہے وہ ایسا کرنے سے بالکل نہیں چوکتے۔ آیئے اس کے متعلق ان کے رویے کی ایک مثال دیکھتے ہیں۔

"مَنۡ یَّشَآئُ۔ عقیدۂ جبر کی سند اور تائید میں جو آیات شد و مد سے پیش کی جاتی ہیں۔ وہ وہ ہیں جن میں مَنۡ یَّشَآئُ کے الفاظ آتے ہیں اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "جسے چاہے" مثلاً یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآئُ وَیَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآئُ (16/93) "وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔" یا "فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآئُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآئُ (2/284) وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔" یا " یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآئُ وَیَقۡدِرُ ط (17/30) وہ جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔" وغیرہ۔

اگر اس قسم کی آیات کے وہی معنی لئے جائیں جو ان کے عام ترجموں کی رو سے متعین ہوتے ہیں تو یہ انہی مضامین سے متعلق قرآن کی بے شمار دیگر آیات کے خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً ہدایت و ضلالت کے متعلق ہے۔ وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ قف فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ ج (18/29) ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ عذاب و مغفرت کے متعلق بیشمار مقامات میں کہا گیا ہے۔ کہ جَزَآءً م بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۔ یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ رزق کی بسط و کشاد وغیرہ کے سلسلہ میں اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53/39) انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرے۔

جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے۔ اگر مَنۡ یَّشَآئُ سے متعلق آیات کے معنی یہ لیے جائیں کہ "وہ جسے چاہتا ہے" دے دیتا ہے۔ اس کے لیے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں۔ تو قرآن کریم کی مختلف آیات ایک دوسرے سے

متضاد ہو جائیں گی۔ اور (جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے) قرآن کریم نے اپنے مِنْ جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے۔ کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لہذا مذکورہ صدر آیات باہمد گر متضاد نہیں ہو سکتیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

عربی زبان کے قاعدے کی رو سے مَنْ یَّشَآءُ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "جسے اللہ چاہے" اور دوسرے یہ کہ "جو شخص ایسا چاہے" مثلاً یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ہدایت لینا چاہے، اسے ہدایت مل جاتی ہے اور جو گمراہ رہنا چاہے وہ گمراہ رہتا ہے۔ اسی طرح رزق سے متعلق آیت کے ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ اسے رزق کشادہ ملے اسے کشادہ مل سکتا ہے۔ جو اپنے لئے رزق کی تنگی چاہے۔ اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ (حالانکہ کوئی بھی شخص ایسا نہیں چاہے گا کہ اس کی روزی تنگ ہو جائے۔ مصنف)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں معانی میں ترجیح کن معانی کو دی جائے گی۔ سو اس کا جواب آسان ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے) ان آیات کا وہ مفہوم صحیح ہو گا جو قرآن کریم کی دیگر آیات اور اس کی کلی تعلیم کے مطابق ہو۔ قرآن کریم کی کلی تعلیم کا محور، قانون مکافات عمل ہے۔ یعنی انسان کو اس کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ لہذا ان آیات کا وہی مفہوم قرآنی تعلیم کے مطابق ہو گا۔ جس میں مَنْ یَّشَآءُ کا فاعل انسان کو تصور کیا جائے۔" (کتاب التقدیر 216-218)

اب سوال تو یہ ہے کہ ان مقامات پر مَنْ یَّشَآءُ کا فاعل اللہ تعالی ہے تو وہاں انسان کو کیسے فاعل تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کونسا قاعدہ اور کلیہ موجود ہے۔ مثلاً درج ذیل آیت ہی کو لیجئے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ط (4/116)

”بے شک اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک مقرر کیا جائے۔ ہاں شرک کے علاوہ گناہ جس کے چاہے معاف فرمادے گا۔“

اب یہاں صاف ظاہر ہے کہ لِمَنْ یَّشَآءُ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے پرویز صاحب کی یہ توجیہ ہرگز قبول نہیں کی جاسکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ پرویز صاحب کسی بھی چیز کا پہلے تصور قائم کرلیتے ہیں اور پھر قرآن کریم سے اس کی سند چاہتے ہیں۔ اب ان کے بنائے ہوئے تصور اور قرآن کریم کی کسی آیت میں اختلاف ہو تو یہ چیز انہیں قرآن کریم میں تضاد معلوم ہوتی ہے۔ اب گمراہی اور ہدایت کے بارے میں قرآن کریم کی چند آیات پر غور کرتے ہیں۔ جس سے واضح ہو گا کہ اللہ تعالیٰ تو بالجبر کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

ا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا ط فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ ج وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا م یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا ط وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۵ (2/26)

”یقیناً اللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیان کرنے سے نہیں شرماتا خواہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی اوپر چیز کی۔ ایمان والے تو اسے اپنے رب کی جانب سے صحیح سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی ہے۔ اسی کے ساتھ بیشتر کو گمراہ کرتا ہے اور اکثر لوگوں کو راہِ راست پر لاتا ہے۔ اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔“

۲۔ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ قف لا وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ۵ (14/27)

”ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پکی بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور ظالم لوگوں کو اللہ گمراہ کردیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔“

۳۔ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ط فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ زصلے فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۵ (35/8)

''کیا پس وہ شخص جس کے لیے اس کے برے اعمال مزین کر دیئے گئے ہیں پس وہ انھیں اچھا سمجھتا ہے۔ یقین مانو کہ اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ پس آپ کو ان پر غم کھا کھا کر اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالنی چاہیئے۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے یقیناً اللہ تعالی بخوبی واقف ہے۔''

۴۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ط حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ط كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ج ۵ صلے نالَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ط كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ط كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۵ (40/34-35)

اور اس سے پہلے تمھارے پاس یوسفؑ روشن دلیلیں لے کر آئے۔ پھر بھی تم ان کی لائی ہوئی دلیل میں شک وشبہ ہی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہو گئی، تو تم کہنے لگے ان کے بعد تو اللہ کسی رسول کو بھیجے گا ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے ہر اس شخص کو جو حد سے بڑھ جانے والا شک شبہ کرنے والا ہو۔ جو بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو اللہ کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک یہ تو بڑی بیزاری کی چیز ہے۔ اللہ تعالی اسی طرح ہر ایک مغرور سرکش کے دل پر مہر کر دیتا ہے۔''

۵۔ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۵ لا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ط كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ۵ (40/73-74)

''پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ جنہیں تم شریک کرتے تھے وہ کہاں ہیں؟ جو اللہ کے سوا تھے وہ کہیں گے کہ وہ تو ہم سے بہک / گم گئے بلکہ ہم تو اس سے پہلے کسی کو بھی پکارتے ہی نہ تھے۔ اللہ تعالی کافروں کو اسی طرح گمراہ کرتا ہے۔''

۶۔ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِکَۃً ص وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَھُمْ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا لا لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِیْمَانًا وَّلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ لا وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ وَّالْکٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا ط کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ یَّشَآئُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآئُ ط وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ ط وَمَا ھِیَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْبَشَرِ ۵(31/74)

''ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے رکھے ہیں۔ اور ہم نے ان کی تعداد صرف کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کی۔ تاکہ اہل کتاب یقین کر لیں اور ایمان دار ایمان میں بڑھ جائیں۔ اور اہل کتاب اور مسلمان شک نہ کریں۔ اور جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ کافروں سے کہیں کہ اس بیان سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ تو کُل بنی آدم کے لیے سراسر نصیحت ہے۔''

۷۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ م اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ لا قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ط قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ط وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۵(258/2)

''کیا تو نے اسے نہیں دیکھا جو سلطنت پا کر ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ وہ کہنے لگا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں، ابراہیمؑ نے کہا اللہ تعالیٰ سورج مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ۔ اب تو وہ کافر بھونچکا رہ گیا۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

۸۔ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ط وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ۵(67/5)

”اے رسولؐ! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی۔ اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچا لے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

۹۔ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِالشَّھَادَۃِ عَلٰی وَجۡھِھَاۤ اَوۡ یَخَافُوۡۤا اَنۡ تُرَدَّ اَیۡمَانٌ م بَعۡدَ اَیۡمَانِھِمۡ ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسۡمَعُوۡا ط وَاللّٰہُ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۵ (5/108)

”یہ قریب ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ لوگ واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں یا اس بات سے ڈر جائیں کہ ان سے قسمیں لینے کے بعد قسمیں الٹی پڑ جائیں گی۔ اور اللہ سے ڈرو اور سنو! اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

۱۰۔ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُوۡنَنِیۡ وَقَدۡ تَّعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ ط فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوۡبَھُمۡ ط وَاللّٰہُ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۵ (61/5)

”اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں ستا رہے ہو۔ حالانکہ تمھیں بخوبی معلوم ہے کہ میں تمھاری جانب اللہ کا رسول ہوں پس جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ نے ان کے دلوں کو اور ٹیڑھا کر دیا۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

درج بالا آیات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہدایت اور گمراہی دینے کی قدرت اور طاقت اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ کہ وہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہی دے۔ اب ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ کیسے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور کیسے لوگوں کو گمراہی۔ اس لیے ہمیں ان رویوں پر غور کرنا چاہئے جو ہدایت اور گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔ جیسا کہ آیت نمبر 1 میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ چیز بھی مدّ نظر رہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے جبر کا دخل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات میں یہ چیز

بیان کی گئی ہے۔ کہ اللہ کن لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور کن لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ آیئے کچھ آیات ملاحظہ کرتے ہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥(2/2) اس آیت سے علم ہوا کہ ہدایت متقین کو ملتی ہے۔ اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت 26 میں جامع بات بتادی گئی ہے کہ ہدایت و گمراہی کن لوگوں کے لیے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ط فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا م يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ٥(2/26) یقیناً اللہ تعالی کسی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا خواہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی ہلکی کسی چیز کی۔ ایمان والے تو اسے اپنے رب کی جانب سے صحیح سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی ہے؟ اسی کے ساتھ وہ اکثر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور اکثر لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اور نہیں گمراہ کرتا مگر فاسقوں کو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ م اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ لا قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ط قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (2/258) کیا تو نے اسے نہیں دیکھا جو سلطنت پاکر ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ وہ کہنے لگا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہ اللہ تعالی سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ۔ اب تو وہ کافر بھونچکارہ گیا۔ اور اللہ تعالی ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى لا كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ط لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ٥ (2/263) اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتاکر اور ایذا پہنچاکر برباد نہ کرو۔ جس طرح وہ شخص جو اپنا مال

لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرے اور نہ اللہ تعالی پر ایمان رکھے، نہ قیامت پر۔ اسکی مثال اس صاف پتھر کی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو۔ پھر اس پر زور دار مینہ برسے اور وہ اسے بالکل صاف اور سخت چھوڑ دے۔ ان ریا کاروں کو اپنی کمائی میں سے کوئی چیز ہاتھ نہیں لگتی۔ اور اللہ تعالی کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (86/3) اللہ تعالی ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا۔ جو اپنے ایمان لانے اور رسول کی حقانیت کی گواہی دینے اور اپنے پاس روشن دلیلیں آجانے کے بعد کافر ہو جائیں۔ اللہ تعالی ایسے بے انصاف لوگوں کو راہ راست پر نہیں لاتا۔

يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ٥ (16/5) ہدایت دیتا ہے انہیں اللہ اس (قرآن) کے ذریعے جو پیروی کرتے ہوں اللہ کی رضا کی، سلامتی کی راہوں کی طرف اور اپنی توفیق سے اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔ اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ م بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (51/5) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بنائو۔ یہ تو آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بے شک انہیں میں سے ہے۔ ظالموں کو اللہ تعالی ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ٥ (68/5) اے رسول! جو بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔

اسے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی۔ اور آپ کو اللہ تعالی لوگوں سے بچا لے گا۔ بے شک اللہ تعالی کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۵(9/24) کہہ دو! اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے قبیلے اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو۔ اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ اگر یہ تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو تم اللہ کے حکم سے عذاب کے آنے کا انتظار کرو۔ اللہ تعالی فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۵ (13/27)
کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشان (معجزہ) کیوں نازل نہیں کیا گیا۔

جواب دیجئے! کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جو اس کی طرف جھکے اسے راستہ دکھا دیتا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ط اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۵(42/13) اللہ نے تمہارے لیے وہی شریعت مقرر کر دی ہے۔ جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا اور جو بذریعہ وحی ہم نے تمہاری طرف بھیجی۔ اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ، موسیؑ، اور عیسیؑ کو دیا تھا۔ کہ اس دین کو قائم رکھنا اور فرقہ بندی نہ کرنا۔ جس چیز کی طرف آپ انہیں بلا رہے ہیں۔ وہ تو ان مشرکین پر گراں گزرتی ہے۔ اللہ تعالی جسے چاہے اپنا برگزیدہ بناتے ہیں۔ اور جو بھی اس کی طرف رجوع کرے وہ اس کی راہنمائی کرتا ہے۔

اس مضمون کی بے شمار آیات قرآن میں آئی ہیں۔ لہٰذا قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دیتا ہے جن میں تقویٰ ہو، انابت ہو۔ اور گمراہ انہیں کرتا ہے جو ظالم ہوں، فاسق ہوں۔

اب آیئے اس آیت کی طرف جسے پرویز صاحب نے وجہء اعتراض بنایا ہے یعنی (16/93)۔ پرویز صاحب نے درمیان سے ایک ٹکڑا اٹھا کر درج کر دیا ہے۔ ہم پوری آیت بیان کرتے ہیں۔

"وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ط وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۵ (16/93)

اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی گروہ بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی۔"

اس آخری ٹکڑے نے بات کھول کر بیان کر دی ہے کہ باز پرس تو اس شخص سے ہی ہو سکتی ہے جو کوئی طاقت اور اختیار رکھے۔ اگر کوئی اختیار والا ہی نہ ہو تو پھر باز پرس کیسی؟ نیز جہاں تک جبر کا تعلق ہے تو آیت کا پہلا ٹکڑا یہ بتلا رہا ہے کہ اگر جبر ہوتا تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جبر استعمال نہیں کیا۔ اب درمیان میں جو چیز یعنی جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہی دے کا تعلق ہے تو اس کا معیار اوپر بیان کردہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت ہے۔ (2/284)

"لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ط فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۵ (2/284)

آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔ تمھارے دلوں میں جو کچھ بھی ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا۔ پھر جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے سزا دے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اب اس آیت میں بھی یہ چیز بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالی جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے۔ تو (معاذاللہ) ایسا ظلماً نہیں ہو گا۔ یہ تو عام سمجھ کی بات ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا جوابدہ ہے پھر جس کے اعمال اس قابل ہونگے تو وہ بخش دیا جائے گا اور جس کے اعمال اس قابل نہ ہونگے وہ عذاب کا مستحق ہو گا۔ یہاں بھی "جسے چاہے" کا تعلق ان معیارات سے ہے جو اللہ نے بیان فرمائے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں۔

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ (4/116)

بیشک اللہ تعالی اسے نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک مقرر کیا جائے۔ہاں شرک کے علاوہ گناہ

جس کے چاہے معاف فرماوے گا۔"

اب شرک کے علاوہ جو گناہ اللہ بخشے گا تو وہ (معاذاللہ) کسی ظالم بادشاہ کی طرح نہیں کہ جس کے چاہے گناہ بخش دیئے اور جس کے چاہے نہ بخشے۔ بلکہ قرآن کریم میں اس کے معیار بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور سارا قرآن تو انسانوں کو اچھے اعمال کی ترغیبات سے بھرا پڑا ہے۔ پھر اللہ تعالی کا رویہ انسانوں جیسا نہیں کہ جرم ہو تو فوراً سزا دے دو۔ بلکہ اللہ تعالی تو گناہ گاروں کی رسی کو ڈھیلا کرتا جاتا ہے۔ کہ شاید کسی مقام پر جا کر کوئی شخص اپنے کئے ہوئے گناہوں پر نادم ہو کر توبہ کر لے تو بے شک اللہ تعالی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اور اللہ تعالی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ اب تو ہر انسان کے اعمال کا حساب اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور وہی قدرت رکھتا ہے ہر چیز کی۔ اس لیے ہمیں چاہئے کہ دل میں کوئی بار ڈالے بغیر قرآن کریم میں بیان کردہ خدا تعالی کی ہر بات کو من و عن تسلیم کر لیں اور پھر سچے دل سے راہ حق کی جستجو میں لگ جائیں۔ مسائل وہاں پڑتے ہیں جب ہم خدا تعالی کی ذات کے حوالے سے "کیا، کیوں اور کیسے" جیسے سوالات رکھ دیتے ہیں۔ مثبت طرز عمل ہی سیدھی راہ کی جانب راہنمائی کر سکتا ہے۔ اور منفی انداز فکر تو گمراہی کی پستیوں میں لے جاتا ہے۔ اوپر بیان کردہ

موضوعات کو مثبت انداز میں لیں تو کوئی پیچ و خم دکھائی نہیں دیتا۔ مگر منفی طرز عمل سے وکیلانہ انداز اختیار کر کے آپ کسی بھی سوال کا جواب نہیں پاسکتے۔

اس لیے پرویز صاحب کا یہ موقف درست نہیں کہ مروج اصول و قواعد گرائمر کے مطابق ترجمہ کرنے سے قرآن کریم کی آیات میں تضاد آجاتا ہے۔ اس لیے تضاد سے بچنے کے لیے اصول و قواعد سے ہٹ کر ترجمہ یا مفہوم بیان کر دیا جائے۔ (معاذاللہ) میں تو اسے بہت بڑی جسارت سمجھوں گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ چودہ سو سال سے قرآن کریم سمجھانے کا انداز اور تراجم

عربی زبان کے موجود قواعد کے مطابق ہی ہوئے ہیں۔ اور قرآن کریم کے چیلنج کے جواب میں آج تک کسی انسان کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ دعویٰ کرے کہ معاذاللہ قرآن کریم میں تضاد ہے۔

مضحکہ خیز طرز استدلال

علامہ غلام احمد پرویز صاحب کا یہ عمومی انداز ہے کہ وہ حوالہ جات کی آیات مکمل بیان نہیں کرتے۔ بلکہ ایک آیت میں سے کوئی ٹکڑا چن لیتے ہیں اور اسے بطور دلیل استعمال کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو یہ چیز نظر انداز کی جاسکتی ہے۔ لیکن کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں حوالہ کی آیت کا وہ مفہوم نہیں بنتا جو پرویز صاحب زبردستی بیان کر دیتے ہیں۔ آیئے اس کی کچھ مثالیں دیکھتے ہیں

ا۔" خارجی کائنات میں خدا کی ربوبیت خدا کے قانون کائنات کی رو سے از خود کارفرما ہوتی جاتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں یہ ربوبیت انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہوسکتی ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام سے قائم ہوتا ہے۔ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لیتا ہے۔ جو خدا کی طرف منسوب ہیں۔ اور اس کے بدلے میں افرادِ معاشرہ وہ تمام فرائض و واجبات پورے کرتے رہتے ہیں۔ جن کا عہد انہوں نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا

ہے۔ افرادِ معاشرہ اس نظام کی اطاعت کے اس وقت تک مکلّف ہوتے ہیں جب تک یہ نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُھَا (6/11) زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔ یہ ذمہ داری اس معاشرہ کے سر ہو گی جو خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہو گا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تمہاری پرورش کا سامان اس طرح کر دیا جائے تو پھر تم رزق سمیٹ کر جمع

کیوں کرو؟ تم اسی لئے جمع رکھنا چاہتے تھے کہ کل کو وقت پڑنے پر وہ تمہارے اور تمہاری اولاد کے کام آئے۔ لیکن جب تمہاری اور تمہاری اولاد کی پرورش کی تمام ذمہ داریاں معاشرہ اپنے سر لے لے تو تمہیں جمع کرنے کی کیا ضرورت رہے گی؟ (نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَاِیَّاکُمۡ 17/31) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ "تم اس لیے جمع کرنا چاہتے تھے کہ جب تم بوڑھے ہو جاؤ اور تم میں کمانے کی استطاعت نہ رہے اور تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو اس وقت تمہاری اور ان کی پرورش کا کیا انتظام ہو گا۔ (2/266) لیکن اس نظام ربوبیت میں اس قسم کا خیال بھی دل میں نہیں آنا چاہیے۔ اس میں ہر ایک کی پرورش کا انتظام موجود ہوتا ہے۔" (نظام ربوبیت 159-160)

پرویز صاحب نے جس آیت کے ٹکڑے کو بطور حوالہ نقل کیا ہے۔ ہم اسے مکمل طور پر درج کرتے ہیں

" وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُھَا وَیَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّھَا وَمُسۡتَوۡدَعَھَا ط کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۵ (6/11)

زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے بھی جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں۔ وہی ان کے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے۔ اور ان کے سونپے جانے کی جگہ کو بھی، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔"

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ سب جانداروں کی روزی کا ذمہ دار معاشرہ ہے تو کیا یہ بات صحیح ہو گی کہ ہر جاندار کے مستقر اور مستودع کے بارے میں بھی معاشرہ جانتا ہے۔ قطعاً نہیں! کیونکہ اس کا تعلق غیب سے ہے

اور غیب کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس لیے جب اس آیت میں اسم ذات "اللہ" موجود ہے تو اسے "معاشرہ" یا "نظام" پر کیسے محمول کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح پرویز صاحب نے ایک اور آیت کا حوالہ دیا ہے۔ ہم اسے پورا سیاق و سباق کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

"وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً ٥ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ط إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيراً بَصِيراً ٥ وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاقٍ ط نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُم إنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْءاً كَبِيراً ٥ (17/29-31)

اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے بالکل کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہوا اور پچھتاتا ہوا بیٹھ جائے۔ یقیناً تیرا رب جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر اور خوب دیکھنے والا ہے۔ اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولادوں کو نہ مار ڈالو! ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ یقیناً ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔"

اس آیت سے واضح ہے کہ رزق کی تقسیم کا نظام اللہ تعالی کے ذمہ ہے اگر معاشرہ یا نظام کے ذمہ ہوتا تو کوئی اپنی اولاد کو قتل نہ کرتا۔ پھر آیت کے شروع میں "اِنَّ رَبَّکَ" کے الفاظ بھی اسی چیز پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالی اپنی ذات کے بارے میں فرما رہا ہے کہ وہ جس کا رزق چاہے کم کر دے اور جس کا چاہے زیادہ کر دے۔ وگرنہ اللہ کے لیے یہ کہنا مشکل نہ تھا کہ تمام جانداروں کا رزق معاشرے کے ذمہ ہے۔ اسی بات کو ایک اور جگہ مزید واضح کر دیا۔

وَكَأَيِّن مِّن دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا صلے قز اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ز صلے وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ٥ (29/60)

"اور بہت سے جانور ہیں جو اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے۔ ان سب کو اور تمھیں بھی اللہ ہی روزی دیتا ہے۔ وہ بڑا ہی سننے والا، جاننے والا ہے۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ رزق کی تقسیم کا نظام اللہ تعالی کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ جس میں تمام مخلوقات آجاتی ہیں۔ اور اس آیت میں جانوروں کا علیحدہ سے ذکر ہے۔ اور انسانوں کا علیحدہ سے۔ پھر لفظ "اللہ" استعمال کر کے اس کام کو خاص اپنے لیے مخصوص کر لیا۔

علاوہ ازیں قرآن کے دیگر مقامات سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالی نے کسی کو زیادہ رزق عنایت کیا ہے تو کسی کو کم۔ اور یہ صرف اس لیے ہے کہ اللہ تعالی آزمائے کہ کون صرف اسی کے راستے پر چلتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ ہم تمھیں آزمائیں گے خوف، بھوک، مال، جان اور پھلوں کے نقصان سے، پس بشارت ہے صبر کرنے والوں کے لیے۔ پھر حضورؐ کے بارے میں فرمایا کہ "ہم نے تمھیں تنگدست پایا اور پھر خوشحال کر دیا۔" اس جیسے اور مقامات سے صاف ظاہر ہے کہ رزق اللہ ہی کی ذمہ داری ہے۔

۲۔" خدا اس وقت بھی خدا تھا جب یہ کائنات ظہور میں آئی تھی اور اس وقت بھی خدا رہے گا جب یہ سلسلہ باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا "خدا کی دنیا" اس کی تخلیق کردہ کائنات ہی نہیں۔ اس سے ماورا اور بھی ہے۔ قرآن کریم نے اسی جہت سے "خدا کی دو دنیاؤں" کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام ہے عالم امر، جو خدا کی تخلیق کردہ کائنات سے ماورا ہے۔ اور دوسرا ہے عالم خلق، جو خدا کی پیدا کردہ کائنات پر مشتمل ہے۔ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ (7/54) آگاہ رہو کہ عالم خلق اور عالم امر دونوں خدا کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ قانون کا تعلق عالم خلق سے ہوگا۔ عالم امر سے نہیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں نہ کوئی معلول (Effect) بغیر علّت (Cause) کے وجود میں آسکتا ہے۔ اور نہ کوئی شے کسی پہلے سے موجود مسالہ

(Material) کے بغیر وجود پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ لیکن اس کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ عالم امر سے نہیں۔ خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ یعنی

اس نے اسے کسی پہلے سے موجود مسالہ کے بغیر پیدا کر دیا۔ اس کا یہ فیصلہ کہ ایسی کائنات ظہور میں آنی چاہئے۔ اور پھر اس کا یہ عمل، جس سے اس نے اسے پیدا کر دیا، قانون علّت و معلول اور (دنیا میں) نظام تخلیق و تولید کے یکسر خلاف ہے۔ ان امور کا تعلق عالم امر سے ہے۔ جس میں کوئی قانون نہیں۔ بلکہ خدا کا ارادہ کار فرما ہوتا ہے۔ یہی "خدا کی وہ دنیا" ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ (22/14) وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ (11/107) یقینا تیرا رب اپنے ارادے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ (5/1) وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہے فیصلہ کرتا ہے۔ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ (22/18) وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ لَا یُسۡـَٔلُ عَمَّا یَفۡعَلُ وَ ہُمۡ یُسۡـَٔلُوۡنَ (21/23) اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔" (کتاب التقدیر 35-36)

پرویز صاحب کا یہ تصور ہے کہ خدا کی دو دنیائیں ہیں۔ ایک عالم خلق اور دوسری عالم امر۔ عالم امر میں خدا کا اختیار پوری طرح کار فرما ہے جبکہ عالم خلق میں خدا بھی قانون کا پابند ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے اس قسم کا کوئی تصور نہیں دیا۔ پرویز صاحب نے جن آیات کے ٹکڑوں کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ ہم ان میں سے اوپر خط کشیدہ آیات کو پورا نقل کرتے ہیں۔

i۔ اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ۟ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ یَطۡلُبُہٗ حَثِیۡثًا ۙ وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ وَ النُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِہٖ ؕ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۵۴﴾ (7/54)

"بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ شب سے دن کو ایسے طور چھپا دیتا ہے کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے۔ اور

سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ یاد رکھو! اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا۔ بڑی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔"

اس آیت میں پہلی بات یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ تمام سیارے اسی کے امر (حکم) کے تابع ہیں۔ پھر یہ کہا کہ "خالق ہونا اور حاکم ہونا اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔" یہاں امر کا معنی حاکم (حکم دینے والا) ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے آخری ٹکڑے کا مطلب یہ بیان کر کے کہ " آگاہ رہو! عالم خلق اور عالم امر دونوں خدا کے ہیں۔" امر (حکم) کو عالم امر بیان کر دیا۔ اور پھر اس کے بعد اور پہلے وہ بحث کی جس کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں۔ صاف نظر آرہا ہے کہ پرویز صاحب نے اپنے تصور کو فوقیت دینے کے لیے قرآن کریم کی اس آیت کو Mis-use کیا ہے۔ اس کے بعد چند مزید آیات کے ٹکڑے ہیں جن سے پرویز صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ خدا کا اختیار اور قدرت عالم امر میں ہی موجود ہے۔ آیئے ان دو آیات کو بھی دیکھتے ہیں۔

ii۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۵ ط اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ط اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ۵ (1/5)

"اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو، تمھارے لیے مویشی چوپائے حلال کئے گئے ہیں۔ بجز ان کے جن کے نام پڑھ کر سنا دیئے جائیں گے۔ مگر حالت احرام میں شکار کو حلال جاننے والے نہ بننا۔ یقیناً اللہ جو چاہے حکم کرتا ہے۔"

iii۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ ط وَ

مَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ ط اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۵ (18/22)

''کیا تو نہیں دیکھ رہا کہ اللہ کے سامنے سجدے میں ہیں سب آسمانوں والے اور سب زمینوں والے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی۔ ہاں بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب کا مقولہ ثابت ہو چکا ہے۔ جسے رب ذلیل کر دے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

اب پرویز صاحب کے قائم کردہ اپنے معیار کے مطابق بھی ان دونوں آیات کا تعلق عالم امر سے نہیں بنتا۔ کیونکہ یہ تو وہ احکام ہیں جن کا تعلق خلق سے ہے۔ اس لیے پرویز صاحب کی دنیا کی ''عالم خلق اور عالم امر'' کے حوالہ سے تقسیم درست نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ چیز واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ ہر وقت اختیار اور قدرت کی مالک ہے۔

۳۔ ''(شاہکار رسالت 384-388) مسئلہ اراضیات پر حضرت عمرؓ کی تقریر۔ [تفصیل معاشی نظام کے باب میں ملاحظہ کیجئے]''

یہ ہمارے سامنے پہلا موقع آیا ہے کہ پرویز صاحب نے صحابہ کرامؓ کی اس قدر اہم بحث کا تاریخ کی کسی کتاب سے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ حالانکہ یہ چیز پرویز صاحب کے طرز تحریر کے خلاف ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے۔ ہمارا اصل موضوع بحث ہے آیت کا وہ ٹکڑا جو پرویز صاحب کے بقول حضرت عمرؓ نے جب صحابہ کرامؓ کے سامنے پیش کیا تو کئی دنوں سے جاری ایک اہم معاملہ فوراً حل ہو گیا۔ یعنی مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ بعد میں آنے والوں کا بھی اس میں حق ہے وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْم بَعْدِھِم۔ آیت کے اس ٹکڑے اور واقعہ کو بنیاد بنا کر پرویز صاحب کا کہنا کہ ذاتی ملکیت جائز نہیں ہے۔ ہم آیت پوری تحریر کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْم بَعْدِھِم یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۵ (10/59)

”اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے۔ اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ایمان داروں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ اور دشمنی نہ ڈال۔ اے ہمارے رب بے شک تو شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے۔“

اس آیت میں وَالَّذِیۡنَ ۔یَقُوۡلُوۡنَ کا مرجع ہے اور وہ لوگ یہ بات کہتے ہیں جو آگے بیان کی گئی ہے اس وَالَّذِیۡنَ کا مرجع پچھلی آیت نہیں ہے۔ اب پرویز صاحب آیت کے اس ٹکڑے کا ترجمہ کرتے ہیں ”اور ان لوگوں کا بھی حق جو ان کے بعد آئیں۔“ حالانکہ آیت کا نفس مضمون اور سیاق وسباق اس مفہوم کی قطعی نفی کر رہا ہے۔ اب ہم اس آیت کا مفہوم پرویز صاحب کے مفہوم القرآن سے بیان کرتے ہیں۔

”(اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ ایسے نامساعد حالات میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ان کے درجات بہت بلند ہیں۔ لیکن) جو لوگ ان کے بعد آئے ہیں (ان کا ایمان بھی بڑا محکم ہے) انکی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمارے لیے بھی سامان حفاظت عطا فرمادے اور ہمارے ان بھائیوں کے لیے بھی جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں۔ اور ہمارے دل میں کسی مومن کے لیے ذرّہ بھر کدورت نہ پیدا ہونے دے۔ تو سب کے لیے حالات میں نرمی پیدا کرنے والا، اور سامان نشوونما عطا کرنے والا ہے۔“

(سورۂ حشر آیت نمبر 10 مفہوم القرآن صفحہ 1297)

اب اس مفہوم میں بھی اس چیز کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جو پرویز صاحب نے آیت کے

اس ٹکڑے سے اخذ کیا ہے۔

۴۔ ”حضرت یوسفؑ نے قید خانہ کی چار دیواری میں جو وعظ فرمایا، وہ خدا اور بندے کے اسی تعلق کو واضح کرنے کے لیے تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھی قیدیوں سے پوچھا کہ یٰۤاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ (12/39)

کیا الگ الگ آقائوں کا ہونا اچھا ہے یا اللہ کا جو یگانہ ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم لوگوں نے جن کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے انہیں کوئی حق نہیں کہ انسانوں کو اپنا غلام اور محکوم بنائیں۔ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آبائو اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ جیسے تھیٹر کے تماشے میں کسی کا نام بادشاہ رکھ لیا جاتا ہے۔ کسی کا نام وزیر، حالانکہ وہ فی الحقیقت بادشاہ یا وزیر نہیں ہوتے۔ یاد رکھو!

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ (40/12) حکومت صرف اللہ کے لیے ہے۔

اس کے بعد جو کچھ فرمایا اس سے عبادت کا مفہوم بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ کہا

اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ (40/12) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔

ان دونوں ٹکڑوں کو پھر ملایئے یعنی (۱) حکومت صرف اللہ کے لیے اور (۲) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ (تعبدوا) ظاہر ہے کہ عبادت سے مفہوم محکومیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (40/12) یہی محکم اور متوازن نظام اطاعت (دین) ہے۔ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (40/12) لیکن (مشکل یہ ہے) کہ بہت سے لوگ (اس حقیقت سے) واقف نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ جو لوگ انسانوں کو اپنا حاکم تسلیم کر لیتے ہیں ان کی روش لاعلمی پر مبنی ہے۔ لا یعلمون۔ علم آجانے کے بعد، یعنی اپنی

حقیقت اور دوسرے انسانوں کی صحیح پوزیشن معلوم ہو جانے کے بعد یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان خدا کے سوا اور کسی کی حکومت کو جائز تسلیم کر لے۔"

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا مطلب پرویز صاحب نے یہ کیا ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کو ہے۔ آیئے اس آیت کو پورے سیاق وسباق میں درج کرتے ہیں۔

وَاتَّبَعۡتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ ؕ مَا کَانَ لَنَاۤ اَنۡ نُّشۡرِکَ بِاللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ عَلَیۡنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ۝ یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ۝ ط مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُکُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ط ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (12/38-40)

”میں اپنے باپ دادوں کے دین کا پابند ہوں یعنی ابراہیمؑ و اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے دین کا، ہمیں ہر گز یہ سزاوار نہیں کہ ہم اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو بھی شریک کریں۔ ہم پر اور تمام اور لوگوں پر اللہ تعالی کا یہ خاص فضل ہے لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں۔ اے میرے قید خانے کے دونوں ساتھیو! کیا متفرق کئی پروردگار بہتر ہیں یا ایک اللہ زبردست طاقتور؟ اس کے سوا تم جن کی پوجا پاٹ کر رہے ہو وہ سب نام ہی نام ہیں۔ فرمانروائی صرف اللہ تعالی ہی کی ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ تم سب سوائے اس کے کسی اور کی عبادت نہ کرو، یہی دین درست ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ یہاں بات شرک کے بارے میں ہو رہی ہے لیکن پرویز صاحب نے اس سے مراد حکومت یا محکومیت لیا ہے۔ حالانکہ یوسفؑ قید خانہ سے نکل کر بادشاہ کی محکومیت میں رہے جب آپؑ نے کہا کہ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے۔ میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں (12/55) اور پھر ہم نے یوسفؑ کے لیے اسی طرح تدبیر کی اس

بادشاہ کے دین کی رو سے یہ اپنے بھائی کو نہ لے سکتے تھے۔ (12/76) اس لیے اس وقت حکومت تو بادشاہ کی رہی۔ مگر یوسفؑ کا مقصد لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت کے لیے پکارنا تھا۔ اسی لیے اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ط کے معنی ہیں کہ ”حکم صرف اللہ کا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔“ یہاں حکومت یا حق حکومت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

اس لیے پرویز صاحب کا یہ طرز استدلال مضحکہ خیز ہے کہ وہ آیات کے ٹکڑوں سے اپنی مرضی کا مفہوم اخذ کرتے ہیں جبکہ آیت کو مکمل طور پر درج کرنے سے گریزاں ہیں۔ یہ تو وہ طریقہ ہوا جس کے مطابق مذاقاً (معاذاللہ) کہا جاتا ہے کہ " لَاتَقۡرَبُوۡاالصَّلٰوۃَ" کہ نماز کے قریب نہ جائو۔ آگے پیچھے کیا بات ہو رہی ہے۔ اس کو جان بوجھ کر غائب کر دیا جاتا ہے۔

ہم نے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے وگرنہ پرویز صاحب کے لٹریچر میں یہ طرز تحریر بہ کثرت موجود ہے۔

{☆☆☆☆☆}

باب دوم: مجازی مفہوم

علامہ غلام احمد پرویز صاحب نے اپنے لٹریچر میں قرآن کریم کے بے شمار مقامات پر الفاظ کے حقیقی معانی کی بجائے مجازی معانی مراد لیے ہیں۔ اور اس آڑ میں انہوں نے قرآن کریم کے ان مقامات کے رائج مفہوم پر اپنے ذاتی خیالات و تصورات کو حاوی کر دیا ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بذات خود ایک بنیاد قائم کی کہ جو بات عقل یا حواس خمسہ کے احاطہ میں نہیں آتی یا اس سے ماورا ہے اسے یکسر مسترد کر دیا جائے۔ اور قرآن کریم میں موجود ایسے مقامات کا مجازی مفہوم بیان کر دیا جائے جو عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہو۔ حالانکہ پرویز صاحب اپنی اکثر کتب کے تعارف میں یہ بات کہتے ہیں کہ

” میں قرآن کا ایک ادنی سا طالب علم ہوں۔ میری عمر کا بیشتر حصہ اس پر غور و فکر میں گزرا ہے۔ قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے میرا ہمیشہ سے یہ انداز رہا ہے کہ میں پہلے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کے اندر نہیں جاتا۔ میں ایک سوال کو سامنے رکھتا ہوں اور خالی الذہن ہو کر کوشش کرتا ہوں کہ مجھے قرآن سے اس کا کوئی حل مل جائے۔ جو مجھے قرآن سے ملتا ہے۔ اسے قبول کرتا ہوں۔ خواہ ساری دنیا کے مسلمات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ حتیٰ کہ خود میرے اپنے معتقدات اور تصورات کے بھی خلاف کیوں نہ ہو۔“ (نظام ربوبیت (23-22

اس مقام پر ہم پرویز صاحب کے خیالات میں ایک بہت بڑا تضاد دیکھتے ہیں اور وہ یہ کہ پرویز صاحب داعیان تصوّف کے پیش کردہ ”باطنی معانی“ کو شدّت سے رد کر دیتے ہیں۔ اور ان کے ابطال میں قرآن کریم کی آیات بطور دلیل استعمال کرتے ہیں۔ مگر جب اپنا ”مجازی مفہوم“ پیش کرتے ہیں تو اس وقت نہ انہیں اہل تصوف کے باطنی معانی یاد رہتے ہیں اور نہ ان کے خلاف پیش کردہ قرآنی آیات۔ آیئے اس چیز کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔ باطنی معانی کے متعلق پرویز صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے:

” قرآن کے باطنی معانی۔ اللہ تعالی نے وحی کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ۔ ہم نے ہر رسول کو اس قوم کی زبان میں بھیجا لِیُبَیِّنَ لَھُمۡ (14/4) تاکہ وہ ان کے لیے خدا کے پیغامات کا اظہار واضح کر دے۔ وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَا اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَمَنۡ حَوۡلَھَا (42/7) (12/46) اور اس طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن نازل کیا ہے۔ تاکہ تو اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو (ان کی غلط روش زندگی کے عواقب سے) متنبہ کر دے۔ کِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ۵ (41/3) ایسی کتاب جس کی آیات کھلی اور نکھری ہوئی ہیں۔ یعنی عربی زبان کا قرآن اس قوم کے لیے جو اس کا علم رکھتی ہے۔

قرآن کے ان مقامات سے واضح ہے کہ قرآن عربی زبان کی کتاب ہے۔ اور اس کی زبان بھی ایسی ہے جو واضح اور صاف، کھلی اور نکھری ہوئی ہے۔ عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (28/39) ایسی عربی زبان جس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ کوئی الجھاؤ اور لپیٹ نہیں۔ یہ وہ زبان تھی جسے عرب بالعموم اور ام القری (مکہ) اور اس کے گرد و پیش کی آبادیاں بالخصوص، بغیر کسی دقت اور تکلیف کے بلا تامل و توقف سمجھتی تھیں۔ زبان الفاظ کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کے الفاظ وہ تھے جن کے معانی وہ لوگ بلا تکلف سمجھتے تھے۔ بالفاظ دیگر قرآن کے الفاظ کے وہی معانی ان لوگوں کی زبان میں مستعمل تھے۔ یہ پوزیشن تھی قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی کی ظہور اسلام کے زمانے میں۔ اس کے بعد جب ہم تاریخ کے کچھ اوراق آگے الٹتے ہیں اور اس دور میں پہنچتے ہیں۔ جب ایرانی یہودی اور عیسائی اپنے قدیم عقائد و تصورات کو ساتھ لے کر اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ اور اس طرح مسلمانوں میں (دیگر غیر قرآنی تصورات کی طرح) تصوف بھی عام ہو رہا تھا۔ اس وقت یہ عقیدہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے ایک معانی تو وہ ہیں جو اس کے الفاظ سے ظاہراً طور پر متعین ہوتے ہیں لیکن دوسرے معانی وہ ہیں جو ان کے باطن میں پنہاں ہیں۔ اور یہ باطنی معانی، قرآن کے اصلی اور حقیقی معانی ہیں۔ ہمیں اس زمانے میں یہ عقیدہ ملتا ہے۔ اور جیسا کہ اس زمانے میں عام رواج ہو چکا تھا اس عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی وضعی حدیثیں بھی ملتی ہیں کہ ہر آیت کا ایک ظاہر مفہوم ہوتا ہے اور ایک باطنی۔ حالانکہ جو شخص (قرآن تو ایک طرف) زمانہء ظہور نبویؐ کے عربوں کے مزاج اور خصائص ذہنی پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ عربوں کے ہاں "باطنی تعلیم" کا تصور تک نہ تھا۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ الفاظ کے باطنی معانی بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی احادیث کے جو مجموعے ہیں ان میں وہ وضعی حدیثیں بھی ہیں اور صحیح بھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان میں قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں یہ نہیں لکھا کہ فلاں لفظ کے باطنی معنی یہ ہیں۔ بہر حال، قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس میں کوئی اشارہ تک بھی ایسا نہیں ملتا کہ اس کے الفاظ کے باطنی معنی بھی ہیں اور جب قرآن اس قسم کا تصور نہیں دیتا تو ایسی حدیثیں جن سے اس تصور کی تائید ملتی ہے لا محالہ وضعی اور جعلی ہیں۔" (سلسبیل 145-147 ایڈیشن 1997)

اس بارے میں مزید لکھتے ہیں

"لیکن جب بعد میں یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے عقائد و مسالک، چور دروازے سے اسلام میں داخل ہو گئے تو ہمارے ہاں بھی یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ (تورات کی طرح) قرآن کے الفاظ کے بھی باطنی معانی ہیں۔ اور انہی معانی سے قرآن (بلکہ ذات خداوندی) کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ عقیدہ عباسیوں کے انتہائی دور میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن جس شخص نے اسے ایک منظم فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا وہ ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدین ابن عربی ہیں۔ انہیں عام طور پر شیخ اکبر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں اپنے باطنی عقائد کو بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے۔ وہی فصوص الحکم ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا کہ "اس میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔" (اقبال نامہ جلد 1 صفحہ 44)

شیخ اکبر کے ملفوظات اور یہودیوں کی کتاب زہار کو آمنے سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ یہ دونوں کس حد تک ملتے جلتے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر، اس کے الفاظ کے باطنی معانی کی رو سے کی ہے۔ یہ تفسیر کس قسم کی ہے۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایئے۔ قرآن کریم میں زمین (الارض) کے متعلق ہے۔ مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَ مِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى۔ (20/55) ہم نے تمہیں اس (زمین) سے پیدا کیا ہے۔ اس میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بار دیگر نکالیں گے۔

ابن عربی وحدت الوجود کے عقیدے کے علمبردار ہیں چنانچہ وہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے پھر بقا ملے گی اور دوبارہ نمودار ہونگے۔ (فصوص الحکم)"

یہاں سوال پیدا ہو گا کہ "الارض کا مفہوم احدیت (ذات خداوندی) کس طرح لیا گیا۔"

اس کے متعلق شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ

اولیاء ان کے متعلق براہ راست رسولؐ خدا سے دریافت کر لیتے ہیں۔

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں۔

جس مقام سے نبی لیتے تھے۔ اسی مقام سے انسان کامل، صاحب الزماں، غوث، قطب لیتے ہیں۔

اس کی تشریح دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔

یہ ہے الفاظ قرآنی کے "باطنی معانی" کی سند! یہ ایسی سند ہے جس کا کوئی ثبوت ہی نہیں مانگ سکتا۔ اس لیے کہ ثبوت مانگنے پر جواب یہ ملے گا کہ رات ہم دربار خداوندی میں گئے تھے۔ وہاں ہم نے اللہ میاں کو خود یہ معانی بیان کرتے ہوئے سنا۔

فرمائیے اس کے بعد آپ کیا کہیں گے۔ حتیٰ کہ جب یہ لوگ اس قسم کی تعلیم پیش کریں گے کہ فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے اَنَارَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کیونکہ فرعون ذات حق سے جدا نہ تھا۔ اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم)

تو آپ اس پر بھی معترض نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ وہ کہیں گے کہ یہ قرآن کی فلاں آیت کا باطنی مفہوم ہے۔ جسے ہم نے براہ راست اللہ تعالیٰ سے معلوم کیا ہے۔ اور یہی مفہوم حقیقی اور اصلی ہے۔ جو مفہوم الفاظ قرآنی کے ظاہری معانی کی رو سے متعین کیا جاتا ہے۔ وہ "چچوڑی ہوئی ہڈیوں" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

آپ غور کیجئے کہ یہ قرآن کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی۔ اس سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

”حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا کسی دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔“

(اقبال نامہ۔ جلد 1 صفحہ 35)۔۔۔(سلسبیل 146-157)

مقام حیرت ہے کہ اس طریق معانی کے سلسلہ میں پرویز صاحب اتنی مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے وضع کردہ طریق معانی و مفہوم پر نظر نہیں ڈالتے۔ ویسے تو مفہوم القرآن ایسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن ہم اس مقام پر صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت ہے کہ

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ۵لا اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ج لا اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ ج وَاُبْرِیُٔ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ج وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ لا فِیْ بُیُوْتِکُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۵ج (3/49)

” وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانیاں لایا ہوں۔ میں تمہارے لیے پرندے کی شکل کی طرح مٹی کا پرندہ بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور اللہ کے حکم سے میں مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں۔ اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ اور جو کچھ تم کھاؤ اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرو۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان دار ہو۔“

اس آیت کریمہ کا ترجمہ ہم نے دیکھا۔ اب پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں اس کا کیا مفہوم بیان کیا ہے وہ بھی دیکھئے۔

"اور یوں اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ وہ اس مردہ قوم سے کہے گا کہ میں تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیات نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔ یہ آسمانی روشنی تمہاری آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی۔ جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی، جس پر ترو تازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، پھر سے سر سبز و شاداب ہو جائے گی۔ تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی۔ جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ مختصراً یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت، جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے۔ ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی۔ میں (تمہارے موجودہ نظام سرمایہ داری کی جگہ) ایسا نظام قائم کر دوں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصرف میں لاتے ہو۔ اور کس قدر ذخیرہ کرتے ہو کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جا سکے۔ اس قانون اور نظام میں تمہارے لیے باز آفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے۔ بشرطیکہ تم اس کی صداقت پر یقین کر لو۔"

حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کونسا اصول یا طریقہ ہے جس کے مطابق مندرجہ بالا آیت کا یہ مفہوم نکلتا ہے؟ ایک طرف تو باطنی معنی پر محی الدین ابن عربی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن خود کس طرح کا مفہوم پیش کر رہے ہیں۔

پرویز صاحب مزید لکھتے ہیں۔

" فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ۵ (19/97, 44/58)

ہم نے اسے تیری زبان میں آسان بنا دیا ہے تاکہ یہ اس سے نصیحت حاصل کر سکیں۔

اس قسم کی روشن اور جگمگاتی کتاب (4/175) کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے معانی باطنی ہیں۔ کتاب کے دعاوی کو جھٹلانا ہے جو کتاب بَیَانٌ لِّلنَّاسِ (3/138) اور تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَيۡءٍ (16/89) ہو، اس کے مطالب و معانی میں بطون کا کیا کام؟ بَیَانٌ کے تو معنی ہی ظُہُوۡرٌ (Manifestation) کے ہیں۔ بَیَّنَ الشَّجَرُ کے معنی ہیں درختوں کے پتے باہر نکل آئے۔ بَیَّنَ الۡقَرۡنُ کے معنی ہیں سینگ ابھر کر باہر نکل آیا۔ ایسی کتاب کے معانی کو مخفی اور مستور سمجھنا، کتاب کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ ذرا اس نکتہ پر غور کیجئے۔ ایک شخص قرآن کی کسی آیت کے الفاظ کے معانی محاورۂ عرب کے مطابق متعین کرتا ہے اور آیت کے مفہوم کی تائید قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی لاتا ہے۔ آپ کو اس میں کوئی سقم نظر آتا ہے تو آپ اسے بتاسکتے ہیں کہ اس نے لغت میں فلاں مقام پر غلطی کھائی ہے۔ اور اس کا پیش کردہ مفہوم قرآن کے فلاں مقام سے متصادم ہوتا ہے۔ اس طرح صحت و سقم میں بآسانی تمیز ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص کا دعویٰ یہ ہو کہ اس نے اس آیت کا مفہوم الفاظ قرآنی کے باطنی معانی کی رو سے متعین کیا ہے تو آپ اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ اپنے پیش کردہ باطنی معانی صحیح قرار دیں اور دوسروں کے پیش کردہ باطنی معانی کو غلط!

یاد رکھئے خدا کی کتاب صاف اور واضح عربی زبان کی کتاب ہے۔ جس کے باطنی معانی کوئی نہیں۔ باطنی معانی کا عقیدہ ہی غیر قرآنی ہے اور اسلام کے خلاف سازش۔ فَھَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرۡ۔ (سلسبیل 184-185)

قرآن کے باطنی معانی کے متعلق یہ تھی پرویز صاحب کی رائے۔ لیکن جب وہ خود ہی قرآن کے مجازی معانی بیان کرنے لگیں تو پھر یہ مخالفت کیسی؟ آیئے دیکھتے ہیں۔

”اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو اس آنے والے انقلاب کے متعلق ضروری احکام دیئے گئے۔ قرآن نے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم پہلے ان آیات کا وہ ترجمہ لکھتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ اس

واقعہ کے عمومی مفہوم کو سامنے لاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان آیات کے الفاظ کو مجاز پر محمول کیا جائے تو ان سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے۔ پہلے عمومی مفہوم کو لیجئے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ۝(17/20)

اے موسیٰؑ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے۔

عرض کیا۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝(18/20)

عرض کیا! میری لاٹھی ہے۔ چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

آواز آئی

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوسٰى ۝ (19/20)

حکم ہوا۔ اے موسیٰؑ اسے ڈال دے۔

انہوں نے تعمیل ارشاد کی

فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝(20/20)

چنانچہ موسیٰؑ نے ڈال دیا۔ اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

صدائے غیبی نے کہا

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ قف سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْاُولٰى ۝ (21/20)

حکم ہوا! اب اسے پکڑ لے اور خوف مت کھا۔ ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔

پھر ارشاد ہوا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۝لا(22/20)

اور (نیز حکم ہوا) کہ اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ۔ اور پھر نکال بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلے گا، یہ (تیرے لیے) دوسری نشانی ہوئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہماری نشانیاں ہیں۔ انہیں محض بطور عجوبہ کاری نہیں دکھایا گیا بلکہ یہ ہماری بہت بڑی نشانیوں کی تمہید ہیں۔ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۝ج(23/20)

یہ نشانیاں اس لیے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔

دوسرا مفہوم۔ یہ تو ہے ان آیات کا عمومی مفہوم۔ لیکن اگر ہم معانی کو حقیقت سے مجاز کی طرف منتقل کریں تو بات کچھ اور سامنے آتی ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کا یہ انداز بھی ہے کہ وہ غیر محسوس حقائق کو تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ایسے مقامات میں، ان الفاظ کو ان کے ظاہری معنوں پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ وہ جس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اسے سامنے رکھ کر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت موسیٰؑ کو اس عظیم مہم سے متعلق احکام دیدیئے گئے تو ندائے غیب نے پوچھا کہ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (17/20) اے موسیٰؑ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نقاط نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا کہ بار الہا: یہ احکام کیا ہیں؟ قَالَ هِىَ عَصَاىَ (18/20) یہ تو میرے لیے سفر زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں۔ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا میں اب انہی کے آسرے سے چلوں گا۔ وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِىْ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجھوڑوں گا اور ان کے جمود و تعطل کو حرکت و حرارت میں بدل دوں گا۔ وَلِىَ فِيْهَا مَاٰرِبُ

اُخرٰی۔(20/18) ان کے علاوہ اور معاملات زندگی میں بھی جو میرے سامنے آئیں گے ۔ ان میں ان سے بصیرت و راہنمائی حاصل کروں گا۔ حکم ہوا کہ جاؤ اور انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔قَالَ اَلْقِھَا یٰمُوْسٰی (20/19)

اس وفور شوق کے بعد جب اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام وضوابط پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں۔ایک اژدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے۔فَاَلْقٰھَا فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسْعٰی(20/20)خدا نے کہا کہ موسیٰؑ اس خیال سے مت گبھراوَ۔انہیں مضبوطی سے تھام لو(قَالَ خُذْھَا وَلَا تَخَفْ)ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی(کہ میں ان سے فلاں فلاں کام لوں گا)ہم انہیں ایسا ہی بنا دیں گے۔(سَنُعِیْدُھَا سِیْرَتَھَا الْاُوْلٰی 20/21)اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو، تو نہایت سکون و سکوت اور پوری دلجمعی سے اپنی دعوت کو نہایت روشن اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو ان مشکلات سے محفوظ و مصئون باہر نکل آئے گا۔وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآئَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓئٍ(20/22) تیری اس طرح کی کامیابی تیری دعوت کی صداقت کی نشانی ہے۔یعنی دشمنوں کی ہلاکت منفیانہ حیثیت سے نشان اور تمہاری کامیابی مثبت حیثیت سے کامیابی لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (20/23) یہ احکام ہم تجھے اس لیے دیتے ہیں کہ تجھے دکھا دیں کہ ان کے ذریعے کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔“

یہ ہو گا ان آیات کا مفہوم اگر ان کے الفاظ کو مجاز پر محمول کر کے حقیقت پر نظر رکھی جائے۔“

(برق طور 23-25)

اس کے بعد جس جس مقام پر عصائے موسیٰؑ کا تذکرہ ہوا ہے پرویز صاحب نے اس کا مجازی مفہوم ہی لیا ہے۔مزید لکھتے ہیں۔

"تذکرۂ موسیٰؑ میں ساحرین قوم فرعون کے مقابلہ کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے سامنے آنے سے پہلے تمہیداً اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔) اگر عصا اور ید بیضا کے متعلق قرآن کریم کے الفاظ کے ظاہراً معنی لیے جائیں تو پھر یہ سمجھنا ہو گا کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ مقابلہ قوم فرعون کے جادوگروں سے تھا۔ انہوں نے میدان میں جادو کے زور پر رسیوں کو سانپ بنا کر دوڑتا ہوا دکھایا اور حضرت موسیٰؑ کے عصا نے اژدھا بن کر ان رسیوں کو نگل لیا۔ لیکن اگر قرآنی الفاظ کو استعمارات پر محمول کر لیا جائے تو پھر یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ وہ مقابلہ قوم فرعون کے مذہبی علماء سے تھا۔ انہوں نے اپنے باطل مذہب کی تائید میں دلائل پیش کئے اور اپنے زور بیان سے انہیں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے دعاوی، خداوندی قوانین اور ان کی تائید میں دلائل منیرہ کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ بلکہ وہ پیشوایان مذہب حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے معترف ہو کر آپ پر ایمان لے آئے۔ آئندہ صفحات میں قرآن کی متعلقہ آیات کا ترجمہ ان کے ظاہری معانی کی رو سے دیا گیا ہے۔ اور اس ترجمہ کے مطابق واقعہ کی تفاصیل لکھی گئی ہیں۔ لیکن اگر آپ ان الفاظ کو استعارۃً لیں تو ان آیات کا ترجمہ اور مفہوم اسی انداز سے لینا چاہئے۔ اس طرح سحر کے معنی ہونگے باطل پرستی یا کذب و افتری۔ ساحرین کے معنی ہونگے قوم فرعون کے باطل پیشوایان مذہب، ان کے مندروں کے پجاری یا علماء۔ ان کی رسیوں سے مراد ہو گی ان کی باطل دلیلیں۔ حضرت موسیٰؑ کے عصا سے مراد ہو گی ان کی طرف سے پیش کردہ تنذیری احکام و قوانین۔ اور ید بیضا سے مراد ہوں گے تبشیرات اور ان کی تائید میں پیش کردہ دلائل منیرہ۔"

(برق طور 73-74)

اس کے بعد جہاں سمندر کے پھٹنے اور خشک راستہ بننے کا ذکر ہے وہاں لکھتے ہیں

"ان تصریحات کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر اِضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ کا مطلب کیا ہے؟ سو عربی زبان میں عصا کے معنی لاٹھی ہی کے نہیں بلکہ جماعت کے بھی ہیں۔ عصا (لاٹھی) کو عصا اس لیے کہتے ہیں کہ

اسے انگلیاں مجتمع کر کے مضبوطی سے پکڑا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی جماعت کو لے کر سمندر کی طرف جاؤ۔ (ضَرَب کے معنی چلنا یا سفر کرنا بھی آتے ہیں۔)" (برق طور 108)

اب ایک طرف تو پرویز صاحب کہتے ہیں کہ خدا کی کتاب صاف اور واضح عربی زبان کی کتاب ہے، جس کے باطنی معانی کوئی نہیں۔ باطنی معانی کا عقیدہ ہی غیر قرآنی ہے، اور اسلام کے خلاف سازش۔ اور دوسری طرف اوپر بیان کی گئی آیات اور ان جیسی بے شمار آیات کا مفہوم مجاز پر یا استعارۃً لیتے ہیں۔ آخر ترجمہ یا مفہوم کے وہ کونسے اصول ہیں کہ محی الدین ابن عربی کا باطنی مفہوم تو اسلام کے خلاف سازش ہو اور اپنا بیان کردہ مجازی مفہوم عین قرآنی۔

علاوہ ازیں پرویز صاحب نے عصا کا معنی (جماعت) اور ضَرَب کے معنی چلنا اور اسی طرح دیگر الفاظ کے معانی بیان کر کے اپنے پیش کردہ مفہوم کو عربی زبان کی سند عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی لفظ کا محض معنی بدل دینے سے وہ لفظ قرآنی آیت کے اندر اپنا درست ترجمہ ظاہر کرنے کے قابل رہتا ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر ہم عصا کے معنی لاٹھی کی بجائے جماعت لیتے ہیں تو اس آیت کی کیا پوزیشن ہوگی

قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي۔ (20/18)

کیا یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "یہ میری جماعت ہے، میں اس سے ٹیک لگاتا ہوں اور اپنے ریوڑ کو ہانکتا ہوں۔" سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! زبانوں کے تراجم کے تمام اصول، گرائمر کے قواعد، تفسیری مزاج اور محاورۂ عرب سمیت کوئی ایسا ضابطہ موجود نہیں جو اس طرح مفہوم بدلنے کی اجازت دے۔ حالانکہ سیاق و سباق ہی وہ واحد چیز ہے جو کسی بھی لفظ کا فقرے کے اندر معنی متعین کرتا ہے۔ رہی بات مجاز، باطن یا استعارہ کی۔ تو اگر پرویز صاحب اس کے ذریعے عصا کو جماعت یا احکام و قوانین یا دلائل و براہین بنا سکتے ہیں تو پھر ابن عربی کو بھی حق

پہنچتا ہے کہ وہ الارض کا مطلب ''احدیت'' نکالے۔اس طرح دنیا کے اور بہت سے انسان مجازی معانی کی روسے الفاظ کا رنگ رنگ کا مطلب نکال سکتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ''مجاز'' کے بارے میں پرویز صاحب کی بنیاد کیا ہے۔

''ا۔اس ضمن میں ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے جیسا کہ ہر زبان میں قاعدہ ہے، الفاظ کے ایک معنی ''حقیقی'' ہوتے ہیں اور ایک ''مجازی''۔مثلاً جب ہم کہیں کہ ''وہ تو شیر ہے'' تو اس سے مراد وہ (شیر) جانور نہیں جو جنگل میں رہتا ہے۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ (شیر) جیسا بہادر ہے۔لفظ ''شیر'' کے حقیقی معنی'' جنگل کا ایک طاقتور جانور'' ہیں اور (مندرجہ بالا فقرہ میں) مجازی معنی ''بڑا بہادر''۔ (لغات القرآن 25)

''۲۔لہذا قرآنی الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ متعلقہ آیت میں فلاں لفظ کے معنی حقیقی لئے جانے چاہئیں یا مجازی۔زیر نظر لغت میں اس کا بھی التزام کیا گیا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن مقامات پر ہم نے کسی لفظ کے مجازی معنی لئے ہیں وہاں (بالضرور) اس کے مجازی معنی لئے جائیں۔دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان الفاظ کے حقیقی معنی کیا ہیں۔اس کے بعد متعلقہ آیت میں جو معنی (حقیقی یا مجازی) زیادہ موزوں نظر آئیں انہیں اختیار کر لینا چاہئے۔یہی کیفیت ان مقامات کی بھی ہے جہاں ہم نے قرآنی آیات سے کوئی خاص مفہوم مستنبط کیا ہے۔قارئین میں سے جنہیں ہمارے مفہوم سے اختلاف ہو وہ اپنے لئے خود مفہوم متعین کر سکتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ زیر نظر لغت میں جو حصہ الفاظ کے لغوی معانی سے متعلق ہے وہ مستند کتب لغت سے ماخوذ ہے۔اس لئے مستند ہے۔لیکن جو کچھ ہم نے اپنی طرف سے کہا ہے اگر کسی کو اس سے اتفاق نہ ہو تو وہ اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اس کا مفہوم خود متعین کر سکتے ہیں۔''

(لغات القرآن 27)

پرویز صاحب نے پہلے پیرا میں مجاز کی جو مثال دی ہے وہ اسلوب کے عین مطابق ہے۔ لیکن دوسرے پیرا میں ان کا یہ کہنا "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن مقامات پر ہم نے کسی لفظ کے مجازی معنی لئے ہیں۔ وہاں (بالضرور) اس کے مجازی معنی لئے جائیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ ان الفاظ کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ اس کے بعد متعلقہ آیت میں جو معنی (حقیقی یا مجازی) زیادہ موزوں نظر آئیں۔ انہیں اختیار کر لینا چاہئے۔" حقیقت کے برعکس ہے کیونکہ ایک مقام پر اگر کوئی لفظ مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے تو وہاں اس کے حقیقی معنی نہیں لئے جاسکتے جیسے "وہ تو شیر ہے" میں معنی صاف ظاہر ہیں۔ اسی طرح باپ اپنے بیٹے کے متعلق کہے کہ "یہ تو میرا دایاں بازو ہے۔" تو یہاں حقیقی و مجازی کے لحاظ سے موزونیت اور ناموزونیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف ایک ہی معنی مراد لئے جائینگے۔ دوسری بات یہ کہ پرویز صاحب کا دعوی ہے کہ ان کا مرتب کردہ لغت، ائمہ اہل لغت کی بیان کردہ لغت کی کتابوں سے لیا گیا ہے، مگر پرویز صاحب نے اس لغت میں یہ کہیں نہیں بتایا کہ کس امام نے کس لفظ کا مجازی معنی لیا ہے اور کہاں استعمال کیا ہے۔ لغت کی تشریح تو مذکورہ امام صاحب کی ہے مگر مجازی مفہوم پرویز صاحب کا وضع کردہ۔ اس سلسلے میں تاریخ سے کوئی حوالہ نہیں۔ یہ کیسا اسلام ہے کہ جس میں چودہ سو سال تک تو آیات کا عمومی مفہوم ہی سمجھا گیا اور اب آکے یہ ظاہر ہوا کہ اس کا تو اصل مفہوم مجازی ہے (معاذ اللہ)۔ اب ہم استعارہ اور مجاز کے کلام میں استعمال کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ جس سے ان کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے گی۔

استعارہ

تعریف: لغوی معنی ادھار لینا۔ مگر علم بیان میں جب کوئی لفظ اپنے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔ استعارہ میں مشبہ کو عین مشبہ بہ تصور کر لیا جاتا ہے۔ جب کہ مشبہ کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ مثلاً ماں نے کہا۔ "دیکھو میرا چاند آ رہا ہے۔"

یہاں ماں نے اپنے بیٹے کے لئے چاند کا لفظ مستعار لیا ہے۔

ارکان استعارہ تین ہیں(i)مستعار لہ(ii)مستعار منہ (iii)وجہ جامع۔

(i) مستعار لہ: جس کے لئے ادھار لیا گیا۔ اوپر والے جملے میں "بیٹے" کے لئے لفظ چاند لیا گیا ہے۔ (بیٹا مستعار لہ ہے)

(ii) مستعار منہ: جس سے ادھار لیا گیا ہے۔(چاند کا لفظ)

(iii) وجہ جامع: وہ صفت جو دونوں میں مشترک ہو۔(خوبصورتی)

وضاحت: کسی خوبرو دوشیزہ کو چاند کہہ دیا تو یہ استعارہ ہو گا اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ وہ دوشیزہ چاند جیسی حسین ہے تو یہ تشبیہ ہو گی۔

مجاز مرسل

تعریف: کلام میں جو لفظ اپنے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی رنگ میں استعمال ہو اور حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ اور استعارے کے سوا کوئی تعلق پایا جائے تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل قسمیں یا صورتیں ہیں۔

ا۔ کل بول کر جزو مراد لینا۔

گر کوئی کہے یا علی حیدر

بھاگیں کانوں میں انگلیاں دے کر اور

بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے۔

وضاحت: انگلیاں کہہ کر ایک انگلی یا اس کا کچھ حصہ مراد لیا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں بازار کہہ کر دکان مراد ہے۔

۲۔　جزو بول کر کل مراد لینا۔

سنگ زنی کی گل کے بدلے

دی صلوتیں قل کے بدلے

جس جا ہجوم بلبل و گل سے جگہ نہ تھی

واں ہائے ایک برگ نہیں ایک پر نہیں

تو جہاں ناز سے قدم رکھ دے

وہ زمین آسمان ہے پیارے

وضاحت: قل کہہ کر پوری سورہ قل مراد ہے۔ جب کہ دوسرے شعر میں برگ اور پر کہہ کر سبزہ، پھول، پتے اور پرندے ہر قسم مراد ہے۔ تیسرے شعر میں قدم کہہ کر پورا جسم مراد لیا ہے۔

۳۔　ظرف بول کر مظروف مراد لینا۔

پلا ساقیا ساغر بے نظیر

پھنسی دام ہجراں میں بدر منیر

سوجھتی ہی نہیں بوتل کے سوا کچھ ہم کو

لطف آتا ہے جو گھنگور گھٹا ہوتی ہے

وضاحت: مذکورہ اشعار میں ساغر اور بوتل کہہ کر مشروب مراد ہے۔ جو ان دونوں میں موجود ہے۔

۴۔　مظروف بول کر ظرف مراد لینا۔ مثلاً یوں کہنا کہ پانی لے آئو۔

تیری چشم مست ساقیا یہ سیاہ مست جنون ہوا

کہ مئے دو آتشہ طاق پر جو دھری تھی یوں ہی

دھری رہ گئی

وضاحت: مئے دو آتشہ کہہ کر شراب کی بوتل مراد لی ہے۔

۵۔ سبب بول کر مسبب مراد لینا۔

غضب آنکھیں ستم ابرو عجب منہ کی صفائی ہے

خدا نے اپنے ہاتھوں سے تری صورت بنائی ہے

کس نے ہاتھ سے پٹکا ساغر موسم کی بے کیفی پر

اتنا ٹوٹ کے برسا بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

وضاحت: پہلے شعر میں اپنے ہاتھوں کو کہہ کر اپنی قدرت کاملہ مراد ہے۔ دوسرے شعر میں بادل برسنا سے مینہ برسنا مراد ہے۔

۶۔ مسبب بول کر سبب مراد لینا۔ آگ جل رہی ہے حالانکہ لکڑیاں جلتی ہیں۔

اس کا کوئی گود کا پالا نہ تھا

گھر میں کوئی گھر کا اجالا نہ تھا

مجھے عادت ہے اپنے گھر نماز شام پڑھنے کی

مری میت کو دفنانا غروب شام سے پہلے

وضاحت: گھر کا اجالا بیٹے کو کہا گیا ہے "غروب شام" کہہ کر غروب آفتاب مراد لیا ہے۔

۷۔ آلہ کا ذکر کر کے صاحب آلہ مراد لینا۔ مثلاً یوں کہنا قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

۸۔ تضاد کا تعلق: مثلاً جاہل کو ارسطو کہنا یا شریف کو رذیل مراد لینا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۹۔ زمانہ سابق سے تعبیر کرنا: مثلاً کسی ریٹائرڈ کرنل کو کرنل کہہ کر پکارنا۔

۱۰۔ زمانہ مستقبل سے تعبیر کرنا: میڈیکل یا انجینئرنگ کے طلبہ کو ڈاکٹر یا انجینئر کہہ کر پکارنا۔

۱۱۔ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ بیان کرنا۔

زمانے کی نظروں میں ہم بے وفا تھے

خطا بس یہی تھی کہ ہم بے خطا تھے

۱۲۔ مضاف الیہ کو حذف کر کے مضاف کا بیان کرنا۔

سگ اصحاب ہوا صحبت انسان سے بشر

آدمی ہو کے بھی انسان تو انسان نہ ہوا

(آئینہ اردو۔ انٹر میڈیٹ 911-914)

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ کلام میں مجاز کا استعمال اور "باطنی و مجازی مفہوم" میں بہت فرق ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ "وہ تو شیر ہے" یا "دیکھو میرا چاند آ رہا ہے" تو یہاں سیاق و سباق میں شیر اور چاند کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ کن معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ہر زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ ان اصناف کو علیحدہ سے سمجھانا نہیں پڑتا۔ ان میں کوئی بات ڈھکی چھپی ہے ہی نہیں۔ پھر یہاں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سیاق و سباق ہی ایک ایسی چیز ہے جو فقرے میں کسی لفظ کا معنی متعین کرتا ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جس کا جی چاہے یہاں مجازی معنی مراد لے اور جس کا جی چاہے حقیقی۔ کلام میں مجاز کے استعمال سے مفر نہیں۔ لیکن اہل تصوف کے باطنی معانی اور پرویز صاحب کا مجازی مفہوم کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس کا گرائمر کے "مجاز مرسل" سے کوئی واسطہ نہیں۔ قرآن کریم نے بھی ان اصناف کو استعمال کیا ہے۔ آیئے اس کی کچھ مثالیں دیکھتے ہیں۔

۱۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ ط وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ زوَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۵ (7/2)

"اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔"

۲۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ ص وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ج(17/8)

"پس تم نے انہیں قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا۔ اور آپ نے تیر نہیں چلایا بلکہ اللہ نے چلایا۔"

۳۔ ھٰذَا کِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْکُمْ بِالْحَقِّ ط(29/45)

"یہ ہماری کتاب جو تمہارے بارے میں سچ سچ بول رہی ہے۔"

۴۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ج(10/48)

"جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔"

ان آیات میں کوئی بھی معنی اپنی اصل سے ہٹ کر نہیں ہے۔ اور کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ! بھئی یہاں ان کے حقیقی معنی نہ لینا۔

اس کے علاوہ قرآن کریم میں جہاں جہاں انبیاء کرام کے معجزات کا تذکرہ ہے۔ پرویز صاحب نے وہاں اپنے متعین کردہ مجازی معانی کی رو سے ہر مقام پر ان کا مفہوم بدل دیا ہے۔ اور اس تمام کدوکاوش سے ان کا مقصد فقط قرآن کریم کو عقل انسانی کے تابع بنانا ہے نہ کہ جو قرآن کریم کہتا ہے اسے من وعن قبول کرنا ہے۔

{☆☆☆☆☆}

باب سوم: معجزات

اللہ تعالی نے انبیائے کرامؑ کو وقتاً فوقتاً معجزات عطا فرمائے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں بالتصریح موجود ہے۔ لیکن علامہ غلام احمد پرویز نے ان تمام معجزات کی نفی کی ہے۔ اور قرآن کریم کے ہر اس مقام کو ایسا مفہوم پہنا دیا ہے جس سے وہ عقل کے دائرہ کار میں آجائے۔ یعنی پرویز صاحب نے پہلے سے اس چیز کا تعین کر رکھا ہے کہ قرآن کریم کا کوئی بھی مقام یا آیت عقل کے خلاف نہ جائے۔ ان کے بقول اللہ تعالی نے کائنات بنا کر اسے قوانین کا تابع بنا دیا ہے اور ہر کام مقررہ قوانین کے مطابق ہی ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں کائنات بشمول جملہ انسانی امور میں اللہ تعالی خود بھی دخیل نہیں ہوتے۔ یہاں پہنچ کر وہ خود بھی قاعدے اور قانون کے پابند ہیں۔

اس لیے قرآن کریم کے وہ تمام مقامات جہاں اللہ تعالیٰ انسانی امور میں دخیل ہیں یا ایسے تمام کام جو قاعدے اور قانون سے ہٹ کر ہوئے ہیں وہاں پرویز صاحب نے قرآنی آیات کا مفہوم بالکل بدل دیا ہے اور اس سلسلہ میں جملہ قواعد و ضوابط عربی، ترجمہ، تفسیر، گرائمر، محاورئہ عرب و دیگر کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ذیل میں ہم ان مقامات کا تفصیل سے جائزہ لیں گے اور قرآنی آیات کی رو سے بتائیں گے کہ خدا اس کائنات میں بھی قادر مطلق ہے اور جو چاہے سو کرتا ہے۔

ویسے تو سارا قرآن ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے جو ماورائے عقل اور سائنسی قوانین کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ لیکن ہم چند اہم واقعات کا تجزیہ کریں گے۔ پہلے اس سلسلہ میں دیکھتے ہیں حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے چند واقعات۔

عصائے موسیٰؑ۔ قرآن کریم میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ مگر اس کے بارے میں پرویز صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے

”اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو اس آنے والے انقلاب کے متعلق ضروری احکام دیئے گئے۔ قرآن نے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم پہلے ان آیات کا وہ ترجمہ لکھتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ اس واقعہ کے عمومی مفہوم کو سامنے لاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان آیات کے الفاظ کو مجاز پر محمول کیا جائے تو ان سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے۔ پہلے عمومی مفہوم کو لیجئے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ٥ (17/20)

اے موسیٰؑ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے۔

عرض کیا۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ۵ (20/18)

عرض کیا! میری لاٹھی ہے۔ چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

آواز آئی

قَالَ أَلْقِهَا يَا مُوسَىٰ ۵ (20/19)

حکم ہوا۔ اے موسیٰؑ اسے ڈال دے۔

انہوں نے تعمیل ارشاد کی

فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ۵ (20/20)

چنانچہ موسیٰؑ نے ڈال دیا۔ اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

صدائے غیبی نے کہا

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ قف سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ۵ (20/21)

حکم ہوا! اب اسے پکڑ لے اور خوف مت کھا۔ ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔

پھر ارشاد ہوا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ۵ (20/22)

اور (نیز حکم ہوا) کہ اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ اور پھر نکال۔ بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلے گا، یہ (تیرے لیے) دوسری نشانی ہوئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہماری نشانیاں ہیں۔ انہیں محض بطور عجوبہ کاری نہیں دکھایا گیا بلکہ یہ ہماری بہت بڑی نشانیوں کی تمہید ہیں۔

لِنُرِیَکَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡکُبۡرٰی ۵ (23/20)

یہ نشانیاں اس لیے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔

دوسرا مفہوم۔ یہ تو ہے ان آیات کا عمومی مفہوم۔ لیکن اگر ہم معانی کو حقیقت سے مجاز کی طرف منتقل کریں تو بات کچھ اور سامنے آتی ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کا یہ انداز بھی ہے کہ وہ غیر محسوس حقائق کو تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ایسے مقامات میں، ان الفاظ کو ان کے ظاہری معنوں پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ وہ جس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اسے سامنے رکھ کر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت موسیٰؑ کو اس عظیم مہم سے متعلق احکام دیدیئے گئے تو ندائے غیب نے پوچھا کہ وَمَا تِلۡکَ بِیَمِیۡنِکَ یٰمُوۡسٰی ۵ (17/20) اے موسیٰؑ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نقاط نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا کہ بار الہا: یہ احکام کیا ہیں؟ قَالَ ھِیَ عَصَایَ (18/20) یہ تو میرے لیے سفر زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں۔ اَتَوَکَّؤُا عَلَیۡھَا میں اب انہی کے آسرے سے چلوں گا۔ وَاَھُشُّ بِھَا عَلٰی غَنَمِیۡ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجھوڑوں گا اور ان کے جمود و تعطل کو حرکت و حرارت میں بدل دوں گا۔ وَلِیَ فِیۡھَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰی۔ (18/20) ان کے علاوہ اور معاملات زندگی میں بھی جو میرے سامنے آئیں گے۔ ان میں ان سے بصیرت و راہنمائی حاصل کروں گا۔ حکم ہوا کہ جاؤ اور انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ قَالَ اَلۡقِھَا یٰمُوۡسٰی (19/20)

اس وفور شوق کے بعد جب اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام وضوابط پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں۔ ایک اژدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ فَاَلْقٰھَا فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسْعٰی۔(20/20) خدا نے کہا کہ موسیٰؑ اس خیال سے مت گھبراؤ۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو (قَالَ خُذْھَا وَلَا تَخَفْ) ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی (کہ میں ان سے فلاں فلاں کام لوں گا) ہم انہیں ایسا ہی بنا دیں گے۔(سَنُعِیْدُھَا سِیْرَتَھَا الْاُوْلٰی 20/21) اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو، تو نہایت سکون و سکوت اور پوری دلجمعی سے اپنی دعوت کو نہایت روشن اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو ان مشکلات سے محفوظ و مصئون باہر نکل آئے گا۔ وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآئَ مِنْ غَیْرِ سُوْئٍ (20/22) تیری اس طرح کی کامیابی تیری دعوت کی صداقت کی نشانی ہے۔ یعنی دشمنوں کی ہلاکت منفیانہ حیثیت سے نشان اور تمہاری کامیابی مثبت حیثیت سے کامیابی لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (20/23) یہ احکام ہم تجھے اس لیے دیتے ہیں کہ تجھے دکھا دیں کہ ان کے ذریعے کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔"

یہ ہو گا ان آیات کا مفہوم اگر ان کے الفاظ کو مجاز پر محمول کر کے حقیقت پر نظر رکھی جائے۔"

(برق طور 23-25)

مزید لکھتے ہیں

"فَلَمَّآ اَتٰھَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیِٔ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَۃِ الْمُبٰرَکَۃِ مِنَ الشَّجَرَۃِ اَنْ یّٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (28/30)

سو جب (موسیٰؑ اس آگ کے شعلہ کے) قریب آیا تو وادی کے دائیں جانب سے درخت کے بابرکت مقام سے آواز آئی کہ اے موسیٰؑ میں اللہ ہوں، رب العلمین۔

سورۂ طٰہٰ میں اسے وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی (20/12) کہا گیا تھا۔ یہاں مزید وضاحت فرما دی کہ ندائے جمال وادی کے دائیں جانب، جھاڑی کے پاس سے آئی تھی۔ اس کے بعد ہے

وَاَنۡ اَلۡقِ عَصَاکَ ط فَلَمَّا رَاٰهَا تَهۡتَزُّ کَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدۡبِرًا وَّلَمۡ یُعَقِّبۡ ط یٰمُوۡسٰۤی اَقۡبِلۡ وَلَا تَخَفۡ قف اِنَّکَ مِنَ الۡاٰمِنِیۡنَ ٥

(31/28)

(آواز نے کہا کہ اے موسیٰؑ) اپنا عصا پھینک دے (موسیٰؑ نے عصا پھینک دیا اور) جب اسے ہلتا ہوا دیکھا، گویا کہ وہ سانپ ہے تو پیٹھ موڑ کر اس طرح لوٹا کہ پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ (آواز آئی) اے موسیٰؑ! آگے بڑھو، مت ڈرو، تم امن پانے والوں میں سے ہو۔

سورئہ طٰہٰ میں اسے حیّۃ کہا گیا ہے۔ یہاں کَاَنَّھَا جَانٌّ کہہ کر وضاحت فرمادی کہ وہ "گویا سانپ" تھا۔ مندرجہ بالا آیت کے الفاظ کے ظاہراً مفہوم کی رو سے ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) اگر ان الفاظ کو بطور استعارات لیا جائے تو مفہوم یہ ہو گا کہ حضرت موسیٰؑ کو مختلف احکام دے کر کہا کہ ان احکام کو جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا ہیں۔ جاکر فرعون کے سامنے پیش کرو۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اس مہم اور اس سے متعلقہ احکام پر غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ مہم نہیں ایک اژدھا ہے جسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ اس خیال سے حضرت موسیٰؑ نے اس مہم سے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوئے، یعنی اس خوف کی بناء پر اپنے دل میں اس مہم کے لئے آمادگی نہ پائی۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰؑ ڈرو نہیں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔" (برق طور 32)

ایک اور مقام دیکھئے

"بہر حال یہ تھا حضرت موسیٰؑ کا وہ مطالبہ اور یہ تھی ان کی وہ دعوت، اب دیکھئے کہ اس دعوت کا استقبال کس طرح سے ہوا۔ فرعون نے کہا تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم اللہ کی طرف سے رسول ہو اور اس مقصد کے لیے مامور کئے گئے ہو کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے آزاد کر کے لے جائو۔ لیکن اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ واقعی مامور من اللہ ہو!

قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ٥(7/106)

”فرعون نے کہا کہ اگر تو واقعی کوئی نشانی لے کر آیا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو پیش کر۔“

حضرت موسیٰؑ کے پاس نشانات موجود تھے۔

فَاَلۡقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ج ٥ صلے وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ٥(7/107-108)

”اس پر موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی ڈال دی، تو اچانک ایسا ہوا کہ ایک نمایاں اژدھا ان کے سامنے تھا، اور اپنا ہاتھ (جیب سے) باہر نکالا تو اچانک ایسا ہوا کہ دیکھنے والوں کے لئے سفید چمکیلا تھا۔“

یہ ترجمہ ان الفاظ کے ظاہراً معنوں کے اعتبار سے ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اگر ان الفاظ کو استعارۃً لیا جائے تو مفہوم یہ ہو گا کہ حضرت موسیٰؑ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جس کے سہارے انہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا اور جسے وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان قوانین سے سرکشی کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہو گا۔ یہ دلائل و براہین اپنے زورِ دروں سے اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوت و شدت واضح طور پر سامنے آتی چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ ان براہین کو سامنے لائے جن میں بتایا گیا تھا کہ قوانین خداوندی پر عمل کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار و تابناک ہو گا۔ ان دلائل کی درخشندگی و تابناکی ہر دیدۂ بینا کو نظر آتی چلی جا رہی تھی۔“ (برق طور 47-48)

پرویز صاحب نے اپنی اکثر کتب میں یہ لکھا ہے کہ ان کی فکر کا منبع قرآن کریم ہے۔ اس لئے ان کے فہم پر اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جوابی دلائل بھی قرآن کریم سے پیش کرے۔ اس سلسلہ میں وہ قرآن کریم کی اس آیت کا اکثر حوالہ دیتے ہیں۔ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ اب یہ بات واضح ہے کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا۔ اور کوئی بھی زبان قواعد و ضوابط اور اسلوب بیان کی پابند ہوتی ہے۔ اور پھر قرآن کریم کے بارے میں تو اللہ تعالی نے بیشمار جگہ پر کہہ دیا کہ یہ واضح روشن عربی زبان میں نازل کیا گیا۔ اور ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے

والا ہے۔ اس بنا پر یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ میرے پاس پرویز صاحب کی بات کا قرآنی آیات کی روشنی میں ابطال موجود ہے تو پرویز صاحب جواباً یہ کہہ دیں کہ میں تو ان آیات کا مجازی مفہوم لیتا ہوں۔ اس مقام پر قرآنی دلائل کیا کام کریں گے۔ آپ خوب سمجھ سکتے ہیں۔ (استعارہ کے بارے میں پہلے "مجازی مفہوم" کے باب میں تفصیل آچکی ہے۔) آپ لاکھ قرآنی دلائل دیتے چلے جائیں مگر آپ کو یہی جواب سننے میں ملے گا کہ میں تو ان آیات کا ظاہری مفہوم نہیں لیتا بلکہ مجازی مفہوم لیتا ہوں۔ اور ایسا مجازی مفہوم جو زبان کے کسی ضابطے کا پابند نہ ہو۔

یہاں تک پرویز صاحب نے "عصا" کا مطلب "سہارا" لیا ہے۔ آیئے مزید دیکھتے ہیں

ساحرین سے مقابلہ۔ تذکرئہ حضرت موسیٰؑ میں ساحرین قوم فرعون کے مقابلہ کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے سامنے آنے سے پہلے تمہیداً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اگر عصا اور ید بیضا کے متعلق قرآن کریم کے الفاظ کے ظاہراً معنی لیے جائیں تو یوں نظر آئے گا کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ مقابلہ قوم فرعون کے جادو گروں سے تھا۔ انہوں نے میدان میں جادو کے زور پر رسیوں کو سانپ بنا کر دوڑتا ہوا دکھایا اور حضرت موسیٰؑ کے عصا نے اژدھا بن کر ان رسیوں کو نگل لیا۔ لیکن اگر قرآنی الفاظ کو استعارات پر محمول کیا جائے تو پھر بات یوں ہوگی کہ وہ مقابلہ قوم فرعون کے مذہبی علماء سے تھا۔ انہوں نے اپنے باطل مذہب کی تائید میں دلائل پیش کئے اور اپنے زور بیان سے انہیں بڑا خوشنما بنا کر دکھا دیا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے دعاوی، خداوندی قانون اور ان کی تائید میں دلائل "منیرہ" کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ بلکہ وہ پیشوایان مذہب حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے معترف ہو کر آپ پر ایمان لے آئے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) میں ان الفاظ کے مجازی مفہوم کو ترجیح دیتا ہوں اس لئے میں نے ان آیات کا مفہوم اسی انداز سے پیش کیا ہے۔ جو حضرات ان الفاظ کے ظاہری معانی لینا چاہیں، وہ متعلقہ آیات کا ترجمہ قرآن کریم کے کسی نسخے سے دیکھ لیں۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ آپ ضرور ان کا مجازی مفہوم لیں۔" (برق طور 60-61)

حیرت ہے کہ قرآن کریم کے کسی مقام کا کوئی ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ کچھ لوگ تو اس مقام کا مجازی مفہوم لیں اور باقی لوگوں کو ظاہری معانی لینے کی اجازت دے دی جائے۔ یہاں پرویز صاحب کو اپنے دعاوی کے مطابق یہ ثابت کرنا چاہیئے تھا کہ ان آیات کا صرف مجازی مفہوم ہی لیا جا سکتا ہے۔ اور ظاہری مفہوم لینا قطعاً درست نہیں۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ پرویز صاحب کے پاس اپنے مجازی مفہوم کو ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ گرامر، لغت، محاورئہ عرب، اسلوب بیاں، سیاق و سباق، سبھی پرویز صاحب کے مجازی مفہوم کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔

نیز ساحرین سے مقابلہ کے مقام پر پرویز صاحب نے "عصا" کے معنی "دلائل" کے لیے ہیں۔ آگے دیکھئے

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ ط فَانْفَجَرَتْ مِنْہُ اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا ط قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَھُمْ ط کُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ٥ (2/60, 7/160)

اور پھر (وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا کہ اپنی جماعت کو لے کر پہاڑ کی طرف جائو۔ (تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لئے موجود ہے۔ موسیٰؑ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چٹان پر سے مٹی کرید کر ہٹائی تو اس سے ایک چھوڑ) بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی (اس وقت تم سے کہا گیا تھا اس بے آب و گیاہ بیابان میں تمہارے لئے تمام ضرورتیں مہیا ہو گئی ہیں، پس) کھائو، پیو خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھائو اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلائو (یعنی ضروریات معیشت کے لئے لڑائی جھگڑا کرو یا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو۔)" (برق طور 96-97)

اس مقام پر پرویز صاحب نے "عصا" کے معنی "جماعت" کے لیے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل اس مقام پر دیکھتے ہیں جہاں سمندر کے پھٹنے کا ذکر ہے۔

سمندر کا پھٹنا:

سمندر کیسے پھٹ گیا تھا؟ بنی اسرائیل نے پاپیادہ سمندر کو کس طرح پار کر لیا، اس سمندر کو جس میں فرعون اپنے ساز و یراق اور لاؤ لشکر سمیت غرق ہو گیا۔ فرقِ بحر کے متعلق قرآن کریم میں حسب ذیل مقامات پر ذکر آیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (2/50)

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے

"اور پھر وہ وقت یاد کرو، جب (تم مصر سے نکلے تھے اور فرعون تمہارا تعاقب کر رہا تھا) ہم نے سمندر کا پانی اس طرح الگ الگ کر دیا کہ تم بچ نکلے اور فرعون کا گروہ غرق ہو گیا اور تم (کنارہ پر کھڑے) دیکھ رہے تھے۔"

آیات (10/90 ; 7/138) میں وَجَاوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ آیا ہے، یعنی ہم بنی اسرائیل کو سمندر کے اس پار سے لے آئے۔

اور سورۂ شعرآء میں ہے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ (26/63)

اس کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے

"اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اپنے "عصا سے سمندر کو مار" پس وہ پھٹ گیا اور ہر ایک حصہ ایک بڑے تودے کی طرح تھا۔"

اس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے (بحکم وحی) سمندر کو "اپنے عصا سے مارا" اور سمندر پھٹ گیا۔ بنی اسرائیل پار اتر گئے اور جب فرعون ان کے تعاقب میں سمندر کے اندر پہنچا تو پھر پانی چڑھ آیا اور وہ (مع اپنے لشکر کے) غرق ہو گیا۔ لیکن قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں یہ آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا

گیا تھا کہ اپنی قوم کو سمندر کے ایک خشک راستہ سے نکال کر لے جائیں۔ اس سے "اِضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡبَحۡرَ" کا دوسرا مفہوم بھی سامنے آجاتا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے

وَلَقَدۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی ۵ لا اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡ فَاضۡرِبۡ لَھُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَکًا وَّلَا تَخۡشٰی ۵ (20/77)

"(اور پھر دیکھو) ہم نے موسیٰؑ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا۔ اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہو گا۔ اس طرح تمہیں نہ تو تعاقب کرنے والوں سے کوئی خدشہ ہو گا اور نہ ہی غرق ہو جانے کا ڈر۔"

یہ آیت، مفہوم پیشِ نظر کو زیادہ وضاحت سے بیان کر رہی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کو پہلے ہی بذریعہ وحی ارشاد ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر نکل جائیں اور پھر " انہیں سمندر میں خشک راستہ سے لے چلیں" (فَاضۡرِبۡ لَھُمۡ طَرِیۡقًا فِی الۡبَحۡرِ یَبَسًا) یہاں سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سمندر میں کسی مقام پر خشک راستہ نکلنے کا بھی امکان تھا۔ لیکن یہ امکان (یا اس راستہ کا سراغ) حضرت موسیٰؑ پر بذریعہ وحی منکشف ہوا تھا۔ یہ راستہ کس طرح نکل سکتا تھا؟ اس کے متعلق سورۂ دخان میں ایک اشارہ ہے جہاں فرمایا

وَاتۡرُکِ الۡبَحۡرَ رَھۡوًا اِنَّھُمۡ جُنۡدٌ مُّغۡرَقُوۡنَ ۵ (44/24)

"اور سمندر کو اترا ہوا چھوڑ دو، یہ ایک لشکر ہے جو غرق کیا جائے گا۔"

اس آیت میں رَھۡوًا کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اس کے ایک معنی ہوتے ہیں پر سکون، یعنی جب سمندر کا جوش باقی نہ رہے اور وہ پر سکون ہو جائے۔ اور دوسرے معنی ہیں وہ جگہ جہاں سے سمندر پیچھے ہٹ جائے اور اس طرح وہ حصہ خشک ہو جائے۔ یہ دونوں شکلیں سمندر میں مدوجزر کے سلسلہ میں، جزر (پانی کے پیچھے ہٹ جانے) کے وقت ہوتی ہیں۔ آیت (20/77) میں یَبَسًا کا مفہوم بھی اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی سمندر کی وہ جگہ جو خشک ہو چکی ہو۔ ان آیات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا تھا کہ تم "سمندر کے اس مقام سے جس کا تمہیں

سراغ دیا گیا ہے، ایسے وقت میں گذرو جب پانی اترا ہوا ہو۔ پھر جب تمہارے تعاقب میں لشکر فرعون آئے گا تو اس وقت پانی کے چڑھائو کا وقت ہو گا۔"۔۔۔ان تصریحات سے قرآن کریم کے ان اشارات کی طرف سمجھ کی راہ نکلتی ہے جو سورۂ طٰہٰ اور سورۂ دخان کے مندرجہ صدر آیات میں ملتے ہیں اور انہی آیات کے مفہوم کی وضاحت کے لئے ہم نے یہ کچھ لکھا ہے۔ ان تصریحات کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ کا مطلب کیا ہے؟ سو عربی زبان میں عصا کے معنی لاٹھی ہی کے نہیں بلکہ جماعت کے بھی ہیں۔ عصا (لاٹھی) کو عصا اس لیے کہتے ہیں کہ اسے انگلیاں مجتمع کر کے مضبوطی سے پکڑا جاتا ہے اور ضَرَبَ کے معنی چلنا یا سفر کرنا بھی آتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی جماعت کو لے کر سمندر کی طرف جائو اور جس مقام کا تمہیں سراغ دیا جاتا ہے۔ اس سے اس وقت جب سمندر اتر چکا ہو، بنی اسرائیل کو لے کر خشکی کے دوسرے کنارے پہنچ جائو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب فرعون کا لشکر ان کے تعاقب میں اس کنارے پر پہنچا ہے تو وہ دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ تھے وہ "طَوْدِ الْعَظِيْم" جن کا ذکر (26/63) میں آیا ہے۔"

(برق طور 88-91) سٹوڈنٹ ایڈیشن 1993۔

اس طرح پرویز صاحب نے عصا کا مطلب "سہارا"، "دلائل" اور "جماعت" کے لیے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم نے عصا کو صرف اور صرف "لاٹھی" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ بلکہ عصا کی خصوصیات بھی واضح کر دی ہیں۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝ (20/18)

عرض کیا یہ میری لاٹھی ہے چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں، اسی سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں، میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

سہارا کے لیے یہاں " اَتَوَکَّؤُا " کا لفظ موجود ہے، جبکہ دلائل اور جماعت اور دیگر کسی بھی معنی کے لیے سیاق و سباق اجازت نہیں دیتے۔ یعنی ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ پوچھیں کہ "اے موسیٰؑ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے" تو جواب دیا جائے۔ "یہ میری جماعت ہے یا یہ میرے دلائل ہیں۔"

اس کے بعد پرویز صاحب کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا ساحروں کے ساتھ مقابلہ نہیں تھا بلکہ مذہبی علماء کے ساتھ مقابلہ تھا جس میں دونوں اطراف سے دلائل و براہین دیئے گئے۔ آیئے اس بارے میں قرآن کریم کے چند مقامات پر نظر ڈالتے ہیں۔

☆وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ۝ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ۭ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ (طٰہٰ 20/56-73)

"اور یقیناً دکھلائیں ہم نے اسے اپنی نشانیاں ساری لیکن اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ کہنے لگا! کیا آیا ہے تو ہمارے پاس اس لیے کہ نکال دے تو ہمیں ہماری سرزمین سے اپنے جادو کے زور سے اے موسیٰؑ۔ سو لائیں گے ہم بھی

تمہارے مقابلہ کے لیے جادو اسی قسم کا لہٰذا متعین کر لو ہمارے اور اپنے درمیان ایک خاص دن کہ نہ خلاف ورزی کریں اس کی ہم اور نہ تم ایک کھلے میدان میں۔ موسیٰؑ نے کہا! تم سے طے شدہ وقت جشن کا دن ہے اور اکٹھے کئے جائیں لوگ دن چڑھے۔ سو لوٹ گیا فرعون اور جمع کرنے لگا اپنی تدابیر پھر (مقابلہ کے لئے) آموجود ہوا۔ کہا ان سے موسیٰؑ نے اے شامت کے مارو! نہ گھڑو تم اللہ کے بارے میں جھوٹ ورنہ وہ ستیاناس کر دے گا تمہارا ایک سخت عذاب سے اور یقیناً نامراد ہوا وہ جس نے جھوٹ گھڑا۔ یہ سن کر وہ جھگڑنے لگے اپنے معاملہ میں آپس میں اور چپکے چپکے کرنے لگے مشورے۔ کہنے لگے یقیناً یہ دونوں ضرور جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ نکال دیں تم کو تمہاری سرزمین سے اپنے جادو کے زور سے اور مٹا دیں تمہارے طریق زندگی کو جو مثالی ہے۔ لہٰذا اکٹھی کر لو اپنی تمام تدابیر پھر آجاؤ صف باندھ کر۔ حقیقت یہ کہ فلاح اس کی ہو گی آج جو جیت گیا۔ انہوں نے کہا اے موسیٰؑ! یا تو تم پھینکو یا ہم ہوں پہلے پھینکنے والے۔ موسیٰؑ نے کہا! نہیں تم ہی پھینکو تو یکایک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں محسوس ہونے لگیں موسیٰؑ کو ان کے جادو کے اثر سے گویا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔ پس محسوس کیا اپنے دل میں ایک طرح کا خوف موسیٰؑ نے۔ ہم نے کہا نہ ڈرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔ اور پھینکو اس کو جو تمہارے ہاتھ میں ہے، وہ نگل جائے گا اس کو جو انہوں نے بنایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے وہ فریب ہے جادوگر کا۔ اور نہیں کامیاب ہو سکتا جادوگر خواہ جس شان سے آئے وہ۔ سو گرا دیے گئے سارے جادوگر سجدے میں اور پکار اٹھے! ایمان لائے ہم رب ہارونؑ و موسیٰؑ پر۔ فرعون نے کہا ایمان لے آئے تم اس پر قبل اس کے کہ میں اجازت دوں تمہیں اس کی؟ یقیناً وہی تمہارا گرو ہے جس نے سکھائی ہے تمہیں جادوگری، سو ضرور کٹوائے دیتا ہوں میں تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف سمتوں سے اور ضرور سولی چڑھواتا ہوں تم کو کھجور کے تنوں پر اور خوب جان لو گے تم کہ ہم دونوں میں کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔ انہوں نے کہا! ہرگز نہیں ترجیح دے سکتے ہم تجھے اس پر جو آگئی ہیں ہمارے سامنے روشن نشانیاں اور اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے سو کر لے جو تو کر سکتا ہے۔ اور تو تو بس فیصلہ کر سکتا ہے اس دنیاوی زندگی کا۔ یقیناً ہم تو ایمان لے آئے اپنے رب پر تاکہ وہ معاف کر دے ہماری خطائیں اور یہ جرم جس پر مجبور کیا تھا تو نے ہمیں یعنی جادوگری اور اللہ ہی ہے سب سے اچھا اور ہمیشہ رہنے والا۔"

سورۂ شعراء میں یہ واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

☆وَاِذْ نَادٰی رَبُّکَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۵لا قَوْمَ فِرْعَوْنَ طاَلَا یَتَّقُوْنَ ۵ قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ۵ط وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ۵ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ج۵ صلے قَالَ کَلَّا ج فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۵ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵لا اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۵ط قَالَ اَلَمْ نُرَبِّکَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّلَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِکَ سِنِیْنَ ۵لا وَفَعَلْتَ فَعْلَتَکَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ۵ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ۵ط فَفَرَرْتُ مِنْکُمْ لَمَّا خِفْتُکُمْ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُکْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۵ وَتِلْکَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۵ط قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۵ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا طاِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ۵ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۵ قَالَ رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ ۵ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۵ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا طاِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۵ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ۵ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُکَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ۵ج قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۵ فَاَلْقٰی عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ج۵ صلے وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ۵ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ۵لا یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِهٖ ق صلے فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۵ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۵لا یَاْتُوْکَ بِکُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ۵لا فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۵لا وَّقِیْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۵لا لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ کَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ۵ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ کُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِیْنَ ۵ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّکُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۵ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓی اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۵ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِیَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ۵ فَاَلْقٰی مُوْسٰی عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ ج۵ صلے فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ۵لا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵لا رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ ۵ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَکُمْ ج اِنَّهٗ لَکَبِیْرُکُمُ الَّذِیْ عَلَّمَکُمُ السِّحْرَ ج فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۵ط لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۵ج قَالُوْا لَا ضَیْرَ ز اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۵ج اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَآ اَنْ کُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۵ط وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۵ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۵ج اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ۵لا وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ۵لا وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ۵ط فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ

جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ۵ لا وَّ کُنُوۡزٍ وَّ مَقَامٍ کَرِیۡمٍ ۵ لا کَذٰلِکَ ط وَ اَوۡرَثۡنٰهَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۵ ط فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِیۡنَ ۵ فَلَمَّا تَرَآءَ الۡجَمۡعٰنِ قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤی اِنَّا لَمُدۡرَکُوۡنَ ۵ ج قَالَ کَلَّا ج اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ ۵ فَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡبَحۡرَ ط فَانۡفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرۡقٍ کَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ ۵ ج وَ اَزۡلَفۡنَا ثَمَّ الۡاٰخَرِیۡنَ ۵ ج وَ اَنۡجَیۡنَا مُوۡسٰی وَ مَنۡ مَّعَهٗۤ اَجۡمَعِیۡنَ ۵ ج ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ۵ ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ط وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۵ (الشعراء26/10-67)

"اور جب پکارا تھا تیرے رب نے موسیٰؑ کو کہ جائو ظالم لوگوں کی طرف۔ (یعنی) قوم فرعون کے پاس "کیا وہ ڈریں گے نہیں؟"۔ موسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے مالک! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔ اور گھٹتا ہے میرا سینہ اور نہیں چلتی ہے میری زبان، سو رسالت بھیج دے ہارونؑ کی طرف۔ اور ان کا میرے اوپر ایک جرم کا الزام بھی ہے لہذا میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ ارشاد ہوا ہرگز ایسا نہیں ہو گا۔ اچھا لے جائو تم دونوں ہماری نشانیاں، یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں اور سب کچھ سنتے رہیں گے۔ اور جائو تم دونوں فرعون کے پاس اور کہنا کہ ہم رسول ہیں رب العالمین کے۔ تاکہ بھیج دے تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ وہ کہنے لگا کہ کیا نہیں پالا تھا ہم نے تجھے اپنے ہاں جبکہ تو ایک چھوٹا سا بچہ تھا؟ اور رہا تھا تو ہمارے ہاں اپنی عمر کے کئی سال۔ اور کی تھی تو نے وہ حرکت جو کی تھی تو نے اور تو ہے بڑا ناشکرا۔ موسیٰؑ نے کہا کہ کی تھی میں نے وہ حرکت اس وقت جبکہ تھا میں نادان۔ پھر میں بھاگ گیا تھا تمہارے پاس سے جب مجھے ڈر ہوا تھا تم سے۔ پھر عطا کی مجھے میرے رب نے حکمت اور شامل فرما دیا مجھے رسولوں میں۔ اور وہ احسان جو جتا رہا ہے تو مجھ پر اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے غلام بنا رکھا ہے بنی اسرائیل کو۔ فرعون نے کہا! کیا ہے یہ رب العالمین؟ فرمایا وہی جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں اگر ہو تم یقین لانے والے۔ کہا فرعون نے ان لوگوں سے جو اس کے ارد گرد تھے، کیا نہیں سنا تم نے (یہ کیا کہہ رہا ہے)؟۔ موسیٰؑ نے کہا وہی جو رب ہے تمہارا بھی اور رب ہے تمہارے آبائو اجداد کا بھی جو پہلے گزر چکے ہیں۔ فرعون نے کہا، (حاضرین سے) بے شک تمہارا یہ رسول جو بھیجا گیا ہے تمہاری طرف، ضرور دیوانہ ہے۔ موسیٰؑ نے کہا، وہی ہے جو رب ہے مشرق و مغرب کا اور ان سب کا جو ان کے

درمیان ہیں۔ اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔ فرعون نے کہا اگر مانو گے تم کوئی معبود میرے سوا تو (یاد رکھو) ڈال دوں گا میں تمہیں قیدیوں کے ساتھ (لڑنے کے لیے)۔ موسیٰؑ نے کہا کیا پھر بھی اگر لے آئوں میں تمہارے سامنے کوئی واضح چیز (معجزہ)۔ فرعون نے کہا اچھا پیش کر وہ معجزہ، اگر ہو تم سچے۔ سو پھینکا موسیٰؑ نے اپنا عصا تو یکایک بن گیا وہ اژدھا سچ مچ کا۔ اور کھینچا اپنا ہاتھ (بغل سے) تو اچانک وہ چمک رہا تھا دیکھنے والوں کے سامنے۔ کہا فرعون نے سرداروں سے جو اس کے ارد گرد تھے کہ یقینا یہ ایک جادوگر ہے، بڑا ماہر۔ جو چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہاری سرزمین سے اپنے جادو (کے زور) سے۔ تو بتائو اب کیا مشورہ دیتے ہو تم۔ انہوں نے کہا انتظار میں رکھو اس کو اور اس کے بھائی کو اور بھیج دو شہر میں ہرکارے۔ جو لے آئیں گے تمہارے پاس ہر قسم کے بڑے بڑے ماہر جادوگر۔ پھر اکٹھے کئے گئے جادوگر ایک خاص دن، وقت مقررہ پر۔ اور لوگوں میں منادی کر دی گئی کہ لوگو! اکٹھے ہو جائو۔ تا کہ ہم ساتھ دیں جادوگروں کا اگر رہیں وہ غالب۔ پھر جب آئے جادوگر تو انہوں نے کہا فرعون سے کیا واقعی ہمیں کوئی بڑا انعام ملے گا، اگر رہے ہم غالب۔ فرعون نے کہا! ہاں اور یقینا تم اس وقت شامل ہو جائو گے مقربین میں۔ کہا ان سے موسیٰؑ نے کہ پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے۔ سو پھینکیں انہوں نے اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں اور کہنے لگے! فرعون کے اقبال سے یقینا ہم ہی غالب رہیں گے۔ پھر پھینکا موسیٰؑ نے اپنا عصا تو یکایک وہ ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا ان کے جھوٹے شعبدوں کو۔ چنانچہ گر پڑے بے اختیار ہو کر جادوگر سجدے میں۔ اور بول اٹھے ایمان لائے ہم رب العالمین پر۔ جو رب ہے موسیٰؑ اور ہارونؑ کا۔ فرعون نے کہا، کیا مان لی تم نے بات موسیٰؑ کی پہلے اس سے کہ اجازت دوں میں تمہیں۔ یقینا یہی تمہارا وہ بڑا ہے جس نے سکھایا ہے تمہیں جادو۔ اچھا تو عنقریب پتہ چل جائے گا تمہیں۔ میں ضرور کٹوائوں گا تمہارے ہاتھ اور تمہارے پائوں مخالف سمتوں سے اور ضرور سولی پر چڑھا دوں گا تم سب کو۔ انہوں نے کہا نہیں کچھ پرواہ، بے شک ہم سب اپنے رب کے حضور لوٹنے والے ہیں۔ بے شک ہم توقع رکھتے ہیں کہ بخش دے گا ہماری خاطر ہمارا مالک ہماری خطائیں اس بنا پر کہ سب سے پہلے ہم ہی ایمان لانے والے ہیں۔ اور وحی بھیجی ہم نے موسیٰؑ کی طرف کہ نکل پڑو راتوں رات لے کر میرے بندوں کو یقینا تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ پھر بھیجے فرعون نے شہر میں ہرکارے۔ (اور کہلا بھیجا) دیکھو! یہ لوگ ہیں

ایک حقیر ساٹولہ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں سخت غصہ دلایا ہے۔ اور یقینا ہم ایک بڑی جماعت ہیں ہمیں چوکنا رہنا چاہیئے۔ اور اس طرح ہم نے نکال دیا انہیں باغوں سے اور چشموں سے۔ اور خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے۔ یہ تو ہوا ان کے ساتھ۔ اور وارث بنادیا ہم نے ان سب کا بنی اسرائیل کو۔ سو پیچھے چل پڑے وہ بنی اسرائیل کے صبح کے وقت۔ پھر جب آمنا سامنا ہوا دونوں گروہوں کا تو کہنے لگے موسیٰؑ کے ساتھی یقینا ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰؑ نے کہا ہرگز نہیں۔ بے شک میرے ساتھ ہے میرا رب وہ ضرور میرے لیے راہ نکالے گا۔ سو وحی بھیجی ہم نے موسیٰؑ کی طرف کہ مارو اپنا عصا سمندر پر۔ تو وہ پھٹ گیا اور ہو گیا ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی مانند۔ اور قریب لے آئے ہم اس جگہ دوسرے گروہ کو بھی۔ اور بچالیا ہم نے موسیٰؑ کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے، سب کو۔ پھر غرق کر دیا ہم نے دوسرے گروہ کو۔ بیشک اس واقعہ میں ایک نشانی ہے۔ مگر نہیں ہیں اکثر لوگ یقین کرنے والے۔ اور یقینا تیرا رب ہی ہے زبردست اور رحم فرمانے والا۔"

☆فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًاج قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۵ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۵لا وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ط فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ یٰمُوْسٰۤی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ۵ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۵ (القصص 28/29-32)

"غرض جب پوری کر لی موسیٰؑ نے مدت اور لے کر چلے اپنے گھر والوں کو تو دیکھی انہوں نے طور کی جانب آگ تو کہا اپنے گھر والوں سے ذرا ٹھہرو میں نے دیکھی ہے آگ، شاید کہ لے آئوں میں تمہارے لیے وہاں سے کوئی خبر یا کوئی انگارہ آگ کا (لے آئوں) تا کہ تم تاپ سکو۔ پھر جب پہنچے موسیٰؑ وہاں تو پکارا گیا وادی کے دائیں کنارے پر اس مبارک خطہ میں ایک درخت سے۔ کہ اے موسیٰؑ! بے شک میں ہی ہوں اللہ جو رب ہے جہانوں کا۔ اور یہ بھی (ارشاد ہوا) کہ پھینکو اپنی لاٹھی سو جب دیکھا اسے لہراتا ہوا گویا کہ وہ سانپ ہے تو بھاگ اٹھے موسیٰؑ پیٹھ موڑ

کر اور مڑ کر بھی نہ دیکھا (ارشاد ہوا) اے موسیٰؑ! آگے بڑھو اور نہ ڈرو یقیناً تم محفوظ ہو۔ ڈالو ہاتھ اپنے گریبان میں ، نکلے گا وہ چمکتا ہوا بغیر کسی تکلیف کے اور بھینچ لو اپنا بازو خوف سے بچنے کے لیے۔ پس یہ دو نشانیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے۔ فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے۔ یقیناً وہ لوگ ہیں بڑے نا فرمان۔"

درج بالا چند آیات پر غور کیا جائے تو حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آیات کا ترجمہ اور سیاق و سباق یہی ظاہر کرتا ہے کہ موسیٰؑ کی لاٹھی سانپ کا روپ دھار گئی تھی جس سے موسیٰؑ بھی ڈر گئے اور بھاگ گئے۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ نے پکار کر کہا کہ مت ڈرو۔ ہم اس کو ویسی ہی حالت پر لا دیں گے۔ علاوہ ازیں جو خصوصیات لاٹھی کی بیان کی گئی ہیں وہ "عصا" کا کوئی اور مطلب نکالنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ یعنی "عصا" کا مطلب جماعت، سہارا اور دلائل لیا ہی نہیں جاسکتا۔ اور یہ مقام پرویز صاحب کے لیے بھی مشکل کا باعث تھا اسی لیے انہوں نے شروع سے ہی کہہ دیا کہ میں تو ان مقامات کا مجازی مفہوم لیتا ہوں۔ اور وہ مجازی مفہوم بھی خود پرویز صاحب کا وضع کردہ ہے ۔ اس کے لیے بھی تاریخ کی کوئی سند یا حوالہ موجود نہیں ہے۔ حالانکہ تصوف کے باطنی معنیٰ کی تعبیر کو پرویز صاحب ایک بہت بڑا افساد قرار دیتے ہیں کیونکہ باطنی معنیٰ بالواسطہ اللہ کی طرف سے "صوفی" کو ملتا ہے۔ جس کی بھی کوئی سند موجود نہیں ہوتی۔ اسی انداز سے پرویز صاحب نے مجازی مفہوم لے لیا ہے۔

دوسری بات پرویز صاحب نے یہ کہی کہ موسیٰؑ کا مقابلہ قوم فرعون کے مذہبی علماء سے تھا۔ لیکن قرآن کریم نے تو یہی بتایا کہ وہ مقابلہ جادوگروں (ساحروں) سے تھا۔ یہاں پرویز صاحب نے اس چیز کی وضاحت نہیں کی کہ "ساحر" سے مذہبی علماء کیسے مراد مانا جائے۔ حالانکہ "علماء" کا لفظ خود عربی کا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو ویسے ہی " علماء" پکار کر بات کو صاف کر دیتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ پھر پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ "قوم فرعون کے مذہبی علماء نے اپنے باطل مذہب کی تائید میں دلائل پیش کئے" لیکن قرآن کہتا ہے فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ "سو

انہوں نے پھینکیں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں"۔ اب اگر مقابلہ مذہبی علماء سے تھا اور دلائل کا تھا تو پھر رسیوں اور لاٹھیوں کا کیا کام؟

اس کے بعد پرویز صاحب کہتے ہیں کہ سمندر کا پھٹنا حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ مدوجزر کی وجہ سے ہے اور جب موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے خشک راستہ سے سمندر پار کیا تو پانی اترا ہوا تھا۔ لیکن جب فرعون اور اس کی قوم نے سمندر پار کرنا چاہا تو پانی اوپر چڑھ آیا۔ جس سے فرعون اپنی قوم سمیت غرق ہو گیا۔ پرویز صاحب کی توقع حیرت انگیز طور پر درست رہی کہ ان کے متبعین میں سے کسی نے کونسا چیک کرنا ہے کہ مدّوجزر کیا ہوتا ہے؟

اب یہ تو ایک سائنسی حقیقت ہے کہ سمندر کی سطح کا (Rise & Fall) مدّوجزر کہلاتا ہے۔ جو کہ چاند کی کشش کی وجہ سے ہے۔ جن دنوں میں سمندر کا پانی کافی اوپر تک چڑھا ہوتا ہے اسے مد (Spring Tide) کہتے ہیں۔ اور جن دنوں میں سمندر کا پانی نیچے تک اترا ہوتا ہے اس کو جزر (Neap Tide) کہتے ہیں۔ پانی کا چڑھائو (New Moon) اور (Full Moon) کے دنوں میں ہوتا ہے۔ اور پانی کا اترائو چاند کے (First Quarter) اور (Third Quarter) میں ہوتا ہے۔ اس طرح سے پانی کے اتار اور چڑھائو میں سات دن کا وقفہ ہوتا ہے۔ اور اس کا اثر سمندر کے کنارے پر بالکل آہستگی سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ صبح مد ہے تو شام کو جزر ہو جائے گا۔ قرآن میں واضح طور پر سمندر کے پھٹنے کا ذکر ہے۔ نہ کہ کسی مدوجزر کا۔

اور جس طرح یہ واقعہ سورئہ الشعراء میں بیان ہوا ہے۔ اس کے مطابق سمندر کے کنارے پر دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ اور وہ قریب پہنچ گئے تھے کہ ایک گروہ (قوم موسیٰؑ) سمندر کو پار کر گئی اور دوسرا گروہ (قوم فرعون) غرق ہو گئی۔

اور سمندر کے دونوں کنارے بڑے پہاڑ کے ٹکڑوں کی مانند ہو گئے تھے۔ اس بارے پرویز صاحب نے کوئی توجیہ نہیں دی۔

”سو پیچھے چل پڑے وہ بنی اسرائیل کے صبح کے وقت۔ پھر جب آمنا سامنا ہوا دونوں گروہوں کا تو کہنے لگے موسیٰؑ کے ساتھی یقیناً ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰؑ نے کہا ہرگز نہیں۔ بے شک میرے ساتھ ہے میرا رب۔ وہ ضرور میرے لیے راہ نکالے گا۔ سو وحی بھیجی ہم نے موسیٰؑ کی طرف کہ مارو اپنا عصا سمندر پر۔ تو وہ پھٹ گیا اور ہو گیا ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی مانند۔ اور قریب لے آئے ہم اس جگہ دوسرے گروہ کو بھی۔ اور بچا لیا ہم نے موسیٰؑ کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے، سب کو۔ پھر غرق کر دیا ہم نے دوسرے گروہ کو۔ بے شک اس واقعہ میں ایک نشانی ہے مگر نہیں ہیں اکثر لوگ یقین کرنے والے۔“

تصریحات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم جو چیز جس انداز سے بیان کرتا ہے اس کو من و عن ہی تسلیم کرنا چاہیے۔ نہ کہ خارج از قرآن معیارات کو سامنے رکھ کر اس کی تشریح کرنی چاہیے۔ معجزہ ایک حقیقت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے قوموں کو ڈرانے کے لیے ایسی نشانیاں اپنے پیغمبروں کو دیں۔ جو ماورائے عقل تھیں تاکہ لوگ سیدھے راستے پر چلیں۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم کے چند اور مقامات دیکھتے ہیں۔

☆وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ مبَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ۝ (101/17)

” اور یقیناً عطا کئے تھے ہم نے موسیٰؑ کو نو معجزات پس پوچھ لو بنی اسرائیل سے جب آئے موسیٰؑ ان کے ہاں تو کہا تھا ان سے فرعون نے بے شک میں سمجھتا ہوں تمہیں اے موسیٰؑ! سحر زدہ شخص۔“

☆فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰیطاوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُج قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظَاهَرَا قف وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝ (48/28)

”پھر جب آیا ان کے پاس حق (قرآن) ہماری طرف سے تو کہنے لگے: کیوں نہیں دیا گیا اسے بھی وہی کچھ جو دیا گیا موسیٰؑ کو۔ تو کیا انہوں نے انکار نہیں کیا تھا اس کا جو دیا گیا تھا موسیٰؑ کو پہلے؟ انہوں نے کہا یہ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کہتے تھے ہم تو سب کا انکار کرتے ہیں۔“

☆وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ط فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ج وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ط وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۵ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۵ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۵ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۵ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۵ (29/47-51)

”اور اے نبیؐ اسی طرح نازل کی ہے ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب۔ سو وہ لوگ جنہیں دی تھی ہم نے کتاب وہ تو ایمان لاتے ہیں اس پر اور ان (اہل مکہ) میں سے بھی کچھ ایسے ہیں جو ایمان لا رہے ہیں اس قرآن پر اور نہیں انکار کرتے ہماری آیات کا، مگر کافر۔ اور نہیں پڑھتے تھے تم اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتے تھے تم اسے اپنے ہاتھ سے، اگر ایسا ہوتا تو ضرور شک میں پڑ سکتے تھے یہ باطل پرست لوگ۔ دراصل قرآن، آیات بینات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنہیں دیا گیا ہے علم اور نہیں انکار کرتے ہماری آیات کا مگر ظالم۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ نازل کی گئیں اس پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے۔ کافی نہیں ہے ان کے لیے کہ ہم نے نازل کی ہے تم پر یہ کتاب جو پڑھ کر سنائی جاتی ہے انہیں، بے شک اس میں بڑی رحمت ہے اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“

درج بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ معجزہ بطور ایک حقیقت کے موجود رہا ہے۔ موسیٰؑ کو نو معجزات عطا کئے گئے اور پھر اہل مکہ نے بھی یہی مطالبہ کیا کہ حضورؐ کو ویسا ہی معجزہ کیوں نہ دیا گیا جیسا حضرت موسیٰؑ کو عطا کیا گیا۔ اور آخری آیت میں لفظ ”آیت“ کو دو معنوں میں استعمال کر کے بات واضح کر دی کہ آپؐ پر آیات اتاری گئیں تو اہل کتاب اور مکہ والے لوگوں میں سے کچھ ان آیات پر ایمان لائے۔ پھر آگے جا کے ان کا یہ مطالبہ کہ

حضورؐ پر کوئی آیت (معجزہ) کیوں نہ اتارا گیا؟ تو حضورؐ کی زبان سے یہ کہلوادیا گیا کہ "اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ" کہ معجزے اللہ کے پاس موجود ہیں۔

قتل ابناء۔ بنی اسرائیل کے واقعہ میں قتل ابناء کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے اس کا بھی مفہوم بدل دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ فرعون حقیقی طور پر بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل نہیں کرتا تھا بلکہ ان کو ذلیل و خوار کرتا تھا۔ آیئے اس سلسلہ میں پرویز صاحب کا نقطہ نظر دیکھتے ہیں۔

"وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ ط وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ۵ (49/2)

اور (اپنی تاریخ حیات کا) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہیں خاندان فرعون (کی غلامی) سے جنہوں نے تمہیں نہایت سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا نجات دی تھی۔ وہ تمہارے ابناء ذبح کرتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔ اور فی الحقیقت اس صورتحال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے بڑی ہی آزمائش تھی۔

لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد سچ مچ کا ذبح کرنا نہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر اس حکم پر ایک نسل تک بھی عمل درآمد ہوتا تو مصر سے بنی اسرائیل کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ لیکن وہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی اتنی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نیز ان کے زمانے میں ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بھی موجود تھے جو ان سے بڑے تھے۔ اگر لڑکے ذبح ہو جایا کرتے تو ہارونؑ کس طرح زندہ بچ جاتے؟ پھر، قرآن میں دوسرے مقام (50/40) پر ہے کہ فرعون نے یہ حکم دیا تھا کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائیں ان کے لڑکوں کو ذبح کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ابناء کا حکم حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت موجود نہیں تھا۔ ذبح اور قتل سے مراد ذلیل و خوار کرنا بھی ہے۔ "ابنائے قوم" سے مراد ہیں بنی اسرائیل کے وہ لوگ جن میں جوہر مردانگی نظر آتا تھا اور "نساء قوم" سے مقصود ہیں وہ لوگ جو ان جوہروں سے عاری تھے قرآن میں ہے

(4/28) کہ فرعون (ہر مستبد اور فریب کار حاکم کی طرح) اس قوم میں پارٹیاں پیدا کر تا رہتا تھا۔ ایک پارٹی کو معزز و مکرم بنا کر آگے بڑھاتا اور دوسری پارٹی کو ذلیل و خوار کر کے پیچھے ہٹاتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑاتا بھڑاتا رہتا۔ وہ بنی اسرائیل (قوم محکوم) کے ان افراد کو آگے بڑھاتا جو نہایت کمزور خصائص مردانگی سے عاری ہوتے اور ان کے فرزندان جلیل کو ذلیل کرتا جن میں اسے جوہر مردانگی نظر آتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مقصد کے پیش نظر بنی اسرائیل کے اونچے خاندانوں کے لڑکوں کو بچپن ہی سے ایسی حالت میں رکھتا ہو کہ وہ صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رہیں۔ اور اس طرح بڑے ہو کر ذلیل و خوار ہو جائیں۔ (برق طور 21/22)

وہ بچے کو شاہی محلات میں لے آئے، معلوم ہوتا ہے کہ وہاں انہوں نے (بچے کے خط و خال سے) اندازہ لگا لیا کہ وہ اسرائیلیوں کا بچہ ہے۔ اس لئے اسے نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا گیا۔ لیکن بچوں کے معاملہ میں فطرت نسائیت کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ فرعون کی بیوی نے جب بچے کو دیکھا تو اپنے خاوند سے کہا کہ اسے مار نہ دیا جائے یا ذلیل و حقیر سمجھ کر پھینک نہ دیا جائے۔ اسے میں اپنی گود میں لے لینا چاہتی ہوں (غالباً ان کے ہاں اس وقت تک کوئی اولاد نہیں تھی) وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ ق صلے عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۵ (9/28)

”اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ (یہ بچہ) میرے لیے اور تیرے لیے آنکھ کی راحت (ہو سکتا) ہے اسے مار نہ ڈالو (یا ذلیل نہ کرو) شاید وہ ہمارے لیے نفع کا موجب ہو یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے (کہ مشیت کے پروگرام کیا ہیں)۔“ (برق طور 24)

حیرت ہے کہ دودھ پیتے بچے کو ذلیل و حقیر کرنا کیسا ہے؟ یہاں سے تو صاف ظاہر ہے کہ فرعون بچوں کو قتل کر دیا کرتا تھا۔ اور یہ بھی واضح نہیں کہ قتل کے معانی تذلیل و تحقیر کیسے اخذ کئے گئے؟ پھر قبطی کے معاملے میں پرویز صاحب یہ یقین رکھتے ہیں کہ موسیٰؑ کے مکا مارنے سے وہ قتل (مر گیا) ہو گیا تھا۔ (برق طور۔ 29)

پھر اگر، یہاں قتل سے مراد واقعی مار ڈالنا نہیں تو پھر موسیٰؑ کی والدہ نے آپ کو دریا میں کیوں ڈال دیا۔ اور پرویز صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ یہ حکم اس وقت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت موجود نہیں تھا۔

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡکِ وَ جَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۷﴾ (7/28)

"چنانچہ ہم نے وحی بھیجی موسیٰؑ کی ماں کو کہ دودھ پلاتی رہ اسے پھر جب خطرہ ہو تجھے اس کی جان کا تو ڈال دینا اسے دریا میں اور نہ خوف کھانا اور نہ غم کھانا، یقیناً ہم واپس لے آئیں گے اسے تیرے پاس، اور بنائیں گے اسے رسول۔ "

حضرت ابراہیمؑ:

آگ کا ٹھنڈی ہو جانا

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے کہ انہیں مخالفین نے آگ میں ڈال دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ٹھنڈی ہو جائے اور سلامتی کا موجب بن جائے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ سے بچالیا۔ مگر حسب معمول پرویز صاحب نے اس کی بھی عقلی توجیہ کی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

"انہوں نے ابراہیمؑ کے خلاف اس منصوبے کا ارادہ کیا تھا۔ سچ مچ انہیں آگ کی بھٹی میں نہیں ڈال دیا تھا۔ وہ ابھی اپنی تدبیروں میں ہی لگے ہوئے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اس مقام سے ہجرت فرما کر دوسری جگہ تشریف لے گئے۔" (جوئے نور۔122)

قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

وَاِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰہِیۡمَ ۵م اِذۡ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ۵ اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡہِ وَ قَوۡمِہٖ مَا ذَا تَعۡبُدُوۡنَ ۵ج اَئِفۡکًا اٰلِـہَۃً دُوۡنَ اللّٰہِ تُرِیۡدُوۡنَ ۵ فَمَا ظَنُّکُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۵ فَنَظَرَ نَظۡرَۃً فِی النُّجُوۡمِ ۵لا فَقَالَ اِنِّیۡ سَقِیۡمٌ ۵ فَتَوَلَّوۡا عَنۡہُ مُدۡبِرِیۡنَ ۵ فَرَاغَ اِلٰۤی اٰلِـہَتِہِمۡ فَقَالَ اَلَا تَاۡکُلُوۡنَ ۵ج مَا لَکُمۡ لَا تَنۡطِقُوۡنَ ۵ فَرَاغَ عَلَیۡہِمۡ ضَرۡبًۢا بِالۡیَمِیۡنِ ۵ فَاَقۡبَلُوۡۤا اِلَیۡہِ یَزِفُّوۡنَ ۵ قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ۵لا وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۵ قَالُوا ابۡنُوۡا لَہٗ بُنۡیَانًا فَاَلۡقُوۡہُ فِی الۡجَحِیۡمِ ۵ فَاَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَسۡفَلِیۡنَ ۵ وَ قَالَ اِنِّیۡ ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ ۵ (الصفت 37/83-99)

اور بے شک اسی کے طریقے پر چلنے والوں میں تھا ابراہیمؑ۔ جب آیا وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر۔ جب کہا تھا اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کیا ہیں یہ جن کی تم عبادت کرتے ہو؟ کیا خود ساختہ خدائوں کے۔۔ اللہ کو چھوڑ کر، طالب ہو تم؟ سو کیا گمان ہے تمہارا رب العالمین کے بارے میں؟ پھر ڈالی اس نے ایک نگاہ ستاروں پر۔ اور کہا میری تو طبیعت خراب ہے۔ سو واپس چلے گئے وہ اسے چھوڑ کر الٹے پائوں۔ پھر چپکے سے جا گھسے ابراہیمؑ ان کے معبودوں کے پاس اور کہا تم کھاتے کیوں نہیں؟ تمہیں کیا ہوا ہے تم بولتے کیوں نہیں؟ پھر پل پڑے ان پر مارتے ہوئے داہنے ہاتھ سے۔ پھر آئے وہ لوگ ابراہیمؑ کے پاس دوڑتے ہوئے۔ ابراہیمؑ نے کہا کیا پوجتے ہو تم انہیں جنہیں تراشتے ہو تم خود ہی؟ حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے تم کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جو تم بناتے ہو۔ انہوں نے کہا تیار کرو ابراہیمؑ کے لیے ایک الائو اور ڈال دو اسے دہکتی آگ میں۔ سو ارادہ کیا انہوں نے اس کے ساتھ چال چلنے کا سو ہم نے انہیں نیچا دکھا دیا اور (آگ سے نکلنے کے بعد) ابراہیمؑ نے کہا میں جا رہا ہوں اپنے رب کی طرف، وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا۔"

☆فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا اقۡتُلُوۡہُ اَوۡ حَرِّقُوۡہُ فَاَنۡجٰىہُ اللّٰہُ مِنَ النَّارِ ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ۵(29/24)

”سو نہ تھا جواب ان کی قوم کا مگر یہ کہ کہا انہوں نے قتل کر دو ابراہیمؑ کو یا جلا دو اسے۔ سو بچا لیا اسے اللہ نے آگ سے۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔“

☆وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ ۵ج اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۵ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ ۵ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۵ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ ۵ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ زصلے وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۵ وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ۵ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَیْهِ یَرْجِعُوْنَ ۵ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۵ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِیْمُ ۵ط قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓی اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ ۵ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۵ط قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ق صلے كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ ۵ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓی اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۵لا ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰی رُءُوْسِهِمْ ج لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ ۵ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّكُمْ ۵ط اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۵ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۵ قُلْنَا یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ۵لا وَاَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ ۵ج وَنَجَّیْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ ۵(21/51-71)

”اور یقیناً دی تھی ہم نے ابراہیمؑ کو ہدایت و دانائی اس سے بھی پہلے اور تھے ہم اس کو خوب جاننے والے۔ جب کہا اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کیسی ہیں یہ مورتیاں جن (کی پرستش) پر تم جمے بیٹھے ہو۔ انہوں نے کہا، پایا ہے ہم نے اپنے آبائو اجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے۔ ابراہیمؑ نے کہا: یقیناً ہو تم اور تمہارے آبائو اجداد کھلی گمراہی میں۔ انہوں نے کہا، کیا لائے ہو تم ہمارے پاس سچی بات یا تم مذاق کر رہے ہو؟ ابراہیمؑ نے کہا فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو مالک ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اسی نے پیدا کیا ہے انہیں اور میں تمہارے سامنے اس کی گواہی دیتا ہوں۔ اور قسم اللہ کی! میں ضرور ایک چال چلوں گا تمہارے بتوں کے ساتھ اس کے بعد کہ تم چلے جائو گے پیٹھ پھیر کر۔ سو کر ڈالا اس نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے سوائے بڑے بت کے اس خیال سے کہ وہ اس کی طرف

رجوع کریں۔ کہنے لگے جس نے کیا ہے یہ سلوک ہمارے خدائوں کے ساتھ یقیناوہ بڑا ہی ظالم ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا: ہم نے سنا ہے ایک نوجوان کو جو ذکر کر رہا تھا ان کا، نام ہے اس کا ابراہیمؑ۔ کہنے لگے، اچھا تو پکڑ لائو اسے لوگوں کے روبرو تاکہ وہ مشاہدہ کریں (کہ اس کی کیسی خبر لی جاتی ہے)۔ کہنے لگے: کیا تو نے کی ہے یہ حرکت ہمارے خدائوں کے ساتھ اے ابراہیمؑ؟ فرمایا، نہیں بلکہ کیا ہے یہ کام، ان کے اس بڑے نے، سو پوچھ لو ان سے اگر یہ بول سکتے ہیں۔ پھر پلٹے وہ اپنے ضمیر کی طرف اور کہنے لگے (اپنے دل میں) یقیناتم ہی ظالم ہو۔ پھر ان کی مت پلٹ گئی (اور کہنے لگے) یقیناتم جانتے ہو ابراہیمؑ کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔ ابراہیمؑ نے فرمایا سو کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا ان چیزوں کی جو نہ نفع پہنچاسکتی ہیں تمہیں ذرا بھی اور نہ نقصان پہنچاسکتی ہیں تمہیں؟ تف ہے تم پر بھی اور ان پر بھی جن کو پوجتے ہو تم اللہ کو چھوڑ کر۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ انہوں نے کہا جلاڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خدائوں کی اگر ہو تم کچھ کرنے والے۔ حکم دیا ہم نے اے آگ! ہو جا ٹھنڈی اور بن جا سلامتی ابراہیمؑ پر۔ اور ارادہ کیا تھا انہوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کرنے کا مگر ہم نے کر دیا ان کو بری طرح ناکام۔ اور بچا کر لے گئے ہم اسے اور لوطؑ کو اس سرزمین کی طرف کہ برکتیں رکھی ہیں ہم نے اس میں دنیاوالوں کے لیے۔"

ان آیات سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ مخالفین نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دیا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالی نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیمؑ کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ (24/29) میں بھی یہی فرمایا کہ اللہ تعالی نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ سے بچالیا اور اس طرح مخالفین کی تدبیر ناکام ہوگئی۔ اس آگ کے بارے میں پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ وہ مخالفین کی آتش انتقام تھی جو ٹھنڈی ہوگئی۔ (ملاحظہ کیجئے متعلقہ آیات کا مفہوم، "مفہوم القرآن" مرتبہ پرویز صاحب) کس طریقے سے پرویز صاحب نے آگ کو آتش انتقام کا روپ دے دیا۔ آتش انتقام تو تب ٹھنڈی ہوتی جب مخالفین حضرت ابراہیمؑ کو جلاڈالنے میں کامیاب ہو جاتے۔ مگر قرآن نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ اے آگ تو سلامتی والی بن جا۔ اب اگر آتش انتقام سلامتی میں بدل جاتی تو پھر حضرت ابراہیمؑ کو ہجرت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قرآن کریم نے تو واضح طور پر کہہ دیا۔ "اور ارادہ کیا انہوں نے ابراہیمؑ کے

ساتھ برائی کرنے کا مگر ہم نے کر دیا ان کو بری طرح ناکام"(51/70) اور پھر کہا"سو ارادہ کیا انہوں نے اس کے ساتھ چال چلنے کا سو ہم نے انہیں نیچا دکھا دیا۔"(37/98) اس لیے مخالفین تو مکمل طور پر اپنی چال میں ناکام ہو گئے۔ اس لیے ان کی آتش انتقام کیسے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی؟

قرآن کریم کا یہی سب سے بڑا معجزہ ہے کہ وہ اپنا مفہوم بدلنے کی ہر گز اجازت نہیں دیتا۔ اس کو من و عن تسلیم کرنے میں ہی راہ نجات ہے۔

پرندوں کا زندہ ہونا:

آیئے اس بارے میں پرویز صاحب کا نقطہ ء نظر جانتے ہیں

"دنیا میں خدائی انقلاب کی طرف دعوت دینے والوں اور لوگوں کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین سے منہ موڑ کر فقط ایک اللہ کے قوانین کی اطاعت سکھانے والوں کی مشکلات پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کا کام مردوں کو از سر نو زندگی بخشنے سے کم دشوار اور سنگین نہیں ہوتا۔ وہ ان کی اصلاح اور صحت بخشی کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن ادھر سے جمود اور بے حسی یا سرکشی اور مخالفت کے سوا کوئی رد عمل نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ کیفیت جس کے اظہار کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ اے موت و حیات کے مالک! اس قسم کے مردوں میں زندگی کس طریق سے پیدا ہو گی؟

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى ط(2/260)

"جب ابراہیمؑ نے کہا۔ اے پروردگار، مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کر دے گا۔"

جواب ملا

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط(2/260)

"ارشاد ہوا، کیا تیرا اس پر ایمان نہیں (کہ اس پیغام سے مردوں کو زندگی مل سکتی ہے؟)"

قَالَ بَلٰی وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ط (260/2)

"عرض کیا کہ ایمان کیوں نہیں! لیکن اس سوال سے مقصود اطمینان قلب ہے۔"

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں ایک تو یہ کہ موت اور حیات (زندوں اور مردوں) سے وہی مراد ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کس بات کا اطمینان چاہتے تھے۔ پہلے سوال کے متعلق واضح ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر، ان لوگوں کو جو پیغام خداوندی پر کان نہ دھر کر، خلاف شرف انسانیت راستوں پر گامزن رہتے ہیں۔ اندھے اور بہرے اور مردے کہا گیا ہے (دیکھئے 30/52-53، 27/80-81) خود نبی اکرمؐ کی دعوت کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم خدا اور رسول کی آواز پر لبیک کہو اِذَا دُعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ (8/24) جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف لائے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔ ظاہر ہے کہ یہاں "زندگی" سے مراد طبیعی حیات نہیں۔ انسانیت کی زندگی ہے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ قرآن کا پیغام اسے فائدہ دے سکتا ہے مَنۡ کَانَ حَیًّا (36/70) جس میں زندگی کی رمق باقی ہو۔ ان (اور ان جیسے مقامات) سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جن مردوں کو زندگی عطا ہونے کی بابت سوال کیا تھا، ان سے مراد ان کی وہ قوم تھی جو حیات انسانیت سے عاری ہو چکی تھی۔

دوسرے سوال کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ آپ نے پوچھا یہ تھا کہ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ط (2/260) تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تو مردوں کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ پوچھا یہ گیا ہے کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ان مردوں کو زندگی عطا ہو جائے۔ یعنی آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اس کا تو یقین ہے کہ پیغام میں اس کی صلاحیت ہے کہ یہ مردوں کو زندہ کر دے۔ لیکن مجھے اس کا طمینان نہیں کہ اس مقصد کے لیے میں جو طریقہ اختیار کر رہا ہوں

۔وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اس لیے مجھے یہ بتادے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح طریقہ کیا ہے۔ (کَیْفَ سے یہی مراد ہے)۔

حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا تھا کہ یہ لوگ جو دعوت حق و صداقت سے اس قدر متوحش ہوتے ہیں کہ اس کے قریب تک نہیں آتے۔ یہ اس سے کس طرح مانوس ہونگے؟ اس کا جواب ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا گیا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ‌ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۵ (260/2)

”ارشاد الٰہی ہوا۔ اچھا یوں کرو کہ جنگل میں سے چار پرندے پکڑ لو اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ ہلا لو (یعنی اس طرح ان کی تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح تم سے ہل جائیں)۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو (اپنے سے دور) ایک ایک پہاڑ پر بٹھا دو، پھر انہیں بلائو، وہ (آواز سنتے ہی) تمہاری طرف اڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ اللہ سب پر غالب اور اپنے کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔“

یعنی جب پرندوں تک کی یہ حالت ہے (جو انسان کے سایہ سے بدک جاتے ہیں) کہ اگر انہیں کچھ دنوں تک اپنے ساتھ مانوس کر لیا جائے تو اس کے بعد خواہ انہیں کیسا ہی آزاد کیوں نہ چھوڑ دیا جائے۔ ایک آواز دینے پر وہ لبیک! لبیک کہتے ہوئے دوڑ آتے ہیں تو کیا یہ ناممکن ہے کہ انسان (بشرطیکہ ان میں صلاحیت باقی ہو) مسلسل تربیت سے دعوت حق و صداقت سے مانوس نہ ہو جائیں اور ان میں یہ تبدیلی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی ایک آواز پر جمع ہو جائیں۔ لیکن اس کے لئے اتنے ہی استقلال و استقامت (Patience) کی ضرورت ہے۔ جتنی ایک وحشی پرندے کو ہلانے اور سدھانے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کونسی قوم تھی۔ جس کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے ان تاثرات کا اظہار فرمایا تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی کلدانی زندگی کے بعد

کا واقعہ ہے اس لئے کہ اس میں ”مردوں کی زندگی“ کا یقین دلایا گیا اور طریقہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا جس قوم کے متعلق ان تاثرات کا اظہار ہوا ہے وہ بالآخر رام ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے گرد ضرور جمع ہوئی ہو گی۔ یہی وہ قوم تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ نے نظام خداوندی کو قائم فرمایا تھا۔

بعض لوگ اس واقعہ کو اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کرتے ہیں۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ حشر کے روز مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ”چار پرندوں کو لے کر اپنے ساتھ ہلالو (پھر انہیں ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) ان کا ایک ایک حصہ چار پہاڑوں پر رکھ دو، پھر انہیں بلائو تو وہ دوڑتے ہوئے تیری طرف آجائیں گے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ ذبح شدہ پرندوں کو زندہ کر سکتا ہے جب ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو مرنے کے بعد بھی زندگی عطا کرتا ہے تو اس کے لیے مردہ پرندوں کو زندہ کر دینا کیوں مستبعد ہو؟ لیکن قرآن کریم سے اس تفسیر کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ اول تو یہ کہ اس کے لئے مندرجہ صدر ترجمہ میں قوسین کی عبارت کا اپنی طرف سے اضافہ کرنا ہو گا۔ ثانیاً یہ کہ ایک مرد مومن کے لئے اللہ اور آخرت پر ایمان نقطہء آغاز ہے۔ اس کی زندگی کی تمام عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اس لئے وہ حیات بعد الموت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تقاضا نہیں کر سکتا۔ ثالثاً یہ کہ دو ہی آیات پیشتر بادشاہ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے مباحثہ کا ذکر ہے۔ جس میں حضرت ابراہیمؑ نے ذات خداوندی کے متعلق سب سے پہلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ (2/258) میرا رب وہ ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس لئے آپ کا اللہ تعالیٰ سے یہ کہنا کہ میں طمانیت قلب کے لئے یہ کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ قرینہ سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ اور رابعاً اگر اللہ تعالیٰ نے یہی دکھلانا تھا کہ ہم یوں مردوں کو زندہ کریں گے تو اس کے لے اتنا ہی کافی تھا کہ ایک پرندہ ذبح کر کے ڈال دیا جاتا اور جب اس میں زندگی کے آثار ختم ہو جاتے تو وہ اڑنے لگ جاتا۔ اس کے لئے چار پرندوں کا قیمہ کر کے انھیں الگ الگ پہاڑوں پر رکھنا طولانی سا

عمل نظر آتا ہے۔ بنابریں اس واقعہ کا جو مفہوم ہم نے شروع میں لکھا ہے وہی قرآنی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ فَصُرۡھُنَّ اِلَیۡکَ (انہیں ہلا کر اپنے ساتھ مانوس کو لو) کا ٹکڑا اس مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔

بہر حال ان میں سے کوئی بھی مفہوم لیجئے۔ ایک حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے یعنی یہ چیز تو کبھی حیطہء تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی کہ (معاذاللہ، معاذاللہ) حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اللہ تعالی کے مردوں کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں شک کا کوئی شائبہ تک بھی تھا۔ انسانوں کی کفر و ضلالت کی روحانی موت کے بعد ہدایت و سعادت کی حیات نو، یا حشر اجساد، دونوں باتوں پر آپ کا یقین ایک غیر متزلزل ایمان کی حیثیت رکھتا تھا۔"

(جوئے نور 162-166)

یہ تھا پرویز صاحب کا نقطہء نظر۔ سب سے پہلے ہم پرویز صاحب کے ان چار اعتراضات کا جواب دیتے ہیں جو انہوں نے متعلقہ آیت کے مفہوم پر کئے ہیں۔

اول۔ مندرجہ صدر ترجمہ میں قوسین کی عبارت کا اضافہ نہ بھی کریں تو بھی فَصُرۡھُنَّ اور مِّنۡھُنَّ جُزۡءًا کے الفاظ اپنا مفہوم ادا کر رہے ہیں۔ پھر پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن کریم سے اس تفسیر کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے عربی الفاظ تو مروجہ مفہوم پر ہی دلالت کرتے ہیں۔ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ پرویز صاحب نے قوسین کے اندر اور باہر بیان کیا ہے اس کا کونسا قرینہ پایا جاتا ہے؟

دوم۔ بالکل بجا ہے لیکن ایک چیز قرآن نے بیان کی ہے تو کیا صرف اس وجہ سے قرآن کی آیات کو جھٹلایا تو نہیں جا سکتا۔ اور یہ کوئی اللہ کا بیان فرمودہ قول تو نہیں کہ کوئی بھی شخص اس چیز کو آنکھوں سے دیکھنے کا تقاضا نہ کرے۔ حضرت موسیٰؑ نے بھی تو اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

سوم۔ اب جو بات ابراہیمؑ نے کہہ دی ہے قَالَ بَلٰی وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں قرینہ سے ٹھیک نہ معلوم ہونے والی کونسی بات ہے؟

چہارم۔ اب یہ طولانی سا عمل تو اللہ تعالیٰ کی ذات نے ہی بیان فرمایا تھا۔ اس پر تو عمل ضروری تھا، وگرنہ ابراہیمؑ بھی کہہ سکتے تھے کہ یا اللہ ایک ہی پرندہ کیوں نہ لے لوں۔ (معاذاللہ)

ہمارا بھی یہ ایمان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پکے اور سچے مومن تھے، اور اس بات کی گواہی قرآن کریم نے بھی دی ہے۔ لیکن پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی قدرت پر ایمان تھا اس لئے وہ یہ سوال (کہ مردہ کو کیسے زندہ کرتا ہے؟) نہیں کرسکتے۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم وہی ٹھیک ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔۔۔ درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس چیز کا اظہار کیا قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ؟ مگر ابراہیمؑ کے جواب نے اس شک کو ختم کر دیا قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ اور اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ سوال (کہ مردہ کو کیسے زندہ کرتا ہے؟) یہی تھا۔ نہ کہ کسی مردہ قوم کو زندگی عطا کرنے کی کوئی بات۔

اس کے ساتھ ہی ایک آیت پہلے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار کر چکے ہیں۔ جب کہا کہ

☆ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ج قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ج فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ط قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ط قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ج وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ط فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ لا قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۵
(259/2)

"یا اس شخص کی مانند کہ جس کا گزر اس بستی پر ہوا جو چھت کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی وہ کہنے لگا اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے مار دیا سو سال کے لیے، پھر اسے اٹھایا۔ پوچھا کتنی مدت تجھ پر گذری ہے کہنے لگا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ فرمایا بلکہ تو سو سال تک رہا۔ پھر اب تو اپنے کھانے پینے کو دیکھ کہ بالکل خراب نہیں ہوا۔ اور اپنے گدھے کو بھی دیکھ۔ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بناتے ہیں۔

تو دیکھ کہ ہم ہڈیوں کو کس طرح اٹھاتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب یہ سب ظاہر ہو چکا تو کہنے لگا میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اب یہاں بھی اس اللہ کے بندے نے اس تعجب کا اظہار کیا کہ اللہ کیسے مردہ بستی کو زندہ کر سکتا ہے۔ اور اس کے جواب میں اللہ نے اسے مار کر، پھر سو سال بعد زندہ کیا اور اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں اور پھر اس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

اب متذکرہ بالا اعتراضات اور ان کے جوابات سے یہ بات واضح ہے کہ یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ ان کی بنیاد تب ہوتی جب پرویز صاحب ان آیات کے مروجہ مفہوم پر لغت، عربی زبان کے قواعد، گرائمر، ترجمہ کے اصول یا سیاق و سباق کے حوالے سے اعتراضات کرتے اور پھر یہ ثابت کرتے کہ مروجہ مفہوم درست نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پرویز صاحب کی بات کو صحیح مانا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ مردہ قوم کیسے زندہ ہو گی اور اللہ نے طریقہ بھی بتادیا۔ مگر پھر بھی حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے آپ کو آگ میں ڈال دیا اور آپ کو وہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ تعجب ہے؟ یہاں پرویز صاحب نے کہا کہ یہ ان کی کلدانی زندگی کے بعد کا واقعہ ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے نظام خداوندی قائم کیا تھا۔ تو اس کا کوئی حوالہ قرآن کریم یا تاریخ سے نہیں دیا۔

اگلی بات یہ کہ قرآن کریم نے کہا ہے " ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا کہ پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے کا کچھ حصہ رکھ دو۔" جو یہی ظاہر کرتا ہے کہ پرندوں کو ذبح کر کے آپس میں مکس (Mix) کر کے پھر ہر پہاڑ پر کچھ حصہ رکھنا ہے۔

پھر یہ کہ پرویز صاحب نے یہاں "الطّیر" کا ترجمہ "پرندہ" کیا ہے۔ ورنہ اسی "الطّیر" کا ترجمہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے واقعات میں وہ "قبیلہ طیر کے لوگ" کرتے ہیں۔

بہر حال قرآنی آیات اپنے مطالب میں بہت واضح ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام:

اب دیکھتے ہیں حضرت داؤدؑ کے بارے میں قرآنی آیات پر پرویز صاحب کا نقطۂ نظر

حضرت داؤدؑ۔ اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَالۡاِشۡرَاقِ ۵ لا وَالطَّیۡرَ مَحۡشُوۡرَۃً ؕ کُلٌّ لَّہٗۤ اَوَّابٌ ۵ (38/18-19)

"بلاشبہ ہم نے پہاڑی قبائل کو اس کے لئے مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام اس کے ساتھ "تسبیح" کرتے تھے۔ اور قبیلہ طیر کو جمع کر دیا تھا۔ سب کے سب اس کی طرف رجوع ہونے والے (مطیع و منقاد) تھے۔"

اس آیت میں الجبال کے معنی پہاڑی قبائل بھی ہو سکتے ہیں اور الطیر کے معنی قبیلہ طیر کے منتشر خانہ بدوش افراد جن سے شاہی رسالے (گھوڑوں کے رسالے) مرتب ہوتے تھے۔ تسبیح کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مطلب تسبیح کے دانے گننا نہیں ہوتا بلکہ فرائض مفوضہ کی سرانجام دہی میں پوری پوری قوتوں سے سرگرم عمل رہنا ہے۔ لہٰذا اس آیت کے معنی یہ ہونگے کہ بڑے بڑے سرکش پہاڑی قبائل حضرت داؤدؑ کے تابع فرمان تھے جو ان کے ساتھ ان کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں دن رات سرگرم عمل رہتے تھے۔ نیز خانہ بدوش قبیلہ طیر کے افراد کو بھی اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ ان پر حضرت داؤدؑ کے گھوڑوں کے رسالے مشتمل تھے۔

نیز دھاتوں سے اسلحہ سازی کا کام لیا جاتا تھا۔

☆وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا طیٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَہٗ وَالطَّیْرَ ج وَاَلَنَّا لَہُ الْحَدِیْدَ ۵لا اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۵(11-10/34)

”اور دیکھو ہم نے داوٴدؑ کو اپنے پاس سے فضیلت عطا فرمائی۔ (اور پہاڑی قبائل کو حکم دے دیا) تم دائودؑ کے ساتھ مل کر فرائض مفوضہ کی تکمیل کرو۔ اور قبیلہ طیر کے لوگوں کو بھی حکم دیا۔ اور ہم نے لوہے کو اس کے لئے نرم کر دیا۔ (اور دائودؑ کو حکم دے دیا) کہ پوری زرہیں بنائو اور زرہ کی لڑیاں بنانے میں اندازہ رکھو (کہ برابر رہیں) اور صلاحیت بخش کام کرتے رہو۔ (دیکھو) جو کچھ تم کرو گے میں اسے دیکھنے والا ہوں۔“

یہی ایک مرد مومن کی خصوصیت ہے کہ یہ جب اس کا ہو جاتا ہے جس کی ساری دنیا ہے تو پھر ساری دنیا اس کی ہو جاتی ہے یہ اس کے حضور جھکا ہوا اور ساری دنیا اس کے حضور جھکی ہوئی۔

سورئہ انبیاء میں ہے

☆وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ ط وَکُنَّا فٰعِلِیْنَ ۵ وَعَلَّمْنٰہُ صَنْعَۃَ لَبُوْسٍ لَّکُمْ لِتُحْصِنَکُمْ مِّنْ م بَاْسِکُمْ فَھَلْ اَنْتُمْ شٰکِرُوْنَ ۵ (80-79/21)

”اور ہم نے دائودؑ کے لئے پہاڑی قبائل کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ تمام امور کو سرانجام دیتے اور اسی طرح قبیلہ طیر کو بھی۔ اور ہم ہی ایسا کرنے والے تھے۔ (مزید بر آں) ہم نے اسے تمہارے لیے زرہ بکتر بنانا سکھایا کہ وہ تمہیں ایک دوسرے کی زد سے بچائے تو کیا تم (ہماری نوازشات کے) شکر گزار نہیں ہوتے۔“ (برق طور 250-251)

یہ تھا پرویز صاحب کا نقطئہ نظر حضرت دائودؑ کے حوالے سے، ہم صرف یہاں پر ان قرآنی آیات کا ترجمہ قواعد وضوابط عربی کے مطابق پیش کرتے ہیں۔

☆اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ ۵لا وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَۃً ط کُلٌّ لَّہٗ اَوَّابٌ ۵ (19-18/38)

''ہم نے مسخر کر رکھا تھا پہاڑوں کو اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ وہ شام کے وقت اور صبح کے وقت۔ اور پرندے سمٹ آتے تھے یہ سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔''

☆وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ط یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَہٗ وَالطَّیْرَ ج وَاَلَنَّا لَہُ الْحَدِیْدَ ۵ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۵ (34/10-11)

''اور بے شک عطا کیا تھا ہم نے داؤدؑ کو اپنے ہاں سے بڑا فضل (اور حکم دیا تھا کہ) اے پہاڑو! تسبیح و مناجات میں ساتھ دو اس کا اور (یہی حکم دیا تھا) پرندوں کو بھی۔ اور نرم کر دیا تھا ہم نے اس کے لیے لوہا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ تیار کرو زرہیں اور ٹھیک اندازے پر رکھو ان کے حلقے اور کرو نیک کام۔ بے شک میں تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہوں۔''

☆وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ ط وَکُنَّا فٰعِلِیْنَ ۵ وَعَلَّمْنٰہُ صَنْعَۃَ لَبُوْسٍ لَّکُمْ لِتُحْصِنَکُمْ مِّنْ م بَاْسِکُمْ فَھَلْ اَنْتُمْ شٰکِرُوْنَ ۵ (21/79-80)

''اور مسخر کر دیا تھا ہم نے داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں کو جو تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی اور تھے ہم ہی (یہ سب) کرنے والے۔ اور سکھادی تھی ہم نے اسے صنعت سازی تمہارے لیے تاکہ وہ بچائے تمہیں ایک دوسرے کی مار سے، پھر کیا ہو تم (ہمارا) شکر ادا کرنے والے۔؟''

یہ تھا قرآنی آیات کا ترجمہ۔ اب پرویز صاحب نے بڑی آسانی سے ''اَلْجِبَال'' کو ''پہاڑی قبائل'' اور ''الطّیر'' کو قبیلہ طیر اور ''تسبیح'' کو فرائض مفوضہ میں تبدیل کر دیا۔ حالانکہ انہیں واضح کرنا چاہیئے تھا کہ کونسی لغات کے مطابق یہ معانی نکلتے ہیں۔ اب اگر ان کا معنی قبائل ہی ہوتا تو ''قبائل'' بذات خود عربی کا لفظ ہے اور قرآن نے اسے اور مقام پر استعمال کیا ہے۔ اب یہاں کیا مشکل تھی کہ اللہ تعالیٰ ہی ''پہاڑی قبائل'' یا ''قبیلہ طیر'' کے لفظ استعمال کر دیتے۔ اس کے ساتھ ہی پرویز صاحب کہتے ہیں کہ ''تسبیح کے معنی فرائض مفوضہ کی سرانجام

دہی میں پوری قوتوں سے سرگرم عمل رہنا ہے"۔ اگر ایسا مان لیا جائے تو پھر اس کے ساتھ وقت کی قید کیوں ہے۔ قرآن کریم نے واضح طور پر کہا ہے کہ "بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ" صبح کے وقت اور شام کے وقت۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کے اکثر مقامات پر آپ تسبیح کے ساتھ وقت کا تعین لازمی دیکھیں گے۔ (تسبیح کے متعلق مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تسبیح کا موضوع)

اب دیکھتے ہیں حضرت سلیمانؑ کے بارے میں قرآنی آیات پر پرویز صاحب کا نقطۂ نظر

حضرت سلیمانؑ۔

☆وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۵ (16/27)

"اور (دیکھو) سلیمانؑ داؤدؑ کا وارث ہوا اور کہنے لگا لوگو! ہمیں منطق الطیر سکھایا گیا ہے۔ اور ہر چیز عطا کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ تو خدا کا کھلا ہوا فضل ہے۔"

منطق الطیر کے معنی "پرندوں کی بولی" نہیں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں: طیر سے مراد گھوڑوں کا لشکر ہے (جو داؤدؑ اور سلیمانؑ کے زمانہ میں بیشتر قبیلہ طیر کے افراد پر مشتمل تھا) اور منطق کے معنی اس لشکر کے قواعد وضوابط ہیں۔ لہٰذا اس سے مطلب ہے گھوڑوں کے رسالہ کے متعلق علم۔ یہ اس زمانے میں بڑی چیز تھی۔

☆وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۵ (81/21)

"اور (دیکھو) ہم نے (سمندر کی) تند ہواؤں کو بھی سلیمانؑ کے لیے مسخر کر دیا تھا۔ کہ اس کے حکم پر چلتی تھیں۔ اور اس سرزمین کے رخ پر جس میں ہم نے بڑی ہی برکت رکھ دی ہے۔ (یعنی فلسطین اور شام کے رخ پر جہاں بحر احمر اور بحر متوسط سے دور دور کے جہاز آتے تھے) اور ہم ساری باتوں کی آگاہی رکھتے ہیں۔"

☆ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ج وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ط وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ط وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۵ (34/12)

"اور ہم نے سلیمانؑ کے لئے (سمندری) ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا جو صبح کو ایک مہینہ کی اور شام کو ایک مہینہ کی مسافت قطع کر لیا کرتی تھیں۔ اور (دیکھو) ہم نے اس کے واسطے تانبہ کا چشمہ بہا دیا تھا اور وحشی قبائل میں سے ان لوگوں کو مطیع کر دیا تھا۔ جو اس کے سامنے (ہر طرح کے) کام کرتے تھے اور (یہ حقیقت ہے کہ) جو ان میں سے ہمارے حکم سے منہ موڑتا ہم اسے جہنم کے (دردناک) عذاب (کا مزہ) چکھاتے۔"

☆ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۵ لا (38/36)

"چنانچہ ہم نے ان کے لیے (سمندر کی تند) ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا۔ جو ان کے حکم کے مطابق جہاں وہ جانا چاہتے تھے نرمی سے چلتی تھیں۔"

جب تک دخانی جہازوں کی ایجاد نہیں ہوئی تھی کشتیوں کے چلانے میں ہوائیں سب سے بڑی قوت تھیں۔ جہاں تک تاریخ شاہد ہے حضرت سلیمانؑ نے پہلے پہل بادبانوں سے ہواؤں کو مسخر کیا۔ نقشے میں دیکھئے۔ فلسطین کے شمال و مغرب میں بحر متوسط اور جنوب کی طرف بحر احمر واقع ہے۔ ان دونوں سمندروں میں مخالف سمت کی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ جن سے دور دراز کے ملکوں کا سامان فلسطین تک آ پہنچتا ہے۔ اور یوں دنیا بھر کی برکت اس "ارض مقدس" میں جمع ہو جاتی ہے۔ (برق طور 261-262)

بحری بیڑے کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کا بری لشکر بھی بڑا عظیم الشان تھا۔ جس میں کوہستانی عسکری قبائل اور مہذب آبادی کے افراد شامل تھے۔

☆وَحُشِرَ لِسُلَیۡمٰنَ جُنُوۡدُہٗ مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ وَالطَّیۡرِ فَہُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ ٥(17/27)

"اور (دیکھو) سلیمانؑ کے لئے ہر قسم کے لشکر جمع کر دیئے تھے۔ کیا از قسم وحشی اور بدوی قبائل اور کیا از قسم متمدن اور حضری قبائل نیز گھوڑوں کے رسالے (کثرت تعداد کی وجہ سے اژدھام ہو جانے پر) انہیں روکا جاتا اور ضبط کے اندر رکھا جاتا تھا۔"

یہ لشکر ایسا عظیم الشان تھا کہ جس خطہ ملک سے گزر جاتا وہاں کے لوگ خوف کے مارے ادھر ادھر چھپ جاتے۔

☆حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ ۙ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّہَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ ۚ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ جُنُوۡدُہٗ ۙ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ٥ فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنۡ قَوۡلِہَا وَ قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰہُ وَ اَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ ٥(19-18/27)

"حتیٰ کہ جب وہ قبیلہ نمل کی وادی پر گزرے تو ایک نملی نے اس زبردست اور لاتعداد لشکر کو دیکھ کر کہا کہ اے قبیلہ نمل کے لوگو! اپنے گھروں میں گھس جائو تمہیں سلیمانؑ اور اس کا لشکر روندنہ ڈالے کہ انہیں خبر بھی نہ ہو۔ اس کی بات سن کر سلیمانؑ ہنستا ہوا مسکرا دیا۔ اور بولا۔ اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیرے ان احسانات کا شکر ادا کروں جو تونے مجھ پر اور میرے والدین پر کئے ہیں اور یہ کہ میں وہ نیک کام کروں جنہیں تو پسند کرتا ہو۔ اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل کرلے۔" (برق طور264-266)

☆وَتَفَقَّدَ الطَّیۡرَ فَقَالَ مَا لِیَ لَاۤ اَرَی الۡہُدۡہُدَ ۫ۖ اَمۡ کَانَ مِنَ الۡغَآئِبِیۡنَ ٥ لَاُعَذِّبَنَّہٗ عَذَابًا شَدِیۡدًا اَوۡ لَاَاذۡبَحَنَّہٗۤ اَوۡ لَیَاۡتِیَنِّیۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ٥(21-20/27)

”اور (دیکھو) جب سلیمانؑ نے رسالوں کی حاضری لی تو کہا کیا بات ہے میں ہدہد کو یہاں نہیں دیکھتا کیا وہ غائب ہے؟ یقیناً میں اسے بہت سخت عذاب دوں گا۔ بلکہ اسے ذبح ہی کر ڈالوں گا۔ اِلاّ یہ کہ وہ (اپنی غیر حاضری پر) کوئی واضح حجت (وجہ) پیش کر دے (تو شاید چھوڑ دوں)۔“

اس زمانے میں آدمیوں کے نام پرندوں اور جانوروں کے نام پر بھی رکھے جاتے تھے۔ چنانچہ خود تورات میں ہے کہ ایک ادومی شاہزادے کا نام ہدہد تھا (سلاطین (i 14/11) ہندوؤں کے ہاں طوطا رام اور چوہا بل جیسے نام اب تک رکھے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے مذکورہ صدر آیت میں جس ہدہد کا ذکر ہے وہ رسالے کا کوئی افسر تھا۔ (برق طور۔268)

☆قَالَ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَؤُا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ٥ قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ وَاِنِّیْ عَلَیْہِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ٥ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ط فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ قف لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ط وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ج وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ٥ قَالَ نَکِّرُوْا لَھَا عَرْشَھَا نَنْظُرْ اَتَھْتَدِیْٓ اَمْ تَکُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَھْتَدُوْنَ ٥ (27/38-41)

”سلیمانؑ نے کہا، اے اہل دربار! اس سے پہلے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر آئیں۔ اس کا تخت میرے پاس کون لاتا ہے؟ وحشی قوم کے ایک فرد عفریت نامی شخص نے عرض کیا۔ میں اسے اس سے پہلے آپکی خدمت میں لے آتا ہوں کہ آپ اپنے دربار سے اٹھیں۔ میں اتنی قوت رکھتا ہوں۔ اور امانت دار بھی ہوں۔ ایک اور شخص جس کے پاس کتاب کا علم تھا بولا! میں اسے آپ کے پاس آپ کی آنکھ جھپکنے سے پیشتر لے آتا ہوں۔ چنانچہ جب اسے سلیمانؑ نے اپنے پاس رکھا دیکھا تو کہنے لگا۔ یہ میرے پروردگار کا احسان ہے۔ تاکہ وہ میری آزمائش کرے کہ اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور (واقعہ ہے کہ) جو شکر کرتا ہے۔ وہ اپنے (فائدے کے لئے) شکر کرتا ہے۔ (کیونکہ اس کا بہتر نتیجہ اسی کو ملتا ہے) اور جو ناشکری کرتا ہے تو خدا ان کے شکریوں سے بے نیاز اور کریم ہے۔ (پھر سلیمانؑ نے اہل دربار کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ملکہ سبا کے تخت کی صورت تبدیل کر دو! ہم دیکھنا

چاہتے ہیں کہ آیا اسے اس بات کا پتہ لگ جاتا ہے یا وہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے جن کی عقل (حقائق کی طرف) راستہ نہیں پاتی۔"

یہ ان الفاظ کا لفظی ترجمہ ہے۔ مفہوم ان کا یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے تجویز کیا کہ قبل اس کے کہ ملکہ سبا کے لشکر میدان میں مقابلہ کے لئے آجائیں ہمیں چاہئے کہ جلدی سے اس کے دارالسلطنت پر زور کا حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے آئیں۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اپنے کمانداروں سے پوچھا کہ اس مہم کو کون جلد از جلد سر کر سکتا ہے۔ اس پر وحشی قبائل کے ایک قوی ہیکل سردار نے جو جسمانی قوت کے علاوہ معاملہ فہمی میں بھی ماہر تھا۔ کہا کہ میں اس مہم کو اتنی جلدی سر کر سکتا ہوں کہ قبل اس کے کہ آپ یہاں سے آگے کوچ کریں۔ ملکہ اور اس کا تخت و تاج آپ کے قدموں میں ہو گا۔ ایک اور افسر تھا۔ جسے اس خط و کتابت کا بھی علم تھا جو ملکہ سبا سے ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ میں اس مہم کو اس سے بھی زیادہ جلدی سر کر سکتا ہوں۔ اتنی جلدی کہ آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں ملکہ کا تخت آپ کے سامنے ہو گا۔ چنانچہ وہ مہم اس کے سپرد کر دی گئی اور اس نے اسے نہایت حسن و خوبی سے سر کر لیا۔ (برق طور)

حضرت سلیمانؑ کے حالات زندگی کے بارے میں پرویز صاحب کا نقطۂ نظر آپ نے ملاحظہ کیا۔ اس میں سب سے پہلے دیکھتے ہیں "مَنْطِقَ الطَّیْر" یعنی پرندوں کی بولی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں پرویز صاحب نے "الطَّیْر" سے مراد "پرندے" ہی لیا ہے۔ جبکہ حضرت داوٗدؑ کے واقعہ میں وہی "الطَّیْر" "قبیلہ طیر" بن گیا اور یہاں پر "گھوڑوں کا لشکر"۔ حالانکہ سیاق و سباق کی رو سے "الطَّیْر" ہر جگہ ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جبکہ پرویز صاحب کا طریقہ کار درست نہیں ہے۔ جہاں دل کیا اپنی ہی مرضی کا مطلب لگا دیا۔ اور وہی مفہوم نکالا جو پہلے سے ذہن میں طے شدہ تھا۔ حالانکہ اپنے لٹریچر میں وہ بارہا اس کا ذکر کرتے ہیں کہ قرآن کریم کا مطالعہ خالی الذہن ہونا چاہئے۔

اس کے بعد ہوا کا ذکر ہے۔ جس کے مفہوم میں پرویز صاحب نے ''سمندری ہوا'' کا اضافہ خود کیا ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے صرف ''ہوا'' کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح پرویز صاحب نے اصل بات کا رخ ''بادبانی کشتیوں'' کی طرف موڑ دیا۔ حالانکہ قرآن کریم نے واضح طور پر کہا کہ ''تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ'' یعنی آپؑ کے حکم سے ہوا چلتی تھی اور آپؑ ہوا کے ذریعے جہاں جانا چاہتے پہنچ جاتے تھے۔

اب آتی ہے اس واقعہ کی سب سے اہم بات۔

☆حَتّٰٓی اِذَآ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ لا قَالَتْ نَمْلَۃٌ یّٰٓاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُہٗ لا وَ ھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۵ فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنْ قَوْلِھَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ ۵ (27/18-19)

''(اور ایک مرتبہ) جمع کئے گئے سلیمانؑ کے جائزہ کے لئے اس کے تمام لشکر جو مشتمل تھے جنوں، انسانوں اور پرندوں پر، پھر ان کی نظم و ضبط کے ساتھ صف بندی کی گئی۔ (اور چل پڑے) حتی کہ جب وہ پہنچے چیونٹیوں کی وادی میں تو کہا ایک چیونٹی نے، اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنے بلوں میں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کچل ڈالیں تمہیں سلیمانؑ اور ان کا لشکر جبکہ انہیں خبر بھی نہ ہو۔ تو سلیمانؑ مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اس کی بات پر اور کہنے لگے اے میرے مالک! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیرے ان احسانات کا جو تو نے کئے ہیں مجھ پر اور میرے والدین پر اور یہ کہ میں کرتا رہوں ایسے نیک عمل جو تجھے پسند ہوں اور داخل فرما تو مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں۔''

ان آیات کا جو مفہوم پرویز صاحب نے بیان کیا ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ ویسے ضمناً عرض کرتا چلوں۔ کہ ''وادیٔ نمل'' کی چیونٹی پر ''طلوع اسلام'' اور ''اشراق'' کے درمیان بحث کافی دیر تک چلتی رہی ہے۔ جس میں اس کے لغوی مطالب اور گرامر کی تشریحات کے لحاظ سے مفصل بات کی گئی ہے۔ جس کو میرا خیال ہے اگر

مرتب کیا جائے۔ تو ایک کتاب ضرور بن جائے گی۔ بہر حال ہم یہاں سیاق و سباق کے حوالہ سے بات کریں گے۔ اس آیت میں " لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُہٗ لَا وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۵" کے الفاظ قابل غور ہیں۔ کہ "کہیں ایسا نہ ہو کہ کچل ڈالیں تمہیں سلیمانؑ اور ان کا لشکر جبکہ انہیں خبر بھی نہ ہو۔" اب ظاہری بات ہے اگر انسانوں کی وادی ہوتی تو لازماً یہ بات کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ کیونکہ کچلنے سے پہلے اور بعد میں لشکر کو ضرور معلوم ہو جاتا۔ اور انسانوں کو بے خبری میں کچلا نہیں جا سکتا۔ یہ تو صرف "چیونٹیوں" کی ہی مخلوق ہو سکتی ہے جس کو بے خبری اور لاعلمی میں کچلا جا سکتا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ حضرت سلیمانؑ یہ بات سن کر مسکرائے اور اللہ سے کہا کہ مجھے توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیرے احسانات کا جو تو نے کئے ہیں مجھ پر۔ اب اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی ایسی خاص بات ہوئی ہے جو مروجہ قاعدے اور قانون سے ہٹ کر ہے۔ جس پر سلیمانؑ اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ اور وہ یہی تھی کہ آپؑ چیونٹی کی زبان کو سمجھ رہے تھے۔

☆ وَتَفَقَّدَ الطَّیْرَ فَقَالَ مَالِیَ لَآ اَرَی الْھُدْھُدَ صلے اَمْ کَانَ مِنَ الْغَآئِبِیْنَ ۵ لَاُعَذِّبَنَّہٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّہٗٓ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۵ (27/20-21)

"اور آپ نے پرندوں کا جائزہ لیا اور فرمانے لگے یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا؟ کیا واقعی وہ غیر حاضر ہے۔ یقیناً میں اسے سخت سزا دوں گا۔ یا اسے ذبح کر ڈالوں گا۔ یا میرے سامنے کوئی معقول وجہ بیان کرے۔"

یہاں پرویز صاحب نے کہہ دیا کہ "ہدہد" رسالے کا کوئی افسر تھا۔ حالانکہ اس آیت میں یہ چیز واضح ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا اور ہدہد کو غائب پایا۔ اس کے بعد خط و کتابت بھی اسی ہدہد کے ذریعے سر انجام پائی۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے جس آیت کا ذکر کیا ہے وہ ہے (27/38-41)۔ اس کا ترجمہ انہوں نے بعینہ درج کر دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد جو مفہوم بیان کیا ہے وہ ان کا اپنا وضع کردہ ہے اور قرآنی عبارت سے اس کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔

یہ ایک طریقہ کار ہے جو انہوں نے اپنایا ہے جیسا کہ ہم گذشتہ واقعات میں دیکھتے آئے ہیں کہ جہاں کہیں ایک یا دو لفظوں کا مفہوم یا معنی بدل کر پرویز صاحب کا کام چل جاتا ہے وہاں وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور باقی آیت کو نہیں چھیڑتے۔ مگر جہاں ایک یا دو لفظوں کے مفہوم بدل کر بھی ان کا مطلب پورا نہیں ہوتا وہاں وہ پوری آیت یا آیات کو پس پشت ڈال کر اپنا علیحدہ ہی مفہوم بیان کر دیتے ہیں۔ اب قرآنی الفاظ ہیں کہ "قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ" اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں "ایک اور افسر تھا جسے اس خط و کتابت کا بھی علم تھا۔ جو ملکہ سبا سے ہوئی تھی۔" قرآن کریم کی اس آیت کو ہم پھر درج کرتے ہیں۔

☆قَالَ یٰٓاَیُّھَا الْمَلَؤُا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ۵ قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ وَاِنِّیْ عَلَیْہِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ۵ قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ط فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ قف لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ط وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ج وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ۵ قَالَ نَکِّرُوْا لَھَا عَرْشَھَا نَنْظُرْ اَتَھْتَدِیْٓ اَمْ تَکُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَھْتَدُوْنَ ۵ (27/38-41)

"آپ نے فرمایا اے سردارو! تم میں سے کوئی ہے جو ان کے مسلمان ہو کر پہنچنے سے پہلے ہی اس کا تخت مجھے لا دے۔ ایک سرکش جن کہنے لگا آپ اپنی جگہ سے اٹھیں اس سے پہلے ہی میں اسے آپ کے پاس لا دیتا ہوں۔ اور میں اس پر قادر ہوں اور ہوں بھی امانت دار۔ وہ شخص کہنے لگا جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ اس سے پہلے کہ آپ پلک جھپکیں میں اسے آپ کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ جب آپ نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو فرمانے لگے یہی میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر گزاری کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے کرتا ہے۔ اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا رب بے پروا اور بزرگ ہے۔"

اس آیت پر بار بار غور کیجئے کیا اس سے یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت سلیمانؑ کے قبضہ میں کچھ ایسے امور بھی تھے جو آج کے Cause and Effect سے ماوراتھے۔ پلک جھپکنے سے پہلے یا اپنی جگہ اٹھنے سے پہلے ملکہ سبا کا تخت آموجود ہونا کونسے علت و معلول کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس پر بھی حضرت سلیمانؑ کا اللہ کا شکر ادا کرنا۔ اس سے پہلے بھی چیونٹی کی زبان سمجھ کر آپؑ نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

آیت (27/20-21) میں "طیر" کو "رسالے" اور "ہدہد" کو "رسالے کا کوئی افسر" بول دیا اور باقی آیت کا ترجمہ بالکل ٹھیک کر دیا۔ تو مفہوم اپنی مرضی کا کر لیا۔ مگر اس آیت میں ایک دو الفاظ کو بدلنے سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لیے یہاں پورا مفہوم ہی بدل دیا۔ بعینہ جیسے قصہ موسیٰؑ میں ایک یا دو الفاظ کا مطلب بدلنے سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ وہاں کہہ دیا کہ میں تو ان آیات کا "مجازی مفہوم" لیتا ہوں۔

جب آپ کہتے ہیں کہ قرآن منزل من اللہ ہے اور حرف بہ حرف اسی حالت میں ہے جس حالت میں چودہ سو سال پہلے تھا۔ تو پھر اس کو من و عن کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ تو کہیں نہیں کہا کہ اس کی ہر بات یا اس کائنات میں ہر کام علت و معلول کی کڑیوں میں بندھا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہی فرماتے ہیں یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡد جو چاہے کر سکتا ہے۔ قادر ہے۔ اور اس سے پوچھا نہیں جاسکتا۔ مگر پھر بھی پرویز صاحب کیوں اللہ تعالیٰ کو بھی قانون کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔

اب دیکھتے ہیں حضرت یونسؑ کے بارے میں قرآنی آیات پر پرویز صاحب کا نقطۂ نظر

حضرت یونسؑ۔ وَاِنَّ یُوۡنُسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۵ط اِذۡ اَبَقَ اِلَی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ۵ (37/139-140)

"اور (دیکھو) یونسؑ بھی (ہمارے) فرستادہ پیغمبروں میں سے تھا۔ (یاد کرو) جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگا تھا۔"

اس میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ آپ (معاذاللہ) خدا کے حکم کی تعمیل سے جی چرا کر بھاگ نکلے تھے۔ قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالی کے ایک رسول کے متعلق ایسی بات کا تصور بھی کفر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سورۂ انبیاء میں آپ کے خشمناک ہونے کا ذکر آیا ہے۔

☆وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ صلے اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ج۵ صلے فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ وَنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْغَمِّ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۵(21/87-88)

”اور (اسی طرح) ذالنون (کا معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ (راہ حق میں) خشمناک ہو کر چلا گیا۔ پھر اس نے خیال کیا ہم اسے تنگی میں نہیں ڈالیں گے۔ لیکن پھر (جب حالت اس پر تنگ ہوئی تو مایوسی کی) تاریکیوں میں اس نے پکارا، خدایا تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تیرے فیصلے ہر نقص سے پاک ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے (اپنے اوپر بڑا ہی) ظلم کیا۔ تب ہم نے اس کی پکار سن لی اور غمگینی سے اسے نجات دی (دیکھو) ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔“

ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ رسول پہلے اپنی قوم کو حق کی دعوت دیتا ہے لیکن جب مسلسل دعوت و تبلیغ کے باوجود یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ قوم صحیح راستے کی طرف نہیں آرہی تو وہ خدا کے حکم کے مطابق اس مقام کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے۔ جہاں کے متعلق یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اس دعوت کے لئے فضا زیادہ ساز گار ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونسؑ نے جب دیکھا کہ قوم اپنی سرکشی اور مخالفت سے باز نہیں آتی تو وہ قوم سے ناراض ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے لئے چل نکلے۔ ابھی خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ لیکن چونکہ ان کا یہ فیصلہ خدا کے کسی حکم کے خلاف نہیں تھا۔ اس لیے انہیں اس کا خیال تک بھی نہیں آسکتا تھا۔ کہ ان کا یہ فیصلہ خدا کی نارضامندی کا موجب ہو گا۔ لیکن جب انہیں مشکلات کا سامنا ہوا تو اس کا احساس ہوا کہ میں نے یہ فیصلہ خدا کے حکم سے پہلے ہی کر لیا۔ اس لیے یہ منشائے ایزدی کے مطابق نہیں ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے اللہ سے معافی چاہی۔

واقعہ کی مسلسل کڑیاں یوں مذکور ہیں اس کے بعد ہے۔

☆فَسَاھَمَ فَکَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ۵ج فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ وَھُوَ مُلِیْمٌ ۵(37/141-142)

"پس (جہاز کے) مسافروں کے ساتھ یہ بھی شریک ہو گئے۔ چنانچہ یہ ان لوگوں میں ہو گئے جو سمندر میں ڈال دیئے گئے۔ پھر ایک بڑی مچھلی نے ان کو منہ میں دبوچ لیا اور وہ اپنے آپ کو (اس وقت) ملامت کر رہے تھے۔"

قرآن نے اس کی وجہ نہیں بتائی کہ کشتی کے کچھ لوگ دریا میں کیوں ڈال دیے گئے۔ لیکن پہلے جو کہا گیا ہے کہ کشتی پہلے ہی بھری ہوئی تھی تو اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ آگے چل کر کشتی بوجھ کی زیادتی کی وجہ سے ڈوبنے لگی ہو گی اور ملاحوں نے فیصلہ کیا ہو گا کہ بوجھ کم کرنے کے لئے کچھ سواریوں کو نکال دیا جائے تاکہ باقیوں کی جان بچ جائے۔

اس کے بعد ہے

☆فَلَوْلَآ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۵لا لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِہٖٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۵ج فَنَبَذْنٰہُ بِالْعَرَآءِ وَھُوَ سَقِیْمٌ ۵ج (37/143-145)

"پس اگر وہ مسبحین میں سے نہ ہوتا تو وہ قیامت کے دن تک اس کے پیٹ میں رہتا۔ پھر ہم نے اسے ایک میدان میں ڈال دیا۔ مگر (مچھلی کے پیٹ میں کچھ عرصہ رہنے کی وجہ سے) وہ اس وقت مضمحل تھا۔"

یہاں پر مسبحین کا لفظ قابل غور ہے۔ عام طور پر اس کے معنی۔ تسبیح بیان کرنے والا کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی پورے ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے والا بھی ہیں۔ اس مقام پر یہی معنی زیادہ موزوں ہیں۔ اس لئے قرآن نے کہا کہ اگر وہ اچھے تیراک نہ ہوتے اور اپنے آپ کو مچھلی کے منہ سے چھڑا نہ لیتے تو مچھلی انہیں ہضم کر جاتی۔ بہر حال وہ اس مصیبت سے نجات پا کر ساحل تک آ پہنچے۔ لیکن بہت مضمحل اور نڈھال ہو رہے تھے۔

(برق طور 291-293)

ان آیات میں واضح ہے کہ مچھلی نے یونسؑ کو لقمہ بنالیا تھا "فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتَ" اس لیے یہاں تیراک ہونا یا نہ ہونا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد قرآن نے کہہ دیا کہ اگر وہ تسبیح بیان کرنے والوں میں نہ ہوتا تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا۔ اور اس کے بعد قرآن کریم نے وہ تسبیح بھی بتادی۔ " فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ صلے اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۵" پس اس نے پکارا تاریکیوں میں کہ بے شک کوئی معبود نہیں مگر اللہ جس کی ذات ہر شرک سے پاک ہے اور میں ہی ظالم تھا۔ "فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ" پس ہم نے اس کی پکار سن لی "وَنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْغَمِّ ط" اور اسے نجات دلائی غم سے۔

اس لیے یہاں مسبحین کا معنی تیراک نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یونسؑ نے اللہ کی تسبیح بیان کی اور یوں اللہ تعالی نے ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکال دیا۔

حضرت عیسٰیؑ۔ اب ہم ذکر کرتے ہیں حضرت عیسٰیؑ کی زندگی کے کچھ واقعات کا۔ قرآن کریم نے یہ بتایا کہ عیسٰیؑ بن باپ کے خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے۔ اور ان کی وفات بھی عام انسانوں کی طرح نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالی نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا۔ اور اس کے علاوہ بہت سے معجزات آپؑ کو عطا کئے گئے۔ مگر پرویز صاحب نے ان تمام واقعات کو عقل کے معیار پر پورا کرنے کے لیے ان کی توجیہ کی۔ اور عیسٰیؑ کے والد کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور انجیل کے حوالوں سے ان کا نام "یوسف" بتایا۔ آیئے پہلے پرویز صاحب کا نقطۂ نظر تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

☆ فَتَقَبَّلَھَا رَبُّھَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَھَا نَبَاتًا حَسَنًا لا وَّکَفَّلَھَا زَکَرِیَّا طکُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْھَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ لا وَجَدَ عِنْدَھَا رِزْقًاج قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا ط قَالَتْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ طاِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۵ (3/37)

''سو اس کے رب نے، اس کی منت کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور مریمؑ کی پرورش کا نہایت عمدہ انتظام کر دیا۔ یعنی اسے زکریاؑ (جیسے نیک انسان) کی کفالت میں دے دیا۔ مریمؑ اپنے زہد و ریاضت کی بنا پر اس درجہ مرجع انام بن گئی کہ اس کے پاس نذر و نیاز کی چیزیں آنی شروع ہو گئیں۔ چنانچہ جب کبھی زکریاؑ عبادت گاہ (قربان گاہ) میں آتا تو مریمؑ کے پاس کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھتا۔ وہ (بر بنائے احتیاط) اس سے پوچھتا کہ اے مریمؑ! تجھے یہ چیزیں کہاں سے ملتی ہیں۔ (کیونکہ اس کی کفالت تو زکریاؑ کے ذمے تھی) وہ اس کے جواب میں کہہ دیتیں کہ (انہیں یہ چیزیں ہیکل کا کوئی آدمی نہیں دیتا بلکہ) یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں۔ (یعنی جو لوگ اللہ کی نذریں مانتے ہیں۔ وہ دے جاتے ہیں) اللہ اپنی مشیت کے پیمانوں کے مطابق اس طرح رزق کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ جو عام طور پر لوگوں کے خیال میں نہیں ہوتا۔ (مریم کا مقبول خلائق ہو جانا اس کا ذریعہ بنا)۔ (شعلہء مستور۔30)

☆ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنۡهُ ق لا اسۡمُهُ الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۵ لا وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۵ (3/45-46)

''اسی سلسلہ میں ملائکہ نے مریمؑ سے کہا تھا کہ خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے۔ یعنی ایک بیٹے کی جس کا نام مسیحؑ (اور) عیسٰی ابن مریم ہو گا۔ دنیا میں صاحب وجاہت اور آخرت میں خدا کے مقربین میں سے۔''

تندرست و توانا، چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا اور پختہ عمر تک پہنچنے والا (5/110) نہایت عمدہ صلاحیتوں کا مالک، پاکباز انسان۔ (اس سے توہمات کا دور کرنا مقصود تھا جو ایک راہبہ کے دل میں اس خیال سے پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ، خانقاہیت کی شریعت کے علی الرغم، متاہل زندگی اختیار کر رہی ہے۔ اس سے کہیں وہ یا اس کا بچہ، کسی آفت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بعض اوقات اس قسم کے توہمات کا ایسا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ سچ مچ ایسا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے دل سے ان خیالات کا دور کرنا ضروری تھا۔

☆قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ط قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۵(47/3)

اس پر مریمؑ نے (زکریاؑ کی طرح 40/3) تعجب سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں ایک کنواری راہبہ ہوں۔ راہبہ کے ہاں اولاد کا کیا سوال؟ اس کے جواب میں اس سے وہی کچھ کہا گیا جو زکریاؑ سے کہا تھا کہ یہ خدا کے اس قانون مشیت کے مطابق ہو گا جس کی رو سے عام تخلیق ہوتی ہے وہ قانون جو اس اصول پر مبنی ہے کہ خدا جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس اسکیم کا آغاز ہو جاتا ہے۔(117/2)

☆وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ مَرْيَمَ م اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا۵لا فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا قف فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۵(19/16-17)

”اے رسولؐ! اب تو اس کتاب (قرآن) میں لوگوں سے، مریمؑ کا قصہ بیان کر، اور سلسلہ کلام کا آغاز اس وقت سے کر جب وہ خانقاہیت کی زندگی کو چھوڑ کر، (اپنے گائوں، ناصرہ) میں چلی گئی تھی جو (وہاں سے) مشرق کی سمت واقع تھا۔“

(خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آئند واقعات نے اس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ) وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ہم نے (ان اثرات کو مٹانے کے لئے، اسے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کے متعلق) تقویت بخش اشارہ کیا (جو اس کے خواب میں) ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

(شعلہء مستور 32-34)

آیت نمبر (19/17) میں ”فَتَمَثَّلَ لَهَا“ آیا ہے عربی لغت منتھی الارب میں اس کے ایک معنی ”داستان زدن“ بھی بیان ہوئے ہیں۔ یعنی کیفیت بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مفہوم یہ ہو گا۔ کہ اس پیغام رساں نے مریم سے اس کے ہاں ہونے والے تندرست و توانا بچے کی کیفیت بیان کی۔

دوسرے مقام پر اس آنے والے کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ ملک تھا(3/44)اور ملائکہ کسی کو نظر نہیں آیا کرتے(9/26)اگرچہ ان کا نزول مؤمنین پر بھی ہوتا ہے(41/30)اس لئے اگر وہ پیغام رساں "فرشتہ" تھا تو وہ حضرت مریمؑ کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا یہ واقعہ خواب کا ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ نظر آیا تھا تو کوئی انسان پیغام رساں ہو سکتا ہے۔ خود لفظ ملک کے معنی پیغام رساں بھی ہیں۔(شعلہء مستور 34)

☆قَالَتْ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا۝ (19/18)

" مریمؑ اسے دیکھ کر (گھبرا گئی وہ) بولی، اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔"

اس آنے والے نے جواب دیا۔

☆قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ق صلے لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا۝ (19/19)

"اس نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں تو تیرے پروردگار کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں (3/44)اور وہ پیغام یہ ہے کہ وہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کرے گا۔"

اس پر حضرت مریمؑ نے کہا۔

☆قَالَتْ اَنّٰى یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِیًّا۝ (19/20)

"اس پر مریمؑ نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ جب تک میں ہیکل میں رہی، پاکباز راہبہ کی زندگی بسر کی۔ وہاں کسی انسان نے مجھے چھوا تک نہیں۔ وہاں سے نکلی ہوں تو میں نے شادی نہیں کی۔ کیونکہ یہ چیز ضابطہء خانقاہیت کے خلاف ہے۔(19/30:28/46)"

اور اللہ کے فرستادہ نے جواب دیا۔

☆قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا٥ (19/21)

"اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قانون تخلیق کے مطابق ہی ہوگا۔(3/46) یہ اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں (کہ جو موانعات تیرے ذہن میں ہیں اور تمہیں اس طرح پریشان کر رہے ہیں، انہیں دور کر دے(19/9) خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہوگا۔ وہ ہماری طرف سے لوگوں کے لئے، موجب رحمت اور حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی ہوگی۔(جو شخص اس کی نبوت پر ایمان لائے گا۔وہ حق پر سمجھا جائے گا جو اس سے انکار کرے گا وہ باطل پر ہوگا)۔ اور یہ بات طے شدہ ہے (کہ وہ بچہ ہمارا پیغمبر بنے گا) (3/47)

اس کے بعد ارشاد ہے۔

☆فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ٥ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا٥(19/22-23)

"(چنانچہ رفتہ رفتہ وہ موانع دور ہوتے گئے۔ ادھر مریمؑ کے دل سے خانقاہیت کی غلط رسم کی خلاف ورزی کا خوف دور ہوگیا۔ ادھر ایک شخص، ہیکل کے احبار ورہبان کی تنبیہ و تخویف کے باوجود مریمؑ کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہوگیا۔) مریمؑ کو ہونے والے بچے کا حمل قرار پاگیا۔ اس پر ان دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ گاؤں سے کہیں دور چلے جائیں (تاکہ بچے کی ولادت کسی ایسی جگہ ہو جہاں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو، اور یوں وہ، احبار ورہبان کے طعن و تشنیع کے نشتروں سے محفوظ رہیں۔)

وضع حمل کا وقت آیا تو درد زہ کا اضطراب، مریمؑ کو ایک کھجور کے درخت کی طرف لے گیا۔ (آئین خانقاہیت کے خلاف متاہل زندگی۔ پہلے بچے کی ولادت۔ پردیس کا معاملہ، بے سروسامانی کا یہ عالم کہ سر پر چھت

تک بھی نہیں۔ مریمؑ گھبرا گئی اور کہنے لگی کہ) اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بالکل بھولی بسری ہو چکی ہوتی۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا کے ایک مختصر سے ٹکڑے میں جذبات و احساسات کی ایک پوری دنیائے نسائیت کو کس نادرہ کاری سے سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

حضرت مریمؑ کی اس قلبی کاوش کی تسکین کے لئے ارشاد ہوا۔

☆ فَنَادٰىھَا مِنْ تَحْتِھَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّکِ تَحْتَکِ سَرِیًّا٥ (19/24)

)اس کرب و یاس کے عالم میں اسے، اس مقام کے)نشیب کی طرف سے آواز آئی کہ اے مریمؑ! گھبراؤ نہیں، اس طرف ایک (خوشگوار) پانی کی ندی ہے۔ (اور اوپر، کھجور کے درخت میں پکی ہوئی کھجوروں کے خوشے لٹک رہے ہیں۔)

اور طبعی کرب و اضطراب کے لئے۔

☆ وَھُزِّیْٓ اِلَیْکِ بِجِذْعِ النَّخْلَۃِ تُسٰقِطْ عَلَیْکِ رُطَبًا جَنِیًّا٥ ز (19/25)

"تو کھجور کے درخت کا تنا پکڑ کے اپنی طرف ہلا۔ تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے۔"

ان حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ظہور میں آئی، حضرت مریمؑ سے کہا گیا کہ

☆ فَکُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ج فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا الا فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا٥ ج (19/26)

"تو ان تازہ کھجوروں کو کھا۔ ندی کا ٹھنڈا پانی پی۔ (پھر بچے کے نظارے سے) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ (باقی رہا تیرا یہ اضطراب کہ لوگوں کی باتوں کا کیا جواب دوں گی۔ تو تم منت کا روزہ رکھ لینا) اور اگر کوئی آدمی تجھ سے کچھ

پوچھے تو اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمن کے لئے اپنے اوپر روزہ واجب کر رکھا ہے۔ اس لئے میں آج کسی شخص سے بات چیت نہیں کر سکتی۔

یعنی اللہ تعالی کی بخشش و عنایت کے لئے بطور تشکر و امتنان روزہ رکھا۔ (جیسا کہ حضرت زکریاؑ کے تذکرہ میں لکھا جا چکا ہے۔ یہودیوں کے ہاں روزہ کی حالت میں بات چیت نہیں کی جاتی تھی۔) (شعلہ ء مستور 34-37)

آپ اندازہ لگائیے کہ اس سے ان مقدسین طائفہ کے دل پر کیا گزرتی ہو گی؟ انہیں پہلے (حضرت) مریمؑ کے خلاف شکایت تھی کہ اس نے رسوم خانقاہی کو اس طرح سے توڑا۔ اس کے بعد یہ زخم کاری کہ اس کے ہاں جو بیٹا پیدا ہوا وہ اس انداز کا! یہ ہے وہ پس منظر جس میں قرآن نے کہا ہے کہ

☆ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ج ۵ صلے (19/28)

"وہ اس سے کہتے کہ اے اخت ہارونؑ! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا۔ نہ ہی تیری ماں نے ہیکل کے قوانین و ضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ (تم تو ایک شریف، مذہب پرست، پابند شریعت گھرانے کی لڑکی تھیں۔ تم نے یہ کیا کیا اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی؟)

یعنی انہوں نے کہا "تمہارا گھرانہ بڑا مذہب پرست تھا۔ تیرے ماں باپ، خانقاہ کے آئین و ضوابط کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ ان کے دل میں ان مقدس قوانین و دساتیر کی بڑی عظمت تھی۔ تیری ماں نے تجھے ہیکل کی نذر کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر عقیدت مندی اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن تو نے ان تمام آئین و ضوابط کو توڑ کر ہیکل کی عظمت کو برباد کر دیا۔ اپنے ماں باپ کی عقیدت مندی کو خاک میں ملا دیا۔ خانقاہ میں راہبہ بنی تھی تو ضبط نفس کے انداز بھی سیکھتی۔ اگر اس طرح کی (متاہل) زندگی بسر کرنی تھی تو خانقاہ میں معتکف کیوں ہوئی تھی؟ یہ تو رہی تمہاری اپنی حالت۔ اس کے بعد تو نے جو بچہ جنا اس کی حالت یہ ہے کہ وہ قوم کے ایسے واجب الاحترام بزرگوں

کے ساتھ ایسی گستاخی سے پیش آتا ہے۔ اور ہیکل کے آئین و رسوم کے خلاف اس جرأت سے لب کشائی کرتا ہے؟ بالآخر تمہارا اور تمہارے اس بچے کا مطلب کیا ہے؟ کیا تمہارے دل میں ہیکل اور اپنے آبائو اجداد کے مذہب کا کچھ احترام باقی نہیں رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب ذرا تصور میں لایئے اس الم انگیز واقعہ کو قوم کے بڑے بوڑھے خانقاہ کے عمائد اور اراکین اس طرح بپھرے ہوئے درندوں کی طرح چاروں طرف سے امڈ پڑے ہیں اور ان کے درمیان حضرت مریمؑ ساکت و صامت کھڑی ہیں۔ ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہے لیکن وجہ تشنیع وہ واقعہ ہے جو اللہ کی مشیت کے ماتحت، اس حکم کے مطابق ایک طے شدہ فیصلہ (اَمْرًا مَّقْضِیًّا) کو پورا کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ یعنی مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ شریعت کے خلاف عملی احتجاج۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کے بیٹے کے خلاف بھی اس قسم کے غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت مریمؑ سے بار بار اصرار کیا کہ بتائو کہ یہ سارا ماجرا کیا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ وہ خود کچھ جواب دیتیں۔ انہوں نے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا کہ اس سے پوچھو۔ یہ تمہارے اعتراضات کا جواب دے گا۔ (یہ ساری گفتگو پرویز صاحب کی خود وضع کردہ ہے قرآن میں یا تاریخ اور انجیل وغیرہ میں بھی اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ مصنف)

☆فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ ط(19/29)

اس جواب پر ان کے غصہ کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے جوش غضب سے کہا کہ تم کیا کہتی ہو؟ سوال ہم نے تم سے کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کا کوئی جواب دو۔ ہمیں کہہ رہی ہو کہ ہم اس بچے سے پوچھیں؟ تم نے اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا کہ اس سے تم نے ہماری کس قدر توہین کی ہے؟

☆قَالُوْا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا ٥ (19/29)

انہوں نے کہا بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی کل تک جھولے میں تھا۔

آپ دیکھئے کہ ان کے اس جواب میں کتنا گہرا طنز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو بچہ ابھی کل ہمارے ہاتھوں میں پیدا ہوا، اس سے ہم کیا بات کریں؟ حضرت عیسیٰؑ نے ان کی اس بات کو قابل اعتناء نہ سمجھا اور خود ہی جواب دیا کہ

☆قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ط قف اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا٥لا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ص وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا٥لا وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِیْ ز وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا٥ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا٥(19/30-33)

اس پر عیسیٰؑ ان سے کہتے کہ (یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے کہ چونکہ تم عمر میں بڑے ہو اس لئے تمہاری ہر بات کو سند تسلیم کیا جائے اور میں عمر میں چھوٹا ہوں اس لئے تم مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے بگوش ہوش سنو) میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور منصب نبوت پر سرفراز فرمایا ہے۔ اس نے مجھے زندگی کے ہر گوشے میں بابرکت بنایا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں (تمہاری خودساختہ شریعت کی جگہ) صلوۃ و زکوۃ کا صحیح نظام قائم کروں۔ اور عمر بھر میرا یہی شعار ہے۔ (تم میری والدہ کے خلاف اس طرح زبان درازی کرتے ہو؟ اس نے جو کچھ کیا ہے خدا کی سچی شریعت کے عین مطابق کیا ہے۔ اس لئے) میں اس سے ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آئوں گا۔ میں (معاذاللہ) ایسا شقی و بدبخت نہیں، کہ (تمہارے پیچھے لگ کر ایک بے گناہ خاتون سے سختی سے پیش آئوں۔)

تم میری پیدائش کو بھی قابل اعتراض قرار دیتے ہو! یہ تمہاری خودساختہ شریعت کا فیصلہ ہے۔ میں جس خدا کا پیغام لیکر آیا ہوں، اس کے نزدیک) میری پیدائش بھی سلامتی کی مظہر ہے۔ میری ساری زندگی، آخری دم تک، سلامتی کی حامل ہو گی۔ اور حیات اخروی میں بھی میں امن و سلامتی میں ہوں گا۔

اس جواب پر غور کیجئے۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی پیدائش سے متعلق ایک حرف تک نہیں کہا۔ اس لئے کہ سوال (کسی غیر معمولی طور پر) پیدائش کا نہیں تھا بلکہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت مریمؑ نے رسم ورہ خانقہی چھوڑ کر عائلی زندگی کیوں اختیار کی! اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنی نبوت اور کتاب کی طرف

اشارہ کر کے یہ بتا دیا کہ اس حقیقت کو اللہ تعالی خوب جانتا ہے کہ ان رسوم خانقہیت کو دین خداوندی سے کیا تعلق ہے؟ یہ سب تمہاری اختراعات ہیں انہیں اس دین سے کچھ واسطہ نہیں۔ جس کے تم مدعی بنے بیٹھے ہو۔ لیکن جسے تم نے در حقیقت کچھ کا کچھ بنا رکھا ہے۔ اس لیے حضرت مریمؑ نے متاہل کی زندگی اختیار کرنے میں کوئی گناہ نہیں کیا۔ لہذا میں انہیں مورد الزام قرار نہیں دیتا۔ یہ تمہاری شقاوت اور قساوت قلبی ہے جو ایک عفیفہ کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لے رہے ہو۔ میں تو ایسا شقی القلب نہیں ہو سکتا۔ یقیناوہ حسن سلوک کی مستحق ہے۔ اور اس کے ساتھ میرا سلوک ایسا ہی ہو گا۔ وَبَرًّا مبِوَالِدَتِیْ۔ (شعلہ ءمستور 117-120)

یہ تھا پیدائش عیسیٰؑ کے بارے میں پرویز صاحب کا نقطۂ نظر۔ اب عیسیٰؑ سے متعلق ان کے مزید کچھ تصورات دیکھتے ہیں

بینات و معجزات۔ یہاں ''بینات'' سے مراد وہ دلائل روشن و براہین محکم ہیں جو بذریعہ وحی آپ کو دیئے گئے اور جو یکسر حکمت و بصیرت پر مبنی تھے۔ باقی رہے ''معجزات'' سو ان کے متعلق سورۂ آل عمران میں ہے کہ حضرت مریمؑ سے کہا گیا کہ تیرا بیٹا جب منصب رسالت پر فائز ہو گا تو وہ بنی اسرائیل جیسی مردہ قوم سے کہے گا کہ

☆اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ لا اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا مبِاِذْنِ اللّٰہِ وَ اُبْرِیُٔ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ لا فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۵ ج

(49/110:3/5)

''میں، اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیات نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر، فضا کی بلندیوں میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے، اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی(176/7)

یہ آسمانی روشنی، تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی "جس پر تروتازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ پھر سے سرسبز و شاداب ہو جائے گی۔ تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی۔ جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔

مختصراً یہ کہ ذلت و خواری کی وہ موت، جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھارہی ہے (3/111) ایک نئی زندگی میں بدل جائے گی (6/123)

میں، (تمہارے موجودہ نظام سرمایہ داری کی جگہ) ایسا نظام قائم کروں گا۔ جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصرف میں لاتے ہو اور کس قدر ذخیرہ (Hoarding) کرتے ہو، کہ اس سے ناجائز منافع کمایا جائے۔

اس قانون اور نظام میں تمہارے لئے باز آفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے بشرطیکہ تم اس کی صداقت پر یقین کر لو۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں ایسینی سے طبابت اور قوت ارادی کے عملیات وغیرہ میں بڑی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ خدمت خلق ان کا مسلک تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ مقبول تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰؑ اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لئے بھیجتے تھے تو انہیں تاکید کرتے تھے کہ "بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جِلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا، بدروحوں کو نکالنا، اور ان تمام خدمات کے معاوضہ میں کچھ نہ لینا۔ تم نے مفت پایا ہے مفت دینا" (متی 10/8) ظاہر ہے کہ قریہ قریہ بستی بستی اللہ کا پیغام پہنچانے والوں کے لئے، اپنے زمانہ اور ماحول کے تقاضوں کے اعتبار سے، اس سے بہتر طریق کار، اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جب ان شاگردوں میں علاج معالجہ وغیرہ کی یہ خصوصیات تھیں تو جو لوگ خود حضرت عیسیٰؑ کے پاس

آتے ہونگے۔ وہ اس باب میں بہت بڑی توقعات لے کر آتے ہوں گے۔ اور ان کی یہ توقعات پوری بھی ہوتی ہو نگی۔ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلاً معراج انسانیت میں لکھا گیا ہے۔ وہاں منجملہ دیگر امور، یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ معجزات کے متعلق گفتگو اب ایک تاریخی بحث ہے۔ اس لئے کہ خود نبی اکرمؐ کو (قرآن کے علاوہ) کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ اور حضورؐ کے بعد سلسلہء نبوت ہی ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو معجزہ ملنے یا نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک سابقہ انبیائے کرامؑ کا تعلق ہے۔ ایک گروہ معجزات کے متعلق قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر محمول کرتا ہے۔ اس لئے معجزات کو حسی معجزات سمجھتا ہے۔ لیکن دوسرا گروہ ان الفاظ کے مجازی معانی لیتا ہے۔ اور ان سے متعلق بیان کو استعارہ سمجھتا ہے۔ میں نے ان الفاظ کے مجازی معانی لئے ہیں اور انہی کے مطابق ''مفہوم القرآن'' میں بیان کردہ مفہوم، مندرجہ بالا آیات کے نیچے درج کیا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے حضرت عیسٰیؑ کے معجزات سے مراد ان کے آسمانی پیغام کی اعجاز نمائی ہے۔ جو مردوں کی بستی میں صوراسرافیل پھونک دیتا ہے۔ (قرآن نے اکثر مقامات پر غلط روش پر چلنے والوں کو مردے اور آسمانی آواز پر لبیک کہنے والوں کو زندہ انسان کہا ہے وہ بے بال وپر، کمزور وضعیف انسانوں کو بازوئے شاہین عطا کر دیتا ہے۔ (كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ) جس سے وہ عروج واقبال کی فضاؤں میں اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ وہ انقلابی پیغام ان نیم مردہ (لیکن زندگی کی آرزو رکھنے والوں) سے اعلانیہ کہتا ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری! اگر مشت پرے داری

بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را

وہ آنکھوں پر سے جہل و تعصب کے ظلمت انگیز پردے اٹھا کر نور بصیرت عطا کرتا ہے۔ وہ ان کے قلوب کے امراض کو شفا بخشتا ہے۔ اور اس طرح ایک پیکر آب و گل کو جیتے جاگتے، تندرست و توانا انسان کی شگفتہ وشاداب صورت عطا کر دیتا ہے۔

باقی رہا وَاُ نَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ (3/49)

اس سے یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں وہ احکام خداوندی بیان کروں گا۔ جن سے واضح ہو جائے کہ کن کن چیزوں کا ذخیرہ رکھنا جائز ہے۔ اور کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن میں احتکار و اکتناز جائز نہیں۔

(شعلہء مستور 66-69)

مائدہ کے معنی۔ خدا کے مخلص بندوں کی اس جماعت نے جب اپنے آپ کو اس مقصد کی خاطر یوں وقف کر دیا تو اللہ تعالی نے ان کی معیشت کا ایسا انتظام فرمادیا کہ اس کی فکر ان کی تگ و تاز اور سعی و عمل کی راہ میں دامن گیر نہ ہو۔

☆ اِذۡ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ یٰعِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ هَلۡ یَسۡتَطِیۡعُ رَبُّکَ اَنۡ یُّنَزِّلَ عَلَیۡنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ قَالُوۡا نُرِیۡدُ اَنۡ نَّاۡکُلَ مِنۡهَا وَ تَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا وَ نَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ صَدَقۡتَنَا وَ نَکُوۡنَ عَلَیۡهَا مِنَ الشّٰهِدِیۡنَ ۝ (5/112-113)

اس کے بعد اس جماعت مومنین نے تم سے کہا تھا کہ کیا ہمارا نشو ونماد دینے والا ہماری اس آرزو کو پورا کر دے گا کہ ہم معاش کے لئے انفرادی سہاروں کے محتاج نہ رہیں۔ اور ہمارے لئے سامان نشو و نما خدا کے نظام ربوبیت سے ملا کرے۔ یعنی معیشت کے موجودہ "ارضی نظام" کی جگہ "سماوی نظام" قائم ہو جائے۔ اس کے جواب میں تم نے ان سے کہا تھا کہ جب تم نظام خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں چاہئے کہ تم اس کے قوانین کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ جب تم ایسا کرو گے تو اس کا وہ نظام قائم ہو جائے گا۔ جس میں رزق کی ذمہ داری خود نظام کے سر ہو گی۔ افراد پر نہیں ہو گی۔

انہوں نے کہا کہ ہماری تو دلی خواہش ہے کہ ہم بلامنت غیرے۔ نظام ربوبیت ہی سے رزق حاصل کریں تاکہ اس طرف سے ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے، اور ہمیں یقین آجائے کہ جو کچھ تو ہم سے کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ اور ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اسکی شہادت دیں۔

"مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" کے معنی یہ نہیں کہ اوپر سے کوئی چنا چنایا خوان اترتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے انتظام ہوا تھا۔ یا جیسا نظام ربوبیت کی رو سے ہوتا ہے۔ اسی قسم کا انتظام اس جماعت مومنین کے لیے کیا گیا تھا۔

☆قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۵ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۵ (5/114-115)

اس پر تم نے (اے عیسیٰ) ہمارے حضور التجا کی تھی کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشو و نما کا سامان، نظام ربوبیت کی رو سے عطا ہو جائے تاکہ یہ چیز، اس جماعت کے السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (سب سے پہلے ایمان لانے والوں) کے لئے بھی جشن مسرت کا موجب ہو، اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔ نیز یہ، میرے قانون کی صداقت کی عملی نشانی بن جائے۔ تو ہمیں اس طرح سامان زیست عطا فرما۔ اس لئے کہ جو رزق تیرے نظام کی رو سے ملے وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے جو انسانوں کی وساطت سے حاصل ہو۔ (انسانوں کے ہاتھ سے ملنے والے رزق سے تو پرواز میں سخت کوتاہی آجاتی ہے۔۔۔۔ اس رزق سے تو موت اچھی ہے۔) اس پر ہم نے کہا تھا کہ ہم تمہارے رزق کا اسی طرح انتظام کر دیں گے۔ لیکن اپنے متبعین سے کہہ دو کہ اگر تم نے اس نظام کی صحیح صحیح قدردانی نہ کی اور جن بنیادوں پر اسے قائم کیا گیا ہے۔ تم ان سے پھر گئے تو اس کی ایسی سخت سزا ملے گی جو دنیا میں کسی اور قوم کو نہ ملی ہو۔ (شعلہء مستور 52-54)

یہ تھا عیسیٰؑ کے بارے میں پرویز صاحب کا تصور۔ اب ہم قرآنی آیات کی رو سے اس کا جائزہ لیں گے۔ سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں، پیدائش مسیحؑ کو۔

ا۔ پیدائش مسیحؑ۔ قرآن کریم نے انہیں بن باپ کے خدا کی قدرت کاملہ سے پیدا ہونے کا بتایا ہے۔ مگر پرویز صاحب اس چیز کو ماننے سے انکاری ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ حضرت مریمؑ نے ہیکل کی زندگی ترک کر کے ''یوسف'' نامی شخص سے شادی کی تھی۔ اس طرح انہوں نے عیسیٰؑ کا باپ زبردستی سے بنایا۔ کیونکہ بن باپ کے پیدائش مروجہ قاعدہ و قانون کے خلاف تھی۔ آیئے ہم پہلے قرآن کریم کی وہ آیات درج کرتے ہیں جہاں عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے۔

ایک بات قابل غور ہے کہ سورۂ ال عمران اور سورۂ مریم میں عیسیٰؑ کی پیدائش کے ساتھ ہی یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے اور حضرت زکریاؑ کی دعا کا بھی ذکر ہے۔ اس لیے ہم ان آیات کو بھی ساتھ ہی درج کریں گے۔

☆ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (ال عمران 3/38-41)

''وہیں زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی، کہا اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔ پس فرشتوں نے اسے آواز دی جب کہ وہ حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ اللہ تعالی تجھے یحییٰؑ کی یقینی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ تعالی کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا، سردار، عورتوں سے بے رغبت اور نبی ہے۔ نیک لوگوں میں سے۔ کہنے لگے اے میرے رب میرے ہاں بچہ کیسے ہو گا؟ میں بالکل

بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرمایا! اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔ کہنے لگے پروردگار میرے لیے اس کی کوئی نشانی مقرر کر دے۔ فرمایا! نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تو لوگوں سے بات نہ کر سکے گا۔ صرف اشارے سے سمجھائے گا اور اپنے رب کا ذکر کثرت سے کر اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرتا رہ۔"

☆اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ق لا اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ٥ لا وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ٥ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ط قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ٥ (3/45-47)

"جب فرشتوں نے کہا اے مریمؑ! اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمے کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح بن مریمؑ ہے۔ جو دنیا اور آخرت میں ذی عزت ہے۔ اور وہ میرے مقربین میں سے ہے۔ وہ لوگوں سے اپنے گہوارے میں باتیں کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی اور وہ نیک لوگوں میں سے ہو گا۔ کہنے لگیں الٰہی! مجھے لڑکا کیسے ہو گا؟ حالانکہ مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ فرشتے نے کہا اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہے پیدا کرتا ہے۔ جب کبھی وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔"

اب یہاں غور کیجئے دونوں جگہ یعنی حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے معاملہ میں ایک ہی طرح کی بشارت دی گئی ہے۔ اور دونوں طرف سے ایک ہی حیرت کا جواب ہے " اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلَامٌ " یعنی لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ مروجہ قاعدہ اور قانون تو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک طرف عمر گزر چکی ہے اور دوسری طرف کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا۔ مگر دونوں طرف ایک ہی طرح کا جواب دیا گیا۔ " كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ " یعنی اللہ جو چاہے سو پیدا کرتا ہے۔ اس کو تو کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے تو صرف " كُنْ " کہہ دینا ہے۔

اب دیکھتے ہیں یہی واقعات سورئہ مریم میں۔

☆ کٓھٰیٰعٓصٓ ۝ ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّآ ۝ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْ مبِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا ۝ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا ۝ لا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ق وَاجْعَلْہُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُہٗ یَحْیٰی لا لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا ۝ قَالَ کَذٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَۃً ط قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝ فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓی اِلَیْھِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا ۝ یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ ط وَاٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ۝ لا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً ط وَکَانَ تَقِیًّا ۝ لا وَّبَرًّا مبِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ۝

(مریم 19/ 1-15)

"کھیعص۔ یہ ہے تیرے پروردگار کی مہربانی کا ذکر جو اس نے اپنے بندے زکریاؑ پر کی تھی۔ جب کہ اس نے اپنے رب سے خفیہ دعا کی تھی۔ کہ اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور سر بڑھاپے کی وجہ سے بھڑک اٹھا ہے۔ لیکن میں کبھی بھی تجھ سے دعا کر کے محروم نہیں رہا۔ مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے قرابت داروں کا ڈر ہے۔ میری بیوی بھی بانجھ ہے پس تو مجھے اپنے پاس سے وارث عطا فرما۔ جو میرا بھی وارث ہو اور یعقوبؑ کے خاندان کا بھی جانشین اور میرے رب تو اسے مقبول بندہ بنالے۔ اے زکریاؑ ہم تجھے ایک بچے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰؑ ہے ہم نے اس سے پہلے اس کا ہم نام بھی کسی کو نہیں کیا۔ زکریاؑ کہنے لگے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہو گا، میری بیوی بانجھ اور میں خود بڑھاپے کے انتہائی ضعف کو پہنچ چکا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ اسی طرح ہی ہو گا۔ تیرے رب نے فرمادیا ہے کہ مجھ پر تو یہ بالکل آسان ہے اور خود جب کہ تو کچھ نہ تھا اس سے پہلے، میں تجھے پیدا کر چکا ہوں۔ کہنے لگے میرے پروردگار میرے لیے کوئی علامت مقرر فرمادے، ارشاد ہوا کہ تیرے لیے علامت یہ ہے کہ تو مت بات کر تین رات تک۔ اب زکریاؑ اپنے حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آگئے تو ہم نے وحی کی کہ تم صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرو۔ اے یحییٰؑ میری کتاب کو مضبوطی سے تھام لے اور

ہم نے اسے لڑکپن ہی سے دانائی عطا فرمادی۔ اور اپنے پاس سے شفقت اور پاکیزگی بھی، وہ پرہیزگار شخص تھا۔ اور اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرنے والا تھا اور سرکش اور گنہ گار نہ تھا۔ اور اس پر سلام ہے جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ وفات پائے اور جس دن وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے۔"

یہاں بھی اسی چیز کا اظہار ہے کہ میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا، میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ یہ حیران کن سوال اسی لیے ہے کہ کوئی چیز قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہو رہی۔ لیکن اس کا جواب بھی ملاحظہ فرمائیے۔ " قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئاً " کہہ دیا ہے تیرے رب نے کہ وہ میرے لیے بہت آسان ہے اور اس سے پہلے بھی میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جبکہ تو کوئی شے نہیں تھا۔" اب یہ جواب ہی ایسا ہے کہ اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جو رب، جب کائنات میں کچھ نہیں تھا اور انسان بھی نہیں تھا اس وقت بغیر کسی وسیلہ (Nothing) سے یہ کائنات اور انسان کی تخلیق کر سکتا ہے تو اب اس کے لیے کیا مشکل ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کریم نے ایک اور مقام پر " وَاَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ " کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ہم نے زکریاؑ کی بیوی سے بانجھ کا نقص دور کر دیا۔ اب پرویز صاحب اور متبعین پرویز یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل قاعدے اور قانون کے مطابق ہوا ہے۔ اس لیے اس واقعہ میں کوئی بھی معجزانہ بات نہ ہوئی۔ حالانکہ اس آیت میں بھی صرف بیوی کے نقص کے دور کرنے کا ذکر ہے حضرت زکریاؑ کے بڑھاپے کا اور ضعف کا کیا علاج؟ یہ نہیں بتایا؟ اگر ایسا قاعدہ اور قانون روا رکھنا ہی مقصود ہوتا تو اللہ واضح انداز میں کہہ دیتا۔ کہ "ہم تیری بیوی کا علاج کر دیں گے اور تجھے بڑھاپے میں قوت پہنچا دیں گے۔" اور اگر ایسا ہو بھی جاتا تو پھر بھی تو یہ معجزہ ہی ہے کہ ایسا طریقہ کار صرف ایک فرد کے لیے کیوں اختیار کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ قاعدہ اور قانون تو پوری نوع کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ نے یہاں یہ جواب ہی نہیں دیا۔ بلکہ یہی کہا کہ " قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئاً "

اب آگے چلتے ہیں۔ مریمؑ کے بارے میں اس سے اگلی آیت ہی سے واقعہ شروع ہوتا ہے

☆وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مَرۡیَمَ م اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَہۡلِہَا مَکَانًا شَرۡقِیًّا ۵لا فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِہِمۡ حِجَابًا قف فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِیًّا ۵ قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡکَ اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا ۵ قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّکِ ق صلے لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا ۵ قَالَتۡ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ وَّ لَمۡ اَکُ بَغِیًّا ۵ قَالَ کَذٰلِکِ قَالَ رَبُّکِ ہُوَ عَلَیَّ ہَیِّنٌ وَلِنَجۡعَلَہٗۤ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَۃً مِّنَّا ج وَکَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِیًّا ۵ فَحَمَلَتۡہُ فَانۡتَبَذَتۡ بِہٖ مَکَانًا قَصِیًّا ۵ فَاَجَآءَہَا الۡمَخَاضُ اِلٰی جِذۡعِ النَّخۡلَۃِ ج قَالَتۡ یٰلَیۡتَنِیۡ مِتُّ قَبۡلَ ہٰذَا وَ کُنۡتُ نَسۡیًا مَّنۡسِیًّا ۵ فَنَادٰىہَا مِنۡ تَحۡتِہَاۤ اَلَّا تَحۡزَنِیۡ قَدۡ جَعَلَ رَبُّکِ تَحۡتَکِ سَرِیًّا ۵ وَ ہُزِّیۡۤ اِلَیۡکِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَۃِ تُسٰقِطۡ عَلَیۡکِ رُطَبًا جَنِیًّا ۵ز فَکُلِیۡ وَ اشۡرَبِیۡ وَ قَرِّیۡ عَیۡنًا ج فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا لا فَقُوۡلِیۡۤ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُکَلِّمَ الۡیَوۡمَ اِنۡسِیًّا ۵ ج فَاَتَتۡ بِہٖ قَوۡمَہَا تَحۡمِلُہٗ ط قَالُوۡا یٰمَرۡیَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَیۡئًا فَرِیًّا ۵ یٰۤاُخۡتَ ہٰرُوۡنَ مَا کَانَ اَبُوۡکِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّ مَا کَانَتۡ اُمُّکِ بَغِیًّا ج ۵ صلے فَاَشَارَتۡ اِلَیۡہِ ط قَالُوۡا کَیۡفَ نُکَلِّمُ مَنۡ کَانَ فِی الۡمَہۡدِ صَبِیًّا ۵ قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ط قف اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ۵لا وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ص وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ۵لا وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ز وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ۵ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ یَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا ۵ ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ج قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ ۵ مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنۡ یَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ لا سُبۡحٰنَہٗ ط اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۵ ط (مریم19/16-35)

"اس کتاب میں مریمؑ کا واقعہ بھی بیان کر۔ جب کہ وہ اپنے گھر کے لوگوں سے علیحدہ ہو کر ایک مشرقی مکان میں آئیں۔ اور ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا۔ پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا۔ پس وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔ یہ کہنے لگیں میں تجھ سے رحمن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو کچھ بھی اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا قاصد ہوں تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دینے آیا ہوں۔ کہنے لگیں بھلا میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے تو کسی انسان کا ہاتھ تک نہیں لگا اور نہ میں بدکار ہوں۔ اس نے کہا بات تو یہی ہے۔ لیکن تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ وہ مجھ پر بہت ہی آسان ہے۔ ہم تو اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں گے اور اپنی خاص رحمت، یہ تو ایک طے شدہ بات ہے۔ پس وہ حمل سے ہو گئیں اور اسی وجہ سے یکسو ہو کر ایک دور کی جگہ چلی گئیں۔ پھر دردِ زہ اسے ایک کھجور کے تنے کے نیچے لے آیا اور بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ کاش

میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور لوگوں کی یاد سے بھولی بسری ہو جاتی۔ اتنے میں اسے نیچے سے آواز دی کہ آزردہ خاطر نہ ہو۔ تیرے رب نے تیرے پاؤں تلے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ اور اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، یہ تیرے سامنے تر و تازہ پکی کھجوریں گرا دے گا۔ اب چین سے کھا پی اور آنکھیں ٹھنڈی رکھ۔ اگر تجھے کوئی انسان نظر آجائے تو کہہ دینا کہ میں نے اللہ رحمن کے نام کا روزہ مان رکھا ہے۔ میں آج کسی شخص سے بات نہ کروں گی۔ اب حضرت عیسیٰؑ کو لیے ہوئے وہ اپنی قوم کے پاس آئیں۔ سب کہنے لگے مریمؑ تو نے بڑی بری حرکت کی ہے۔ اے ہارونؑ کی بہن نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ سب کہنے لگے کہ لو بھلا ہم گود کے بچے سے باتیں کیسے کریں۔ بچہ بول اٹھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے۔ اور اس نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں بھی میں ہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ جب تک بھی میں زندہ رہوں اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار بنایا ہے اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں کیا اور مجھ پر میری پیدائش کے دن اور میری موت کے دن اور جس دن کہ میں دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا سلام ہی سلام ہے۔ یہ ہے صحیح واقعہ عیسیٰؑ بن مریم کا۔ یہی ہے وہ حق بات جس میں لوگ شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا لائق نہیں، وہ تو بالکل پاک ذات ہے۔ وہ تو جب کسی کام کے سرانجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔"

صرف انہی آیات کو ہی بار بار غور سے پڑھ لیا جائے تو حقیقت عیاں ہو جاتی ہے اور ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سب سے پہلے اس میں فرشتے سے مکالمہ ہے جو کہ آدمی کی صورت میں آپؑ کے سامنے ظاہر ہوا۔ اور آپؑ نے اس سے پناہ چاہی۔ جواباً اس نے آپؑ کو بیٹے کی بشارت دی۔ لیکن آپؑ نے کیا فرمایا اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا ۵ میرے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا اور نہ ہی میں بدکار ہوں۔

غور کیجئے یہاں بھی مریمؑ کے ذہن میں شادی کا ذرا بھی تصور نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے ہی حیرانی تھی کہ بنا کسی بشر کے مس کئے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر اللہ کی طرف سے جواب بھی یہ نہیں دیا گیا کہ تمہاری شادی ہو گی۔ اور پھر بیٹا ہو گا۔ بلکہ یہ کہا گیا کہ (ایسا ہی ہے تجھے کسی مرد نے نہیں چھوا اور نہ ہی تو بدکار ہے) تیرے رب کے لیے یہ بہت ہی آسان ہے۔ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔ اس لیے یہ سوال ہی نہیں تھا کہ مریمؑ خانقاہی زندگی چھوڑ کر متاہل زندگی کی راہ اختیار کر رہی ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ بغیر کسی قاعدے اور قانون کے ایک جوان لڑکی بیٹے کو جنم دینے جا رہی ہے۔ اسی لیے مریمؑ نے کہا يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۵ اے کاش کہ میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور کوئی بھولی بسری لڑکی ہوتی۔ اس پر اللہ تعالی کی طرف سے تسلی دی جا رہی ہے کہ مت غم کھا۔ اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھ۔ اور اگر کسی بشر کو دیکھے تو کہہ دینا میں نے روزہ رکھا ہے اور میں کلام نہیں کر سکتی۔ پس جب مریمؑ، حضرت عیسٰیؑ کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم میں گئیں تو انہوں نے کہا قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۵ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ج ۵ صلے انہوں نے کہا اے مریمؑ! تو نے بڑی بری حرکت کی ہے۔ اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔

یہاں قوم بھی یہ جانتی تھی کہ حضرت مریمؑ کی شادی نہیں ہوئی۔ اسی لیے اس طرح کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ پھر حضرت مریمؑ نے حضرت عیسٰیؑ کی طرف اشارہ کیا تو پھر قوم نے کہا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۵ کہ جو ابھی گود میں ہے ہم اس سے کس طرح بات کریں؟

یہ بھی حضرت عیسٰیؑ کا معجزہ تھا کہ آپ کو گود ہی میں قوت گویائی عطا ہوئی۔ مگر پرویز صاحب نے اس کو اور ہی معنی پہنا دیئے کہ "ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی کل تک گود میں تھا۔" اس کے بعد آیت نمبر 35 میں اللہ تعالی نے وضاحت کر دی۔

مَاكَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ لا سُبْحٰنَهٗ ط اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۵ ط اللہ تعالی کے لیے اولاد کا ہونا لائق نہیں، وہ تو بالکل پاک ذات ہے اور وہ جب کسی کام کے سرانجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا! تو وہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔

چونکہ عیسیٰؑ کے والد نہیں تھے اور بعد میں لوگوں نے یہ عقیدہ بنالیا کہ آپؑ (معاذاللہ) اللہ کے بیٹے ہیں۔ اسی لیے یہاں اللہ نے وضاحت کر دی۔

علاوہ ازیں پورے قرآن کریم میں حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کا ہی ذکر موجود ہے اور آپؑ کے والد گرامی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس کے ساتھ عیسیٰؑ کا تذکرہ والدہ ہی کی نسبت سے کیا گیا ہے۔

☆يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ط اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ج اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ز فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ قف وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ط اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ط اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ م لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۵ (4/171)

”اے اہل کتاب! اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گزر جائو او اللہ پر بجز حق کے اور کچھ نہ کہو، مسیح عیسی بن مریم (علیہ السلام) تو صرف اللہ تعالی کے رسول اور اس کے حکم ہیں جسے مریمؑ کی طرف ڈال دیا تھا اور اس کے پاس کی روح ہیں اس لیے تم اللہ کو اور اس کے سب رسولوں کو مانو اور نہ کہو کہ اللہ تین ہیں۔ اس سے باز آجائو کہ تمہارے لیے بہتری ہے۔ اللہ عبادت کے لائق تو صرف ایک ہی ہے اور وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا۔

☆مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ط كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ط اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۵ (5/75)

"مسیحؑ ابن مریم سوا پیغمبر ہونے کے اور کچھ بھی نہیں۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو چکے ہیں اس کی ماں "صدیقہ" تھیں۔ دونوں ماں بیٹا کھانا کھایا کرتے تھے۔ آپ دیکھئے کہ کس طرح ہم ان کے سامنے دلیلیں رکھتے ہیں۔ پھر غور کیجئے کہ کس طرح وہ پلٹائے جاتے ہیں۔"

☆اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ م(5/110)

"جب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ اے عیسٰیؑ بن مریم میرا انعام یاد کرو جو تم پر اور تمہاری والدہ پر ہوا ہے۔"

متذکرہ بالا دو آیات میں وضاحت کے ساتھ صرف حضرت عیسٰیؑ اور ان کی والدہ محترمہ (مریمؑ) کا ذکر ہے۔(5/75) میں تو بالکل ہی بات واضح ہو گئی کہ صرف "ماں بیٹا" ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ والد کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور(5/110) میں خاص طور پر "عیسٰیؑ" اور "مریمؑ" کو جتایا جارہا ہے کہ وہ نعمت جو رب نے ان دونوں پر کی۔

حالانکہ اگر مریمؑ راہبانہ روش زندگی ترک کر کے کسی فرد کے ساتھ شادی کرنے جارہی ہوتیں (بقول پرویز صاحب) تو اتنے بڑے اقدام پر عیسٰیؑ کے والد کا تذکرہ بھی ہونا چاہئے تھا اور اللہ کو ان پر بھی اپنی نعمت کا تذکرہ کرنا چاہئے۔ جس نے پوری قوم کی مخالفت کے باوجود ایسا قدم اٹھایا۔"

☆اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ طخَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ٥ (3/59)

"اللہ کے نزدیک عیسٰیؑ کی مثال ہو بہو آدمؑ کی مثال ہے جسے مٹی سے پیدا کر کے کہہ دیا کہ ہو جا پس وہ ہو گیا۔"

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات کہہ کر وضاحت کر دی کہ پیدائش مسیح تو مثل آدم ہے۔ یعنی جس طریقہ کار سے آدمؑ کی پیدائش بغیر قانون کے ہوئی۔ (یعنی بغیر ماں باپ کے) تو اسی طریقے سے عیسٰیؑ کی پیدائش بھی بغیر کسی قانون کے ہوئی۔ مگر چونکہ پرویز صاحب نے یہ تعین کر لیا ہے کہ پیدائش صرف موجودہ طریقہ کار (یعنی ماں اور باپ) سے ہی ممکن ہے۔ اس لیے انہوں نے اس جگہ بھی مختلف توجیہات دی ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں

"ہم 'ابلیس و آدم' میں بیان کردہ قصہ آدم میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ آدم جس کی تخلیق کا ذکر آیا ہے کسی شخص واحد کا نام نہیں۔ بلکہ اس سے مراد خود نوع انسانی ہے جس کی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی اور ارتقائی مدارج طے کرتے کرتے موجودہ شکل پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر عام انسانوں سے یہی کہا ہے کہ تمہاری تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ تفصیل انسان اور آدم کے عنوانوں میں (ابلیس و آدم میں) گذر چکی ہے۔ آپ اس سلسلہ میں آیات (30/23:20/5) دیکھ لیں۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ آدم (یعنی نوع انسانی) کی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔ لیکن ابتداء کو انتہا تک پہنچنے کے لیے مختلف تدریجی مراحل طے کرنے پڑے اور یہی کن فیکون ہے۔ اسی قسم کا کن فیکون حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ وہاں بھی مقصود ابتدا سے انتہا تک مختلف تدریجی مراحل طے کرنے سے ہے۔"

(شعلہ مستور۔ 131-132)

(اگر کن فیکون کا یہی مطلب ہے تو پھر آدمؑ اور عیسیٰؑ کا کن فیکون آپس میں نہیں ملتا۔ کیونکہ بقول پرویز صاحب آدمؑ تو ارتقاء کے ذریعے آدمؑ بنے۔ اور عیسیٰؑ کی والدہ مریمؑ نے راہبانہ طریق چھوڑ کر شادی کر لی۔ کن فیکون کے بارے میں قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں

☆اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ط بَلٰی ق وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۵ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۵ (36/81-82)

جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ ان جیسوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ بے شک قادر ہے۔ اور وہی تو پیدا کرنے والا دانا بینا ہے۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے۔ اسے اتنا کہہ دیتا ہے۔ کہ "ہو جا" وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔ مصنف)

حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر بھی پہلے گذر چکا ہے۔ جب حضرت زکریاؑ نے بیٹے کی موعودہ ولادت پر اظہار تعجب کیا تو ارشاد ہوا کہ تعجب کیا ہے! وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا(19/9) اس سے پیشتر ہم تمہیں پیدا کر چکے ہیں دراں حالیکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت زکریاؑ کی اپنی پیدائش عام حالات کے ماتحت ہی ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت یحییٰؑ کی پیدایش ہوئی۔" (شعلہ مستور132)

حیرت ہے کہ اگر پیدائش عام حالات کے تحت ہوئی تو پھر تعجب ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مگر قرآن میں حضرت زکریاؑ کے الفاظ ہیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۵ (19/8)

"انہوں نے کہا! اے میرے رب میرے ہاں لڑکا کیسے ہو گا۔ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کے انتہائی ضعف کو پہنچ چکا ہوں۔"

صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کوئی چیز قانون سے ہٹ کر ہونے جا رہی ہے۔ اور ایسا تعجب صرف زکریاؑ یا مریمؑ کے معاملے میں ہی نہیں ہے بلکہ ابراہیمؑ کے معاملہ میں بھی ہے۔ آیئے اس بارے میں قرآن کریم کے چند مقامات دیکھتے ہیں

☆وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ط قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۵ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ط قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۵ ط وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ لا وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۵ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ط اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ۵ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ط اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۵ (ھود 11/69-73)

"اور ہمارے بھیجے ہوئے پیغام بر ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر پہنچے اور سلام کہا۔ انہوں نے بھی جواب سلام دیا اور بغیر کسی تاخیر کے گائے کا بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔ اب جو دیکھا کہ ان کے تو ہاتھ بھی اس کی طرف نہیں

پہنچ رہے تو انہیں انجان پا کر دل ہی دل میں ان سے خوف کرنے لگے۔ انہوں نے کہا ڈرو نہیں۔ ہم تو قوم لوطؑ کی طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ان کی بیوی جو کھڑی ہوئی تھی وہ ہنس دی۔ تو ہم نے اسے اسحاقؑ کی اور اسحاقؑ کے پیچھے یعقوبؑ کی خوشخبری دی۔ وہ کہنے لگیں آہ میرے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے۔ میں خود بڑھیا اور یہ میرے خاوند بھی بہت بڑی عمر کے ہیں یہ تو یقینا بڑے تعجب کی چیز ہے۔ فرشتوں نے کہا کیا تو اللہ کی قدرت سے تعجب کر رہی ہے۔ تم پر اے اس گھر کے لوگو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔ بے شک اللہ حمد و ثنا کا سزاوار اور بڑی بزرگیوں والا ہے۔"

☆ وَ نَبِّئۡھُمۡ عَنۡ ضَیۡفِ اِبۡرٰھِیۡمَ ۵ م اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡہِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا قَالَ اِنَّا مِنۡکُمۡ وَجِلُوۡنَ ۵ قَالُوۡا لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمٍ عَلِیۡمٍ ۵ قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِیۡ عَلٰۤی اَنۡ مَّسَّنِیَ الۡکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ ۵ قَالُوۡا بَشَّرۡنٰکَ بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡقٰنِطِیۡنَ ۵ (الحجر 15/ 51-55

"انہیں ابراہیمؑ کے مہمانوں کا بھی حال سنادو۔ کہ جب انہوں نے ان کے پاس آکر سلام کہا۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم کو تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ انہوں نے کہا ڈرو نہیں، ہم تجھے ایک ہوشیار، دانا فرزند کی بشارت دیتے ہیں۔ کہا کیا اس بڑھاپے کے دبوچ لینے کے بعد تم مجھے خوشخبری دیتے ہو۔ یہ خوشخبری تم کیسے دے رہے ہو۔ انہوں نے کہا بالکل سچی، تجھے لائق نہیں کہ ناامید لوگوں میں شامل ہو جا۔"

☆ ھَلۡ اَتٰکَ حَدِیۡثُ ضَیۡفِ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ۵ م اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡہِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوۡمٌ مُّنۡکَرُوۡنَ ۵ فَرَاغَ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِیۡنٍ ۵ لا فَقَرَّبَہٗۤ اِلَیۡہِمۡ قَالَ اَلَا تَاۡکُلُوۡنَ ۵ ز فَاَوۡجَسَ مِنۡہُمۡ خِیۡفَۃً ط قَالُوۡا لَا تَخَفۡ وَ بَشَّرُوۡہُ بِغُلٰمٍ عَلِیۡمٍ ۵ فَاَقۡبَلَتِ امۡرَاَتُہٗ فِیۡ صَرَّۃٍ فَصَکَّتۡ وَجۡہَہَا وَ قَالَتۡ عَجُوۡزٌ عَقِیۡمٌ ۵ قَالُوۡا کَذٰلِکِ قَالَ رَبُّکِ اِنَّہٗ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡعَلِیۡمُ ۵ (الذریت 51/ 24-30

"کیا تجھے ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر بھی پہنچی ہے۔ وہ جب ان کے ہاں آئے تو سلام کیا۔ ابراہیمؑ نے سلام کا جواب دیا (اور کہا یہ تو) اجنبی لوگ ہیں۔ پھر چپ چاپ جلدی جلدی اپنے گھر والوں کی طرف گئے اور ایک فربہ بچھڑے کا گوشت لائے اور اسے ان کے پاس رکھا۔ اور کہا آپ کھاتے کیوں نہیں۔ پھر تو دل ہی دل میں ان سے

خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا آپ خوف نہ کیجئے۔ اور انہوں نے (حضرت) ابراہیمؑ کو ایک دانا، عالم لڑکے کے ہونیکی بشارت دی۔ پس ان کی بیوی نے حیرت میں آکر اپنے منہ پر ہاتھ مار کر کہا کہ میں تو بڑھیا ہوں اور ساتھ ہی بانجھ۔ انہوں نے کہا! ہاں تیرے پروردگار نے اسی طرح فرمایا ہے۔ بے شک وہ حکیم و علیم ہے۔"

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ اللہ کو انسانی ضابطوں کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ وہ تو جب چاہتا ہے کسی بھی طرح کا کام انجام دے سکتا ہے۔ آیت 3/58 میں جس طریقہ سے عیسٰیؑ کو مثل آدمؑ قرار دیا گیا، وہاں پرویز صاحب نے کوئی قوی دلائل نہیں دیئے۔ بس جس طرح کا ان کا سٹائل ہے کہ بات کو اصل موضوع سے ہٹا کر دوسری باتوں میں توجیہ تلاش کی جائے۔ یہاں بھی وہی سلسلہ ظاہر ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

"قرآن کریم نے حضرت عیسٰیؑ کو مثل آدمؑ اس لیے بھی کہا ہے کہ اناجیل کے بیان کے مطابق، حضرت عیسٰیؑ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہا کرتے تھے۔ مثلاً انجیل متیٰ میں ہے

(تب اس نے (مسیح نے) شاگردوں کے پاس آکر کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آپہنچا ہے اور ابن آدم گناہگاروں کے ہاتھ میں حوالے کیا جاتا ہے۔)

متی باب 26 صفحات 36

لہٰذا جو اپنے آپ کو ابن آدمؑ کہتا ہے اس کی پیدائش کی مثال خود آدم (آدمی) کی ہے۔ وہ آدمی کا بیٹا ہے۔ اور آدمی ہی کی طرح خود بھی پیدا ہوا ہے۔

ان سوالات کی اہمیت کیوں؟ پیدائش اور وفات حضرت عیسٰیؑ کے متعلق ہم قرآن کریم سے یہ کچھ سمجھ سکے ہیں لیکن اگر آپ ان نتائج سے متفق نہ ہوں تو قرآنی آیات آپ کے سامنے ہیں۔ (جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے) آپ ان پر از خود غور کیجئے کیونکہ قرآن ہر ایک کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن تدبر فی القرآن میں خارجی اثرات داخل نہ ہونے دیجئے۔ کہ اللہ کی کتاب محکم اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ اس باب میں آپ کی قلبی کیفیات

کا ہمیں پورا پورا اندازہ ہے۔ اس لیے کہ ان مسائل (بالخصوص وفات و حیات حضرت مسیحؑ) کو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر شخص کا اس بحث میں الجھنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ آپ غور کیجئے تو حضرت عیسیٰؑ کی وفات علمی دنیا میں ایک تاریخی سوال اور دنیائے مذہب میں قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس طرح قرآن کریم کے متعدد دیگر مسائل کو غور و فکر اور تاریخی انکشافات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس پر بھی غور و تدبر ہونا چاہیے۔ اس سے زیادہ اسے اہمیت حاصل نہیں۔ عیسائیوں میں یہ مسئلہ ان کے مذہب کی بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے ان کے ہاں اس کی خاص اہمیت کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سوال دین کے اصول و اساس میں سے نہیں۔ لیکن دور حاضرہ میں (بالخصوص بعض مخصوص مقاصد کے ما تحت) اسے اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اس سوال کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا گیا ہے۔ جب آپ سنجیدگی سے اس سوال پر غور کریں گے یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ جب کسی قوم کے سامنے کوئی زندہ نصب العین حیات نہیں رہتا تو کس طرح اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کس طرح اپنا سارا وقت منطقی موشگافیوں اور دور از کار فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں میں صرف کرتی اور ان لا حاصل نظری مباحث کو خاص اہمیت دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا واضح نصب العین اور ان کے قلوب میں اس کے حصول کی تڑپ تھی وہ اس قسم کے مباحث میں کبھی وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔" (شعلہء مستور 132-134)

حالانکہ یہ اعتراض تو پرویز صاحب پر خود بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ان کا اتنا ضخیم کام بھی تو صرف منطقی موشگافیوں اور دور از کار فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں اور لا حاصل نظری مباحث پر مشتمل ہے۔ اور ان کے سامنے بھی کوئی واضح نصب العین نہ تھا۔ اور ان کا پیش کردہ "قرآنی نظام ربوبیت" بھی ناقابل عمل ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ کارل مارکس پرویز صاحب سے زیادہ اپنے نظریات میں سچا تھا کہ اس نے جو نظام پیش کیا وہ خود اور اس کے پیروکار اس پر عمل پیرا تھے۔ مگر پرویز صاحب اور ان کے پیروکار جس "قرآنی نظام ربوبیت" کی بات کرتے

ہیں وہ ان پر کبھی بھی عمل پیرا نہیں رہے۔ بلکہ بہت سے لوگوں نے ان سے کہا کہ آئیں اس نظام کی ابتدا کے لیے عملی قدم اٹھائیں تو انہوں نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں اپنا کام کر رہا ہوں آپ لوگ جو بہتر سمجھتے ہیں وہ کریں۔ بلکہ یہاں تک کہ پرویز صاحب نے قرآن کریم سے جس طرح "قانون وراثت" اور "وصیت" کی تفسیر کی۔ وہ تو اس پر بھی عمل نہ کر سکے۔

درج بالا پیراگراف (شعلہ ءمستور) ظاہر کرتا ہے کہ "پیدائش مسیح" اور "مثل آدم" پر پرویز صاحب کو اپنے بیان کردہ مفہوم کو ثابت کرنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لیے انہوں نے بات کا رخ ہی پھیر دیا اور اپنے تمام دلائل تو بیان کر دیئے۔ اور پورا واقعہ تفصیلاً بیان کرنے کے بعد باقیوں کو یہ پیغام دیا کہ اس میں غور و تدبر وقت کے ضیاع کا باعث ہے۔

لگتا ہے کہ پرویز صاحب خود بھی اس چیز کا احساس رکھتے تھے کہ پیدائش مسیحؑ کے بارے میں جو دلائل انہوں نے فراہم کئے وہ قاری کو مطمئن کرنے سے عاری ہیں اس لیے انہیں بار بار کہیں وضاحت کرنا پڑی اور کہیں موضوع کا رخ بدلنا پڑا۔ آیئے مزید دیکھتے ہیں۔

"پیدائش حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مزید تصریحات۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق اناجیل کا بیان اور قرآن کریم کی متعلقہ آیات، شروع میں درج کی جا چکی ہیں۔ لیکن اس مسئلہ نے قلوب و اذہان میں جس قدر اہمیت اختیار کر رکھی ہے وہ مزید تفصیلی بحث کی متقاضی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ان کے مذہب کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے ابنیت والوہیت مسیحؑ کے عقائد اسی بنا پر قائم ہیں کہ آپ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی۔ لیکن خود ہمارے ہاں بھی اس کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ (اس کے وجوہات آگے چل کر ملیں گے)۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ قرآن نے جن مقامات پر ولادت حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا ہے انہیں غور سے دیکھئے اور جس نتیجہ پر وہ مقامات پہنچا دیں انہیں صحیح سمجھئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات کے یقینی مفہوم متعین کرنے میں ابھی زمانہ کی علمی سطح کے اور بلند ہونے کا انتظار کرنا پڑے۔ تا

آنکہ تاریخی انکشافات و اثری تحقیقات ان متشابہ آیات کو محکمات میں بدل دیں۔ قرآن نے خود اپنے متعلق کہا ہے کہ جوں جوں "آیات خداوندی" انفس و آفاق میں بے نقاب ہوتی جائیں گی قرآن کے دعاوی مثبت حقائق کی شکل میں سامنے آتے جائیں گے۔ یعنی اس کے حقائق انسانی علم کی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ لہذا ہم ان حقائق کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ ہم اپنے ذہن میں پہلے ایک عقیدہ قائم کرلیں اور پھر اس کے تائیدی شواہد تلاش کرنے کے لئے قرآن کریم کی ورق گردانی کریں تو یہ "تدبر فی القرآن" کا ایسا غلط طریقہ ہے جسے در حقیقت "تدبر فی القران" کہنا ہی غلط ہے۔ قرآن کریم کو اپنے خیالات و تصورات کے تابع لے آنا، بہت بڑی جسارت ہے۔ اس سے دلوں پر مہریں لگتی اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کریم کو خالی الذہن ہو کر سمجھے کی کوشش کیجئے اس کے بعد اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سردست آپ کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ تو قرآنی حقائق کو کھینچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعی ناکام نہ کیجئے۔ بلکہ قرآنی حقائق کو اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجئے تا آنکہ مزید تحقیق و تدبر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کردے کہ اس میں قرآنی حقائق سما سکیں۔ اگر قرآن کریم کا یہ ارشاد ہو کہ حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ظہور میں آئی تھی۔ تو بلا ادنی تامل ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہم ہر لحہ بدلنے والی عقل کی خاطر، نہ بدلنے والے حقائق کو رکیک تاویلات سے موڑ توڑ نہیں سکتے۔ اور اگر قرآن کریم اس طرف لے جائے کہ آپ کی پیدائش عام انداز کے مطابق ہوئی تھی تو محض اس لیے کہ اس سے ایک ایسے عقیدے کی تردید ہوتی ہے جو ہم میں ایک عرصہ سے متوارث چلا آرہا ہے۔ بے معنی نکتہ آفرینیوں اور دور از کار موشگافیوں کی سعی لا حاصل بھی خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ ہمارے تمام رجحانات و معتقدات، قرآن کے تابع ہونے چاہئیں اور بس!"

(شعلہء مستور 96-98)

قرآن کریم کے مفہوم اور زمانہ کی علمی سطح کا تعلق بھی عجیب بات ہے حالانکہ چودہ سو سال پہلے کے ان پڑھ اور جاہل قبائل نے کبھی یہ اعتراض نہیں اٹھایا کہ انہیں قرآن کریم کے کسی مقام کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔

اور دوسرا نکتہ یہ کہ خود پرویز صاحب نے زمانہ کی علمی سطح بلند ہونے کا انتظار نہیں کیا بلکہ تمام قرآن کریم کا مفہوم اپنے عقیدے کے مطابق بیان کر دیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ پرویز صاحب بھی عاجزی وانکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس باب میں بالکل خاموش رہتے اور تاریخی انکشافات اور اثری تحقیقات کا انتظار کرتے۔ بہر حال ان کا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں لکھا ہونا چاہئے تھا کہ ''حضرت عیسٰیؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے'' پھر وہ اس کو مان لیتے۔ لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ پھر وہ ان الفاظ کا یہی مفہوم لیتے یا اس کو بھی مجازی مفہوم پر محمول کرتے؟

قول فیصل۔ اب ہم آتے ہیں ''پیدائش مسیحؑ بن باپ کے'' پر اپنی آخری دلیل کی طرف، امید ہے کہ اس کے بعد اس چیز کو ماننے میں کوئی رکاوٹ سامنے نہ رہے گی۔

☆یٰیَحۡیٰ خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ ط وَاٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا ۵ لا وَّحَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً ط وَکَانَ تَقِیًّا ۵ لا وَّبَرًّام بِوَالِدَیۡہِ وَلَمۡ یَکُنۡ جَبَّارًا عَصِیًّا ۵

(سورہ مریم 19/12-14)

''اے یحییٰؑ! میری کتاب مضبوطی سے تھام لے اور ہم نے اسے لڑکپن ہی سے دانائی عطا فرمائی۔ اور اپنے پاس سے شفقت اور پاکیزگی بھی۔ وہ پرہیز گار شخص تھا۔ اور اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرنے والا تھا۔ وہ سرکش اور گنہ گار نہ تھا۔''

☆قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ط قف اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَجَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ۵ لا وَّجَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ص وَاَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ۵ لا وَّبَرًّام بِوَالِدَتِیۡ ز وَلَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ۵

(سورہ مریم 19/30-32)

''اس نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے۔ اور اس نے مجھے با برکت کیا ہے۔ جہاں بھی میں ہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکوۃ کا حکم دیا ہے۔ جب تک بھی میں زندہ رہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گذار بنایا اور مجھے سرکش اور بد بخت نہیں کیا۔''

یحییٰؑ کے والد اور والدہ تھے اس لیے ان کے لیے قرآن کریم میں اللہ تعالی نے وَالِدَیۡہِ کا لفظ استعمال کیا۔ جس میں تثنیہ کا صیغہ عربی قواعد کے مطابق استعمال ہوا ہے۔ اور عیسیٰؑ کی چونکہ صرف والدہ ہی تھیں اس لیے وہا ں وَالِدَتِیۡ کہہ کر واحد مونث کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ معمولی عربی جاننے والا بھی یہ فرق ملحوظ خاطر رکھ سکتا ہے۔ اگر عیسیٰؑ کے والد ہوتے تو ضرور یہاں بھی تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوتا۔ اس لیے ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی کہ عیسیٰؑ کی پیدائش روایتی قانون سے ہٹ کر ایک معجزہ کے طور پر ہوئی۔ اس لیے اس چیز کو ماننے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہئے۔

معجزات۔ قرآن کریم کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو بہت سے معجزات عطا ہوئے۔ اس سلسلے میں آپ پرویز صاحب کا موقف دیکھ چکے ہیں۔ آیئے قرآن کی دو آیات کو دیکھتے ہیں۔

☆اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنۡہُ ق لا اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ وَجِیۡهًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ وَ مِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ۵ لا وَ یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَهۡدِ وَ کَهۡلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۵ قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ ط قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ط اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۵ وَ یُعَلِّمُہُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۵ ج وَ رَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۵ لا اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ج لا اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَهَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ج وَ اُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ج وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ لا فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ط اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۵ ج (ال عمران 3/45-49)

”جب فرشتوں نے کہا اے مریمؑ! اللہ تعالی تجھے اپنے ایک کلمے کی خوشخبری دیتا ہے۔ جس کا نام مسیح بن مریمؑ ہے۔ جو دنیا اور آخرت میں ذی عزت ہے اور وہ میرے مقربین میں سے ہے۔ وہ لوگوں سے اپنے گھوارے میں باتیں کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی اور وہ نیک لوگوں میں سے ہو گا۔ کہنے لگیں الٰہی! مجھے لڑکا کیسے ہو گا؟ حالانکہ مجھے تو

کسی انسان نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ فرشتے نے کہا اسی طرح اللہ تعالی جو چاہے پیدا کرتا ہے۔ جب کبھی وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالی اسے کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھائے گا۔ اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانیاں لایا ہوں۔ میں تمہارے لیے پرندے کی شکل کی طرح مٹی کا پرندہ بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالی کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور اللہ تعالی کے حکم سے میں مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں۔ اور مردے کو زندہ کر دیتا ہوں۔ اور جو کچھ تم کھاؤ اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ کرو۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے۔ اگر تم مومن ہو۔"

☆ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا وَاِذْ عَلَّمْتُکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَالتَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْھَا فَتَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْکَ اِذْ جِئْتَھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۵

(المائدہ 5/110)

"جب کہ اللہ تعالی ارشاد فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم میرا انعام یاد کرو جو تم پر اور تمہاری والدہ پر ہوا ہے۔ جب میں نے تم کو روح القدس سے تائید دی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی۔ اور جب کہ میں نے تم کو کتاب اور حکمت کی باتیں اور توریت اور انجیل کی تعلیم دی۔ اور جب کہ تم میرے حکم سے مٹی سے ایک شکل بناتے تھے جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے۔ پھر تم اس کے اندر پھونک مار دیتے تھے جس سے وہ پرندہ بن جاتا تھا، میرے حکم سے۔ اور تم اچھا کر دیتے تھے مادر زاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو میرے حکم سے۔ اور جب کہ تم مردوں کو نکال کر کھڑا کر لیتے تھے میرے حکم سے۔ اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل کو تم

سے باز رکھا جب تم ان کے پاس دلیلیں لے کر آئے تھے پھر ان میں جو کافر تھے انہوں نے کہا تھا کہ بجز کھلے جادو کے یہ اور کچھ بھی نہیں۔"

یہ تھے وہ معجزات جو عیسیٰؑ کو عطا ہوئے۔ دوسری آیت کا آخری ٹکڑا وضاحت کر رہا ہے کہ یہ تمام حسی معجزات ہی تھے جو عام قاعدے قانون سے ہٹ کر وقوع پذیر ہوئے۔ کہ جب عیسیٰؑ نے وہ معجزے پیش کئے تو کافروں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ اگر کوئی چیز قاعدے اور قانون (Laws of nature) کے مطابق ظہور پذیر ہوئی ہوتی تو کفار بالکل یہ اعتراض وارد نہ کرتے۔

باقی رہا پرویز صاحب کا معاملہ! تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی کہ میں تو ان آیات کے مجازی معانی لیتا ہوں۔ اب یہاں غور و فکر اور بحث و تمحیص کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ بحث و تمحیص کی گنجائش تو وہاں ہوتی ہے جہاں یہ طے ہو کہ جناب یہ عربی زبان ہے، یہ اس کے قواعد و ضوابط ہیں، یہ سیاق و سباق ہے۔ ان کے مطابق ان آیات کا یہ مطلب بنتا ہے۔ مگر جہاں کوئی معیار (Criteria) ہی موجود نہ ہو تو پھر تو کسی بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے باب "مجازی مفہوم")

وفات مسیحؑ۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ مسیحؑ کو نہ تو صلیب دی گئی اور نہ ہی انہیں قتل کیا گیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں باحفاظت اپنی طرف اٹھا لیا۔ لیکن اس بارے میں پرویز صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نہیں اٹھایا بلکہ انہوں نے وہاں سے ہجرت کر لی اور بعد میں اپنی طبعی موت پر اس جہان سے رخصت ہو گئے۔ آیئے پہلے پرویز صاحب کا نقطۂ نظر دیکھتے ہیں۔

"قرآن کریم نے سب سے پہلے، ایک اصولی چیز بیان فرمائی ہے کہ اس اختصار میں تمام تفاصیل و جزئیات محصور ہو گئی ہیں۔ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۵ (3/54)

"اور پھر ایسا ہوا کہ یہودیوں نے (مسیحؑ کے خلاف) مکر کیا (یعنی مخفی اور باریک طریقے مخالفت کے کام میں لائے) اور خدا بھی ویسے ہی طریقے کام میں لایا (یعنی مسیحؑ کی حفاظت کے پوشیدہ اسباب و ذرائع پیدا کر دیئے) اور یاد رکھو، (اللہ جسے بچانا چاہے تو) مخفی طریقوں سے کام لینے والوں میں اس سے بہتر کوئی نہیں!"

یعنی یہودیوں کی تدبیر یہ تھی کہ حضرت مسیحؑ کو گرفتار کر کے رومیوں کے ہاتھوں صلیب پر لٹکوا دیا جائے، لیکن اللہ ان کی تدبیر سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے اپنے اس برگزیدہ رسول کو اس "لعنتی موت" سے بچانے کی خود تدبیر کر رکھی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے مقابلہ میں خدائی تدبیر کامیاب ہو گی۔ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ ٥ یہودیوں کا دعوی ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دیا گیا اور اس طرح وہ (معاذاللہ) لعنت کی موت مرے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔

☆وَقَوْلِھِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا ٥ لا (157/4)

"اور (نیز) ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو جو خدا کا رسول ہونے کا دعوی کرتا تھا (سولی پر چڑھا کر) قتل کر ڈالا۔ حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ سولی چڑھا کر ذلت کی موت مارا۔ بلکہ حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ (یعنی صورتحال ایسی ہو گئی کہ انہوں نے سمجھا، ہم نے مسیحؑ کو مصلوب کر دیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں تھا) اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا (یعنی عیسائیوں نے جو کہتے ہیں مسیحؑ مصلوب ہوئے لیکن اس کے بعد زندہ ہو گئے) تو بلا شبہ وہ اس کی نسبت شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں اس بارے میں ان کے پاس کوئی یقینی بات نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ ظن و گمان کے پیچھے جائیں۔ اور یقیناً انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا۔

انہوں نے یقینانہ حضرت عیسیٰؑ کو قتل کیا اور نہ صلیب پر لٹکایا۔ پھر ہوا کیا؟ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ (انہیں اس باب میں سخت اشتباہ ہو گیا) بس اس ٹکڑے کے اندر اصل واقعہ نقاب اوڑھے مسکرا رہا ہے۔ اس کے متعلق یہود و

نصاری جو طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں، وہ محض ظن و تخمین ہے، علم و حقیقت نہیں۔ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو ہر گز ہر گز قتل نہیں کیا۔ اس لیے یہ دعوی کہ وہ (معاذاللہ) ایک لعنتی کی موت مرے سر تا سر لغو اور بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالی نے بکمال حکمت و تدبیر حضرت مسیحؑ کو یہودیوں کی مشئوم چال سے محفوظ رکھا اور لعنتی کی موت کے بجائے، عزت و تکریم کی اس انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا جو ایک رسول کا صحیح مقام ہے۔ بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ (158/4)

(شعلہء مستور 75-76)

ہجرت۔ بہر حال حضرت مسیحؑ نے ان حالات میں فلسطین سے ہجرت کر لی (جس طرح رات کی تاریکی اور خاموشی میں حضور نبی اکرمؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی) اور کسی دوسری طرف تشریف لے گئے۔ یہ اسی قسم کی ہجرت تھی جسے ہم اتمام حجت کے بعد، انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف میں دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ، و غیر ہم (علیہم السلام) نے اسی طرح ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بعض انبیائے عظام کے بعد از ہجرت واقعات زندگی کے متعلق قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔ لیکن اکثر وہ ہیں (حضرت ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ) جن کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق قرآن نے کچھ نہیں کہا۔ اس لیے کہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ کسی رسول (یا قوم) کی پیدائش سے وفات (یا ابتدا سے انتہا) تک کے تمام واقعات بیان کرے۔ وہ ان واقعات میں سے صرف اتنے حصہ پر اکتفا کرتا ہے۔ جسے وہ مقصد پیش نظر کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ حضرت عیسٰیؑ کی بعد از ہجرت زندگی کے متعلق بھی قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔

وفات۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ قرآن کریم نے کس طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال اور باطل عقیدہ کی تردید کر دی ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب دیا گیا تھا۔ باقی رہا عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ آپ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے۔ تو قرآن سے اس کی بھی تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں ایسے شواہد موجود ہیں

جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے دوسرے رسولوں کی طرح اپنی مدت عمر پوری کرنے کے بعد وفات پائی۔

سورئہ آل عمران کی جو آیت اوپر درج کی جاچکی ہے۔اس میں وفات کا ذکر صاف طور پر موجود ہے۔

☆اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰیٓ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْ آ۔(3/55)

"جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ تعالی نے فرمایا اے عیسٰیؑ! میں تیرا وقت پورا کروں گا(وفات دیدوں گا)اور تجھے (یعنی تیرے درجات کو)اپنی طرف بلند کروں گا۔ تیرے مخالفین (کی تہمتوں)سے پاک کردوں گا۔"

سورئہ مائدہ میں ہے کہ اللہ تعالی حضرت عیسٰیؑ سے پوچھیں گے کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تیری اور تیری والدہ کی پرستش کیا کریں۔وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ معاذاللہ! میں بھلا ایسا کیسے کہہ سکتا تھا۔ باقی رہے یہ لوگ(میرے متبعین سو۔کُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْط (5/117)جب تک میں ان میں موجود رہا میں ان کی نگرانی کرتا رہا(کہ اس قسم کے مشرکانہ عقائد ان میں پیدا نہ ہوں)لیکن جب تو نے مجھے وفات دیدی تو اس کے بعد ان کا نگران تو ہی ہو سکتا تھا۔(میں نہیں)۔"

(شعلہء مستور 79-81)

وفات کے معنی۔جو شخص ان تصریحات پر خالی الذہن ہو کر غور کرے گا۔وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ نزول قرآن کے وقت حضرت عیسٰیؑ کے زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم کی آیات سے نہیں ملتی۔بلکہ اس کے برعکس آپ کے "گزر جانے" اور وفات پا جانے کی شہادت قرآن میں موجود ہے،وفات کے معنی ہیں اس طرح پورا ہو جانا(یا پورا کر دیا جانا)کہ اس میں سے کچھ بقایا نہ رہے۔۔۔تفصیل کے لیے دیکھئے میری لغات القرآن)۔ لہٰذا وفات کے معنی ہوں گے "کسی کے وقت کا پورا ہو جانا۔"

یعنی دنیا میں قیام کی مدت کا پورا ہو جانا۔قرآن کریم میں وفات کا لفظ ان معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔سورئہ آل عمران میں مومنین کی ایک دعا مذکور ہے کہ

☆ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ۵ ج (3/193)

"پس خدایا ہمیں سامان حفاظت عطا فرمادے۔ ہماری برائیاں مٹادے اور (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو۔"

یہاں توفنا کے معنی ظاہر ہیں۔ اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے

☆ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ ۵ (7/126)

"پروردگار! ہمیں صبر و شکیبائی سے معمور کر دے۔ (تاکہ زندگی کی کوئی اذیت ہمیں اس راہ میں ڈگمگانہ سکے۔) اور ہمیں دنیا سے اس حالت میں اٹھا کہ تیرے فرماں بردار ہوں۔"

حضرت یوسفؑ کی یہ دعا کہ تَوَفَّنِىۡ مُسۡلِمًا وَّاَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ ۵ (12/101) بھی اسی مفہوم کو لئے ہوئے ہے۔ سورۂ محمد میں اس لفظ کے معنی اور بھی واضح ہو گئے ہیں۔

وَكَيۡفَ اِذَا تَوَفَّتۡهُمُ الۡمَلٰۤئِكَةُ يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ (47/27) تو (غور کرو، ان کا) کیا حال ہو گا جب ملائکہ انہیں وفات دیں گے ان کے مونہوں اور ان کی پیٹھوں کو مارتے ہوں گے۔

ان کے علاوہ کئی ایک اور مقامات بھی ہیں جن میں یتوفّٰی کے معنی مار دینے کے ہیں۔

مثلاً (32/22,11/16,5/70, 4/15, 2/234, 2/240) بغرض اختصار ان آیات کو درج نہیں کیا جاتا۔ قرآن کریم میں خود دیکھ لیجئے۔ ان کے معانی میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔ بلکہ ان مندرجہ صدر آیات سے بھی زیادہ واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔" (شعلہء مستور 82-83)

"قرآن کریم میں دو ایک مقامات ایسے بھی ہیں جہاں توفّٰی کے معنی موت دینے کے نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

وَھُوَالَّذِیْ یَتَوَفّٰکُم بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّھَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْہِ لِیُقْضٰیٓ اَجَلٌ مُّسَمًّی (6/60) اور (دیکھو) وہی ہے جو رات کے وقت تم کو "وفات دے دیتا ہے" (یعنی سلا دیتا ہے) اور جو کچھ تم نے دن (کی حرکت و ہوشیاری) میں کدو کاوش کی تھی، اس سے بے خبر نہیں ہے۔ پھر (جب رات بھر سو لیتے ہو، تو) دن کے وقت تمہیں اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ (بدستور کدو کاوش میں لگ جاؤ، اور زندگی کی) مقررہ میعاد پوری ہو جائے۔

اس کی تفسیر سورۂ زمر میں ان الفاظ میں آئی ہے۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۵ (39/42)

"اور دیکھو، اللہ "نفوس" کو (دو طرح پر) وفات دیتا ہے (ایک تو) ان کی موت کے وقت، اور (دوسرے) جو مرے نہیں، ان کی نیند میں۔ پھر انہیں روک رکھتا ہے جن پر موت کا حکم کیا ہوتا ہے اور دوسروں کو ایک مقررہ وقت تک کے لئے بھیج دیتا ہے۔ یقیناً اس میں قوم کے لئے بڑی ہی نشانی ہے۔ جو غور و فکر کی عادی ہو۔"

ظاہر ہے کہ ان مقامات میں "نفس" کے معنی جان کے نہیں بلکہ نفس شعوریہ (Conscious Mind) کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ بحالت نیند اور بحالت موت نفس شعوریہ (احساس و ادراک) کی قوتوں کو معطل کر دیتا ہے۔ نیند کی صورت میں تو اس کھوئے ہوئے شعور و ادراک کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں واپس نہیں لوٹایا جاتا (جب تک پھر دوسری زندگی عطا نہ ہو) اس لئے کہ حالت نیند میں انسان میں سوائے شعور ادراک کے اور سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ ان معانی کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ کی مندرجہ صدر آیات میں توفّٰی کے معنی موت نہیں بلکہ نیند کی سی بے ہوشی کے ہیں۔ اور اس سے مراد یہ لی جا سکتی ہے۔ کہ آپ کو صلیب دی گئی لیکن آپ صلیب پر بے ہوش ہو گئے۔ مرے نہیں۔ اور لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ آپ مر چکے ہیں۔ (یعنی لوگوں کا وہی خیال جس کا ذکر پہلے کیا جا

چکا ہے) لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے دیگر قرائن کے پیش نظریہ صحیح نہیں۔ قرآن کریم آپ کے صلیب دیئے جانے کی بصراحت تردید کرتا ہے۔ (وَمَا صَلَبُوْهُ) پھر سورۂ مائدہ کی مندرجہ صدر آیت میں واضح الفاظ میں ہے کہ "جب تک میں ان میں رہا ان کی حالت پر گواہ تھا۔ اس کے بعد جب تو نے وفات دے دی تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا۔" اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں وفات سے مراد نیند کی سی بے ہوشی نہیں بلکہ موت کی بے خبری ہے۔ ورنہ اگر نیند کی سی بے ہوشی ہوتی تو ہوش میں آجانے کے بعد پھر وہی پہلی سی (باخبری) کی حالت پیدا ہو جاتی۔ اس سے واضح ہے کہ حضرت عیسٰی کے ضمن میں توفّٰی کے معنی وفات پا جانا ہیں۔ سو جانا نہیں۔" (شعلہء مستور 84-86)

رفع الی السمآء۔ اب دیکھئے ترفع (آسمان پر چڑھ جانے) کا مفہوم۔ اس کے لئے تو سورۂ آل عمران کی اسی آیت کو سامنے رکھئے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ) اور دوسرے سورۂ نساء کی یہ آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (4/158) حضرت عیسٰی کے ترفع کا ذکر انہی دو آیات میں آیا ہے۔

رفع کے معنی ہیں اوپر اٹھانا، بلند کرنا، سورۂ رعد میں ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (13/2) "اللہ وہ ہے جس نے بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو آسمانی کرّوں کو بلند کیا۔ یا مثلاً وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (2/63) ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا۔ حضرت یوسفؑ کے تذکار جلیلہ میں ہے وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ (12/100) اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا۔ پھر درجات کی بلندی کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے مثلاً وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (6/165) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا اور تم میں ایک کو دوسرے سے درجات میں بلند کیا۔ اور اس صدر نشین بزم کائنات (علیہ الصلوۃ والسلام) کے ذکر کی بلندی کے لیے بھی (وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ 94/4) کے الفاظ آئے ہیں۔ ان آیات میں رَفَعَ کے ساتھ درجت یا ذکر کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن تنہا رَفَعَ کے معنی بھی بلندیء درجات و عروج مراتب کے ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا (7/176) اور اگر ہم چاہتے تو ان (قوانین) کے ذریعے ہم اس (کے

مقام) کو بلند کر دیتے۔ یہی وہ ارتفاع درجت و مراتب اور عروج مقامات و مناصب ہے جن کا ذکر حضرت ادریسؑ کے قصّہ میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ وَرَفَعْنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا (19/57) اور ہم نے اسے ایک بلند مقام پر اٹھایا ''حضرت ادریس کو'' بڑے اونچے مقام تک اٹھانے کا یہ مفہوم نہیں کہ انہیں بہ جسد عنصری اٹھا کر کسی اونچی جگہ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ بلکہ (جیسا کہ عام محاورہ ہے) اس سے ان کے مقام و مدارج کی بلندی مفہوم ہے۔ اور جب اس بلندیء مقام کا ذکر اللہ کے عباد صالحین کے متعلق ہو گا تو اس سے مطلب ''قرب الٰہی'' ہو گا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ''قرب الٰہی'' سے مفہوم یہ نہیں کہ انسان جسمانی طور پر ''اللہ کے قریب'' جا بیٹھتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی مقصود بلندی مدارج و علو شرف انسانیت ہوتا ہے۔ یہی مطلب حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ میں ''رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ'' (اللہ نے اپنی طرف بلند کیا) اور ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' (میں تجھے اپنی طرف بلند کروں گا) سے ہے۔ یعنی بلندی مدارج و مراتب۔ مختلف انبیائے کرامؑ کے مختلف مقامات مدارج و مناصب کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ تِلۡکَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (2/253) ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ''رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ'' اور ''رَافِعُکَ اِلَیَّ'' فرمایا گیا ہے، (یعنی اللہ نے اپنی طرف بلند کیا) اور اس سے اس امر پر دلیل لائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ لیکن اگر (الیہ اور الی سے) یہ مفہوم لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی خاص مقام میں متمکن ہے۔ اس مفہوم سے خود ذات باری تعالیٰ کے متعلق جو تصور قائم ہوتا ہے۔ وہ محتاج تشریح نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جہات و اطراف کی نسبتوں سے بلند اور مکان و زمان کی اضافتوں سے منزہ ہے۔ وہ ہر مقام پر ہے اور اس کے لیے کسی خاص مقام اور گوشہ کی تعیین یکسر غلط اور اس کی ذات کے متعلق قرآنی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ جسے ایک ثانیہ کے لیے بھی دل میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے جہاں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ''رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ'' تو اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت یا مقام میں ہے اور حضرت عیسیٰؑ اس جہت یا مقام (آسمان) کی طرف اٹھا لیے گئے ہیں۔ الیہ (اللہ کی طرف) کا لفظ صرف حضرت عیسیٰؑ کے متعلق

ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ متعدد دیگر مقامات پر بھی آیا ہے۔ جہاں سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے " آسمان کی طرف اٹھالینا" مراد نہیں ہو سکتا مثلاً اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ (2/156) ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اللہ کسی خاص مقام پر ہے اور ہم اس مقام کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔" (شعلہء مستور 86-88)

"ان تصریحات سے واضح ہے کہ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ اور یَصۡعَدُ اِلَیۡہِ اور مُھَاجِرٌ وَذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ میں الی سے مراد کسی خاص مقام کی سمت نہیں بلکہ تکمیل مدارج ہے۔ اسی طرح قصہ حضرت عیسیٰؑ میں "رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ" میں الیہ سے مفہوم کوئی خاص سمت نہیں۔ بلکہ بلندیء مدارج ہے۔ اور یہ لفظ ایک خاص مقصد کے پیش نظر استعمال کیا گیا ہے۔ یہودیوں کا زعم باطل تھا کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا تھا جس سے آپ (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرے تھے۔ لعنت کے معنی ہیں دوری۔ (انعامات خداوندی سے دوری یا محرومی۔ اللہ تعالی نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب دیئے ہی نہیں گئے (ماصلبوہ) بلکہ وہ اپنی طبعی موت سے وفات پا گئے (متوفیک) اور انہیں انعامات خداوندی سے دوری نہیں بلکہ قرب حاصل ہے (بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ)۔ اب سورۂ آل عمران کے ان الفاظ کو پھر سے سامنے لایئے۔ اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ (اے عیسیٰؑ میں تجھے وفات دینے والا اور بلند درجات عطا کرنے والا ہوں) وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یعنی تجھے ان کفار کے اتہامات سے پاک اور صاف کرنے والا ہوں۔"

(شعلہء مستور 89-90)

یہ تھا پرویز صاحب کا نقطہء نظر "وفات مسیحؑ" کے بارے میں، اس میں چند نکات قابل غور ہیں۔

☆ پرویز صاحب نے لغت کے مطابق جو معانی "وفات" اور "رفع" کے بیان کئے ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یعنی قرآن کریم میں "توفی" وفات کے معنوں میں اور "پورا پورا لینے اور دینے" کے معنوں میں بھی

استعمال ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے جو حوالہ جات پرویز صاحب نے دیئے ہیں ان کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح "رفع" کے معنی اوپر اٹھانا کے بھی ہیں اور "درجت بلند کرنا" بھی ہیں۔

ہمارا استدلال یہ ہے کہ زبان میں الفاظ کے معانی کا تعین سیاق وسباق کرتا ہے۔ اس لیے ہم یہ دیکھیں گے کہ جس سیاق میں یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہاں ان کا مفہوم کیا بنتا ہے۔ "رفع" کا مفہوم بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب نے دیگر قرآنی آیات کا سہارا لیا مگر (158/4) میں "رفع" کو (157/4) کے ساتھ ملا کر نہیں پڑھا۔ بلکہ دونوں آیات کی علیحدہ علیحدہ تشریح کر دی جس کی نفس مضمون اجازت نہیں دیتا۔ آیئے ان آیات کو دیکھتے ہیں۔

☆وَقَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ‌ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ‌ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ ج وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۵ لا م بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۵ النسآء (158-157/4)

"اور یوں کہنے کے باعث کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسی بن مریمؑ کو قتل کر دیا حالانکہ نہ تو انہوں نے اسے قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا بلکہ ان کو اس معاملہ میں شبہ ہوا۔ یقیناً عیسٰیؑ کے بارے میں اختلاف کرنے والے انکے بارے میں شک میں ہیں انہیں اس کا کوئی یقین نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، اتنا یقینی ہے کہ انہوں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالی نے انھیں اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ بڑا زبر دست اور پوری حکمتوں والا ہے۔"

اس آیت میں "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ" جواب ہے " وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ ' اور "وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا" کا۔ یعنی عیسٰیؑ کو نہ تو قتل کیا گیا نہ سولی پر چڑھایا گیا اور یقیناً آپؑ کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ اللہ تعالی نے آپؑ کو اپنی طرف اٹھالیا۔

اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں بن سکتا کہ عیسٰیؑ کو نہ تو قتل کیا گیا نہ سولی پر چڑھایا گیا اور یقیناً آپؑ کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ اللہ نے آپؑ کے درجت کو بلند کر دیا۔

آیت کے آغاز میں یہودی ایک الزام لگا رہے ہیں کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کر دیا۔ اور اس چیز کا جواب اللہ تعالی نے یہ دیا کہ قطعاً غلط! انہیں قتل نہیں کیا گیا بلکہ اللہ تعالی نے اپنی طرف اٹھایا۔ قتل کا مقابل لفظ ظاہر ہے زندگی ہے۔ اس لیے یہودیوں کے دعوی کی نفی کا جواب "موت سے بچانا"، "صلیب سے بچانا" ہی لازم ہے نہ کہ "درجت کا بلند کرنا"۔

اس لیے آیت 4/158 کو 4/157 سے الگ کر کے مفہوم بیان کرنا یا تشریح کرنا قطعاً غلط ہے۔ اس کے ساتھ ہی آیت 3/55 کو بھی 4/157-158 کے پس منظر میں دیکھنا لازم ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ج ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ۵ (3/55)

"جب اللہ تعالی نے فرمایا کہ اے عیسیٰؑ! میں تجھے پورا لینے والا ہوں اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں اور تجھے کافروں سے پاک کرنے والا ہوں اور تیرے تابعداروں کو کافروں کے اوپر رکھنے والا ہوں قیامت کے دن تک۔ پھر تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے۔ میں ہی تمہارے آپس کے تمام تر اختلافات کا فیصلہ کروں گا۔"

آیت 4/157-158 کی روشنی میں اس آیت میں " مُتَوَفِّیْکَ " کا مطلب "میں تجھے وفات دوں گا۔" نہیں ہو سکتا بلکہ "میں تجھے پورا لے لوں گا" ہی ہو سکتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کے ساتھ ہی " رَافِعُکَ اِلَیَّ " بھی موجود ہے۔ وفات دے کر اپنی طرف اٹھانا تو کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ اس صورت میں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔

☆ اگلی بات یہ کہ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہ تھا کہ یہاں "درجت" کا لفظ استعمال کر دیتا۔ جیسا کہ ان آیات میں کئے ہیں وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (6/166) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا اور تم میں ایک کو دوسرے سے درجات میں بلند کیا۔ یا تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْھُمْ مَّنْ

کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعۡضَھُمۡ دَرَجٰتٍ (2/253) ''یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالی نے بات چیت کی ہے اور بعض کے درجے بلند کئے ہیں۔ اور رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ (94/4) اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کر دیا ہے۔

لیکن جہاں مسیحؑ کے ساتھ ''رفع'' کا لفظ استعمال ہوا وہاں عربی زبان کے قاعدہ کے مطابق ''کَ'' اور '' ہٗ'' کی ضمیر استعمال کی گئی جو ظاہر کرتی ہے کہ اس سے مراد حضرت عیسٰیؑ کی ذات ہے۔نہ کہ ان کے درجات۔

اِلَیۡہِ اور اِلَیَّ۔سابقہ صفحات میں آپ نے دیکھا کہ پرویز صاحب کے نزدیک اِلَیۡہِ اور اِلَیَّ کی توجیہ اللہ تعالی کی طرف اس لیے قبول نہیں کی جاسکتی کہ اس طرح اللہ تعالی کا کسی خاص جہت یا مقام میں ہونا لازم آتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالی اس چیز سے مبرا ہے۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم ذات الٰہی کی کنہ و حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن یہ تصور کہ اللہ کا ذکر زبان پر آتے ہی ہاتھ کی انگلی یا چہرہ آسمان کی طرف ہی کیوں اٹھتا ہے۔ایک تو یہ تصور کوئی نیا نہیں ہے۔دعا کے سلسلہ میں بھی ہاتھ اوپر ہی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔دوسری بات اس کے شواہد ہمیں قرآن کریم میں بھی ملتے ہیں۔جیسے

وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ج (2/4)

''اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا۔''

نَزَّلَ کا معنی اوپر سے نیچے اترنا ہی ہے۔اور اوپر سے اتاری ہوئی چیز کے بارے میں ذہن لا محالہ ایسی ذات کی طرف جاتا ہے جو اس کائنات سے ماوراء ہے۔

اس کے علاوہ حضورؐ کے بارے میں فرمایا گیا قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡھِکَ فِی السَّمَآءِ ج فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَۃً تَرۡضٰھَا ص (2/144)

''ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ پس ہم آپ کا رخ اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے آپ راضی ہو جائیں گے۔''

یہاں بات واضح ہو گئی کہ حضورؐ کا رخ آسمان ہی کی طرف کیوں اٹھا اگر اللہ کے لئے سمت یا جہت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے تو اللہ کا یہ بھی فرمان ہے کہ ''ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کی ذات کی ماہیت تو انسانی عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن یہ بات تو حقیقت ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی اللہ یا خدا کا تصور ذہن میں آتے ہی ذہن اوپر کی طرف ہی جائے گا۔ اور یہ بات تقریباً تمام مذاہب عالم میں یکساں ہے۔ اس لیے پرویز صاحب کی عقلی دلیل کہ چونکہ عیسیٰؑ کے آسمانوں کی طرف اٹھائے جانے سے اللہ تعالیٰ کے کسی خاص مقام پر موجود ہونے کا تصور لازم آتا ہے قابل قبول نہیں۔ فلہٰذا اس دلیل کی بنا پر یہ مفہوم کہ ''یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ اور یَصۡعَدُ اِلَیۡہِ میں اِلٰی سے مراد کسی خاص سمت نہیں بلکہ تکمیل مدارج ہے'' درست نہیں۔ الفاظ ''اِلَیۡہِ اور اِلَیَّ'' اپنے مطالب میں واضح ہیں۔

رَفَعَ ہی کیوں۔ قرآن کریم میں عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھائے جانے کے لئے '' رَفَعَ '' کا لفظ استعمال کیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہود کا یہ الزام تھا کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کر دیا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے '' رَفَعَ '' کا لفظ استعمال کیا۔ جس طرح کے حالات و واقعات اور مشکلات و مصائب کا شکار حضرت عیسیٰؑ ہوئے۔ ایسے ہی مشکل ترین حالات کا شکار دیگر انبیاء کرام بھی ہوئے۔ آیئے کچھ آیتیں ملاحظہ کرتے ہیں۔

☆حضرت ابراہیمؑ۔ قَالُوۡا حَرِّقُوۡہُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِہَتَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ٥ قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ٥لا وَ اَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَخۡسَرِیۡنَ ٥ج وَ نَجَّیۡنٰہُ وَ لُوۡطًا اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا لِلۡعٰلَمِیۡنَ ٥(21/68-71)

”کہنے لگے کہ اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو، اگر تمھیں کچھ کرنا ہی ہے تو۔ ہم نے فرمایا اے آگ تو ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیمؑ کے لیے سلامتی اور راحت کی چیز بن جا۔ گو انہوں نے ابراہیمؑ کا برا چاہا لیکن ہم نے انہیں ہی نقصان پانے والا کر دیا۔ اور ہم ابراہیمؑ اور لوطؑ کو بچا کر اس زمین کی طرف لے چلے جس میں ہم نے تمام جہاں والوں کے لیے برکت رکھی تھی۔“

☆حضرت لوطؑ۔ وَلُوْطًا اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْقَرْیَۃِ الَّتِیْ کَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ ۵لا وَاَدْخَلْنٰہُ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّہٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۵ (21/74-75)

”اور ہم نے لوطؑ کو بھی حکمت اور علم دیا اور اسے بستی سے نجات دی جہاں کے لوگ گندے کاموں میں مبتلا تھے۔ اور تھے بھی وہ بدترین گنہ گار۔ اور ہم نے لوطؑ کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ بے شک وہ نیکوکار لوگوں میں سے تھا۔“

☆حضرت نوحؑ۔ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَنَجَّیْنٰہُ وَاَھْلَہٗ مِنَ الْکَرْبِ الْعَظِیْمِ ۵ج وَنَصَرْنٰہُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰھُمْ اَجْمَعِیْنَ ۵ (21/76-77)

”اور جب نوحؑ نے اس سے پہلے ہمیں پکارا تو ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی اور اسے اور اسکے گھر والوں کو بڑے کرب سے نجات دی۔ اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلا رہے تھے ان پر ہم نے اس کی مدد کی یقیناً وہ برے لوگ تھے۔ پس ہم نے ان سب کو ڈبو دیا۔“

☆حضرت ایوبؑ۔ وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ج۵صلے فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ فَکَشَفْنَا مَا بِہٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰہُ اَھْلَہٗ وَمِثْلَھُمْ مَّعَھُمْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِکْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ۵ (21/83-84)

”اور جب ایوبؑ نے اپنے رب کو پکارا کہ میں انتہائی تکلیف میں مبتلا ہوں اور تو رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور جو دکھ انہیں تھا۔ اسے دور کر دیا اور اس کو اہل و عیال عطا فرمائے۔ بلکہ ان کے ساتھ ویسے ہی اور اپنی خاص مہربانی سے تاکہ سچے بندوں کے لیے سبب نصیحت ہو۔“

☆حضرت یونسؑ۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ ق صلے اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ج ۵ صلے فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ لا وَنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْغَمِّ ط وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۵ (21/87-88)

”اور مچھلی والے (حضرت یونسؑ) کو یاد کرو جبکہ وہ غصہ سے چل دیا اور خیال کیا کہ ہم اسے نہ پکڑ سکیں گے۔ بالآخر وہ تاریکیوں کے اندر سے پکار اٹھا کہ الٰہی! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ بے شک میں ظالموں میں ہو گیا۔ تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچا لیا کرتے ہیں۔“

☆حضرت موسیٰؑ۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ ۵ ج قَالَ کَلَّا ج اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ ۵ فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ ط فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ۵ ج وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ۵ ج وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَہٗٓ اَجْمَعِیْنَ ۵ ج ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۵ ج اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ط وَّمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۵ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۵ (26/61-68)

”پس جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ تو موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو یقیناً پکڑے گئے۔ موسیٰؑ نے کہا ہرگز نہیں۔ بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے جو ضرور مجھے راہ دکھائے گا۔ ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجی کہ دریا پر اپنی لاٹھی مارو۔ پس اسی وقت دریا پھٹ گیا اور ہر ایک حصہ پانی کا مثل بڑے پہاڑ کے ہو گیا۔ اور ہم نے اسی جگہ دوسروں کو نزدیک لا کھڑا کر دیا۔ یقیناً اس میں نشانی ہے اور اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور بے شک آپ کا رب بڑا ہی غالب و مہربان ہے۔“

☆حضرت ھودؑ۔ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ (11/58)

"اور جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے ہودؑ کو اور اس کے مسلمان ساتھیوں کو اپنی خاص رحمت سے نجات عطا فرمائی اور ہم نے ان سب کو سخت عذاب سے بچا لیا۔

☆حضرت صالحؑ۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (11/66)

"پھر جب ہمارا فرمان آ پہنچا ہم نے صالحؑ کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو اپنے فضل سے اس سے بھی بچا لیا۔ اور اس دن کی رسوائی سے بھی۔ یقیناً تیرا پروردگار نہایت توانا اور غالب ہے۔"

☆حضرت شعیبؑ۔ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝لا (11/94)

"جب ہمارا عذاب آ پہنچا ہم نے شعیبؑ کو اور ان کے ساتھ تمام مسلمانوں کو اپنی خاص رحمت سے نجات بخشی اور ظالموں کو سخت آواز کے عذاب نے آ دبوچا۔ جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے مردہ ہو گئے۔"

مندرجہ بالا آیات سے یہ واضح ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ مصائب و آلام کا شکار ہوئے تو ان کو اور ان کے جانثار ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے بچایا، ان کو مصیبت سے نجات دلائی اور دکھوں اور تکلیفوں سے چھٹکارا دیا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نَجَّيْنَا، كَشَفْنَا اور نَصَرْنَا جیسے الفاظ استعمال کئے۔ اور کہیں بھی ان مصائب سے نجات کے معاملہ میں "رفع" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اور جب حضرت عیسیٰؑ کو یہود سے بچایا تو اس کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے بلکہ قرینہ سے ہٹ کر "رفع" کا لفظ استعمال کیا۔ اور کہا "رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" جو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہاں معاملہ دیگر انبیاء حضرات سے مختلف ہے۔ وگرنہ ان کے لیے بھی ایسے ہی الفاظ کا استعمال چنداں مشکل نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں سے بچا کر اپنی طرف اٹھا لیا۔ اور دیگر

انبیاء حضرات اپنی اقوام پر عذاب سے چھٹکارا پانے کے بعد یا ہجرت کرنے اور نجات پانے کے بعد اپنی اپنی طبعی موت پر اس جہان سے رخصت ہو گئے۔ اور ان کے بارے میں اللہ تعالی نے یہ بالکل نہیں فرمایا کہ ''پھر انہیں موت آگئی اور وہ اس دنیا سے چلے گئے'' کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اللہ کا فرمان ہے کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ ہر انسان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ تو ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' میں ''میں تجھے وفات دوں گا'' کا معنی کرنے سے یہ چیز غیر ضروری ہے کہ آخر اللہ تعالی نے کیوں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہی کہا کہ میں تجھے ''وفات'' دوں گا۔ پھر جہاں اللہ تعالی نے آیت (4/157) میں یہود کی بات کا جو جواب دیا ہے کہ ''وَمَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا'' اس کے بعد ''بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ'' کی بجائے ''توفّٰی'' یا ''مُتَوَفِّیْہِ'' کے الفاظ آنے چاہئیں تھے کہ عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ اللہ نے انہیں وفات دی۔ مگر الفاظ کا استعمال مفہوم کی تشریح کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ آیت 3/55 میں مُتَوَفِّیْکَ کے معنی ''پورا پورا لے لوں گا'' ہی کئے جا سکتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ تو اس کے لیے آپ اللہ تعالی کی ذات کو پابند نہیں بنا سکتے۔ یَفْعَلُ مَا یَشَآئُ (22/18) وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ (22/14) وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (21/23) اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔

نزول مسیحؑ۔ موجودہ دور میں مسلمان یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قرب قیامت میں وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ اس کے علاوہ امام مہدی اور دجال بھی قرب قیامت میں ظاہر ہونگے۔

اللہ تعالی کی طرف سے ختم نبوت کے اعلان کے بعد قرآن کریم میں کسی بھی نئے آنے والے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ آیئے اس سلسلہ میں پرویز صاحب کا موقف ملاحظہ کرتے ہیں۔

"سادہ لوح مسلمان دور حاضر کی "جدید قادیانی نبوت" کی کامیابی و ناکامی کے اندازے مردم شماری کے اعداد و شمار سے لگاتا ہے اور خوش ہو جاتا ہے کہ دس کروڑ کے سمندر میں اس "نبوت" نے کس طرح اس بحر ذخار کو اس کی اپنی ہی موجوں کے طلسم پیچ و تاب میں الجھائے رکھا اور یوں اس کی وہ قیامت خیز تلاطم انگیزیاں جو دنیا کا نقشہ بدل دینے کے لئے کافی ہو سکتی تھیں اپنے ہی بھنور میں گھر کر ضائع ہو گئیں۔ کیا یہ کامیابی چھوٹی کامیابی ہے؟ مسلمان اس نصف صدی کی روئداد پڑھ پڑھ کر خوش ہوتا ہے کہ ہم نے بحث و جدل کا فلاں میدان مارا۔ اور ہمارے فلاں مولوی صاحب نے فلاں مناظرہ جیتا۔ اور آسمان اس پر ہنس رہا ہوتا ہے کہ

وائے نادانی، قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو

اس تمام طلسم پیچ و تاب کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ چند روایات جن میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بجسد عنصری آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دوبارہ ظاہر ہونگے۔ ان چند روایات نے آجتک مسلمانوں کے پائوں کہیں ٹکنے ہی نہیں دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ہر صدی کے اخیر پر ایک مجدد اور پھر ایک "مہدی آخر الزماں" کی آمد سے متعلقہ روایات۔ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ایک "آنے والے" کے لیے کھڑکی خود کھول دی۔ لیکن جب کوئی اس کھڑکی کے راستے اندر آیا تو اس کے ساتھ گتھم گتھا ہونا شروع ہو گئے۔ ان سے پوچھئے کہ جس دروازہ کو "ختم نبوت" کے عظیم الشان قفل نے بند کیا تھا۔ اس میں اس قسم کے دریچوں اور کھڑکیوں کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ "اس جدید نبوت" کی بحث کا مدار کیا ہوتا ہے؟ پہلے قرآن کی رو سے ثابت کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو چکے ہیں۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔ بات ختم ہو گئی! لیکن بات تو اس کے نزدیک ختم ہو جائے جو قرآن کریم کو دین کا مدار مانے۔ اب وہ آگے بڑھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دیکھئے فلاں روایت میں حضرت عیسیٰؑ کے آنے کی خبر موجود ہے۔ اس لیے وہ آنے والا "مسیح ابن مریم" نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مثیل ہو گا۔ اور وہ مثیل مسیح تشریف لے آئے ہیں۔ بس یہ ہے ساری گتھی۔۔۔ اور اس کا حل؟ کس قدر آسان!! یعنی ان سے کہیئے کہ

i۔ آپ مانتے ہیں کہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو چکے اور ان کے دوبارہ تشریف لانے کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اس لیے

ii۔ کوئی روایت جو حضرت عیسیٰؑ کی آمد کی خبر دیتی ہے وضعی اور جھوٹی ہے جو ہمارے لیے سند نہیں ہو سکتی۔ اب فرمایئے کیا ارشاد ہے؟

لیجئے بحث ختم ہو گئی۔ لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ ان روایات کو محکم اور اٹل سمجھا جاتا ہے۔ اور قرآنی آیات کے معانی اس طرح کئے جاتے ہیں جس سے کسی نہ کسی طرح وہ روایات سچی قرار پا جائیں۔ جب تک آپ کی یہ روش ہے قیامت تک کے لیے مدعیان مسیحیت و مہدیت آتے رہیں گے اور آپ کو انہی لاطائل مسائل میں الجھا الجھا کر ختم کر دیں گے۔"

(شعلہءمستور 135-136)

یہ تھا پرویز صاحب کا نقطۂ نظر نزول مسیح کے بارے میں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ ختم نبوت کے اعلان کے بعد کسی آنے والے کا ذکر قرآن کریم میں موجود نہیں ہے۔ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ آخری نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے باعث رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ قرآن کریم تا قیامت انسانیت کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تو ان چیزوں کی موجودگی میں "کسی بھی نئے آنے والے" کی ضرورت نہیں رہتی۔

حضرت محمدؐ۔ معجزات کے سلسلہ میں ہم نے مختلف انبیائے کرامؑ کے حالات کا جائزہ لیا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں حضرت محمدؐ کو کوئی حسّی معجزہ عطا ہوا یا نہیں۔ قرآن کریم نے اس چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ کہ کفار مکہ آپؐ سے بار بار معجزات کا تقاضا کرتے تھے۔ لیکن آپؐ کا جواب ہوتا کہ "میں تو صرف ڈرانے والا

ہوں" یا"میں تو بشر رسول ہوں" پھر قرآن کریم میں ایک مقام پر اللہ تعالی نے فرمایا کہ ہم نے معجزات کا بھیجنا اس لیے بند کر دیا کہ پچھلے لوگوں نے انہیں جھٹلا دیا۔

لیکن نبی کریمؐ کی ذات کے متعلق قرآن کریم میں مذکور دو مقامات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

1۔واقعہ معراج 2۔ شق القمر

اور مقام حیرت ہے کہ پرویز صاحب نے حضورؐ کی سیرت پر جو کتاب "معراج انسانیت" لکھی ہے۔ اس میں ان دونوں مقامات پر کوئی بحث نہیں کی گئی۔ اور واقعہ معراج کے حوالہ سے سورئہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت، جس کا مفہوم پرویز صاحب بطور "ہجرت" لیتے ہیں۔ "معراج انسانیت" میں جو بات "ہجرت" کے عنوان سے انہوں نے دیا ہے۔ اس میں اس آیت کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

ہاں! ان مقامات کے لیے انہوں نے اپنے آڈیو / ویڈیو دروس میں گفتگو کی ہے۔ اور خاص طور پر سورئہ نجم کے آغاز پر پہلے دو تمہیدی درس صرف مولانا مودودیؒ کے تصور واقعہ معراج پر تنقید میں بیان کئے ہیں۔

اس بات کا اقرار پرویز صاحب بھی کرتے ہیں کہ مخالفین بار بار معجزہ کا تقاضا کرتے تھے۔ آیئے اس بارے میں پرویز صاحب کا نقطۂ نظر دیکھتے ہیں۔

"معجزہ طلبی۔ مخالفین کہتے کہ اگر آپ خدا کی طرف سے رسول ہیں تو کوئی معجزہ دکھایئے، اس کے بغیر ہم کیسے مان لیں کہ آپ مامور من اللہ ہیں۔

☆وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ لَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖط قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ٥
(27/13)

”یہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس شخص پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی (عجیب و غریب) نشانی اترتی؟ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ عجیب و غریب نشانیاں (معجزات) دکھا کر حقیقت کو منوانے کا سوال ہی نہیں، اس کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو شخص عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتا، اسے صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ جو علم و بصیرت کی رو سے، اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کے سامنے راستہ نکھر کر آجاتا ہے۔

سورئہ بنی اسرائیل میں ان مطالبات کی وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے۔

☆وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا۵لا ـــــ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۵ (17/90-93)

”اور یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں، جب تک کہ تو اس قسم کی باتیں کر کے نہ دکھادے، مثلاً ایسا ہو کہ تو حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے، یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اور اس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھادے، یا جیسا کہ تو کہتا ہے کہ ہم پر تباہی آئے گی تو اس کے لیے آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر آگرے، یا اللہ اور اس کے فرشتے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوں۔ یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لیے مہیا ہو گیا ہے۔ ایسا ہو کہ تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور اگر تو آسمان پر چڑھ بھی گیا، تو ہم یہ بات ماننے والے نہیں جب تک تو ایک (لکھی لکھائی) کتاب ہم پر نہ اتار لائے، اور ہم خود پڑھ کر اسے جانچ نہ لیں (اے رسول) ان سے کہہ دے سبحان اللہ! (میں نے کچھ خدائی کا دعوی تو کیا نہیں) میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک انسان ہوں جو تم تک حق کی بات پہنچاتا ہوں۔“

قرآن کریم میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ بار بار معجزات کے لیے تقاضا کرتے تھے۔ اور خدا کی طرف سے ہر بار اس کا انکار ہوتا تھا اور نہایت شدت سے انکار۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کی طرف سے علم و حقائق عطا کئے جانے کے لیے (وحی کا) فوق الفطرت طریق اختیار کیا گیا تو پھر اس وحی کو منوانے کے لیے کوئی خارق عادت عجوبہ کیوں نہ دکھادیا گیا بالخصوص جب مخالفین کی طرف سے اس کے لیے اس قدر تقاضا کیا جاتا تھا۔ یہ سوال غور طلب ہے اور اس کا جواب حقیقت کشا۔

انسانوں کی راہ نمائی کے لیے وحی کا طریق اس لیے اختیار کیا گیا کہ ابدی حقائق اور مستقل اقدار کا تخلیق یا دریافت کر لینا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ اس کے دائرہ عمل سے باہر کی چیز ہے۔(وحی کی کنہ و حقیقت اور عقل انسانی کے دائرہ عمل و حیطہء ممکنات کے متعلق تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ مقام نہیں۔ اس لیے ہم یہاں انہی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔)ان حقائق کو رسول پر منکشف کر کے اس سے کہہ دیا کہ انہیں لوگوں کے سامنے پیش کر دو اور ان سے کہہ دو کہ تم عقل و فکر کی رو سے ان پر غور کرو اس کے بعد اگر تم اس نتیجہ پر پہنچو کہ یہ واقعی صداقت پر مبنی ہیں تو انہیں بطیب خاطر اپنی زندگی کا ضابطہ بنالو۔

آپ نظام کائنات پر غور کریں۔ اللہ تعالی نے تمام اشیائے کائنات کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لیے خدا کی طرف سے وضع کئے گئے ہیں۔ لیکن انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اگر انسان کے اس اختیار کو کسی طرح بھی سلب کر لیا جائے۔ تو یہ اپنی بات کو بہ جبر و اکراہ منوانے کے مرادف ہو گا۔ جس کی دین میں قطعاً اجازت نہیں (لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ قرآن کا واضح ارشاد ہے)۔ اکراہ کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک اکراہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جائے اور اس سے زبردستی اپنی بات منوالے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اکراہ کی شکل یہ ہے کہ انسان کو (مثلاً نشہ پلا کر اس کی) قوت ارادی کو مائوف کر دیا جائے اور اس طرح اس سے کوئی بات منوالی جائے۔ انسانی عقل و فکر کو مائوف کرنے کی ایک صورت اور بھی ہے (مثلاً) ایک شخص آپ سے کوئی بات منوانا چاہتا ہے اور آپ اسے نہیں مانتے۔ اس پر وہ سرخ آنکھیں نکال کر گرجتا ہے اور اپنے بالوں کو نچوڑتا ہے تو ان میں سے دودھ کے قطرے ٹپکنے

لگ جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ آپ کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں اس حالت میں وہ آپ سے کہتا ہے کہ بتائو! میری بات مانتے ہو یا نہیں۔ اور آپ ہاں کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یہ عقل و فکر کو مائوف کر کے بات منوانے کا ایسا طریقہ ہے جس کے مظاہرے ہمارے سامنے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالی اس طرح اپنی بات منوانا نہیں چاہتا۔ وہ انسانی عقل و فکر کو مائوف کر کے اور اس طرح اس کا اختیار و ارادہ سلب کر کے اس کا سر اپنے سامنے جھکانا نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ نظام کائنات غیر متبدل قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے انسانی زندگی کے لیے بھی کچھ قوانین مقرر ہیں جو رسولؐ نے تمہارے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ اگر تم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو تمہیں خوشحالیاں اور سرفرازیاں نصیب ہونگی۔ اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو نقصان اٹھائو گے۔ اب یہ تمہاری اپنی مرضی ہے کہ تم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہو یا ان کے خلاف جانا چاہتے ہو۔"

معراج انسانیت (425-423)

یہ تھا پرویز صاحب کا نقطۂ نظر۔ تصریحات بالا سے دو نکات سامنے آتے ہیں جن پر ہم بحث کریں گے بقول پرویز صاحب

1۔ حضورؐ سے معجزات کا تقاضا کیا گیا اور جواباً اس کا شدت سے انکار ہوتا رہا۔

2۔ انسانی عقل و فکر کو مائوف کر کے اور اس کی قوت ارادی کو سلب کر کے کوئی بات منوانا جبر و اکراہ میں شامل ہے اور اس لیے معجزہ کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ سے معجزات کا تقاضا کیا جاتا تو آپ کا جواب یہی ہوتا کہ معجزہ اللہ کے اختیار میں ہے اور یہ جواب کہیں بھی نہیں دیا گیا کہ یہ طریقہء کار اللہ کے ہاں کبھی روا نہیں رکھا گیا یا یہ کہ اللہ

تعالی تو معجزے دیتا ہی نہیں ہے۔ یا یہ کہ اللہ تعالی معجزہ نہیں دے گا۔ اس لیے تم اس پیغام (قرآن) کو ہی معجزہ سمجھو۔ بلکہ آپ ؐ کا جواب کیا ہوتا۔ اس کے لیے ملاحظہ کرتے ہیں چند آیات۔

☆وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۵ (6/37)

"اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ آپ فرمادیجئے کہ بے شک اللہ تعالی اس بات پر قادر ہے کہ وہ معجزہ نازل فرمائے لیکن ان میں سے اکثر بے خبر ہیں۔"

☆وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۵ (10/20)

"اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوا؟ سو آپ فرمادیجئے کہ غیب کی خبر صرف اللہ کو ہے سو تم بھی منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔"

☆وَقَالُوْا لَوْلَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ط اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَیِّنَةُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۵ (20/133)

"انہوں نے کہا یہ نبی ہمارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتا؟ کیا ان کے پاس اگلی کتابوں کی واضح دلیل نہیں پہنچی؟"

☆فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۵ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ج اَفَهُمْ یُؤْمِنُوْنَ ۵ (21/5-6)

"پس اسے چاہیے کہ ہمارے سامنے کوئی نشانی لائے جیسے کہ اگلے پیغمبر بھیجے گئے تھے۔ ان سے پہلے جتنی بستیاں ہم نے اجاڑیں سب ایمان سے خالی تھیں۔ تو کیا اب یہ ایمان لائیں گے؟

☆وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ۵ لا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا ۵ لا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِیْلًا ۵ لا اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ ط وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ط قُلْ سُبْحٰنَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۵ (17/90-93)

”انہوں نے کہا کہ ہم آپ پر ایمان لانے کے نہیں تاوقتیکہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں۔ یا خود آپ کے لیے ہی کوئی باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا اور اس کے درمیان آپ بہت سی نہریں جاری کر دکھائیں۔ یا آپ خود اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کریں۔ یا آپ کے اپنے لیے کوئی سونے کا گھر ہو جائے یا تو آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم تو آپ کے چڑھ جانے کا بھی اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک کہ آپ ہم پر کوئی کتاب نہ اتار لائیے جسے ہم خود پڑھ لیں۔ آپ جواب دے دیں کہ میرا پروردگار پاک ہے۔ میں تو صرف ایک انسان ہی ہوں جو رسول بنایا گیا ہوں۔“

☆وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ط فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ج وَ مِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ط وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ٥ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ٥ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ م بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ٥ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ٥(29/47-51)

”اور ہم نے اسی طرح آپ کی طرف اپنی کتاب نازل فرمائی ہے پس جنھیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے تو آپ کوئی کتاب پڑھتے نہ تھے اور نہ کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے کہ یہ باطل پرست لوگ شک شبہ میں پڑتے۔ بلکہ یہ قرآن تو روشن آیتیں ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اور ہماری آیتوں کا انکار صرف ظالم لوگ ہی کرتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر کچھ نشانات اس کے رب کی طرف سے کیوں نہ اتارے گئے۔ آپ کہہ دیجئے کہ نشانات تو سب اللہ کے پاس ہیں۔ اور میں صرف واضح طور پر آگاہ کر دینے والا ہوں۔ کیا انھیں یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل فرما دی جو ان پر پڑھی جا رہی ہے۔ اس میں رحمت بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان دار ہیں۔“

متذکرہ بالا آیات میں تو معجزہ کا اثبات ہی ملتا ہے انکار نہیں۔ وگرنہ کس قدر آسان تھا کہ نبی کریمؐ کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ تو کسی کے ذہن کو ماؤف کر کے بات نہیں منواتے۔ اس لیے آپ لوگ معجزہ کا تقاضا مت کریں لیکن ان آیات میں یہی کہا گیا کہ معجزہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے جیسا کہ سابقہ انبیائے کرام کے معاملہ میں ہوا۔ اور اللہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے۔ پھر آیت (29/47-51) میں بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جہاں وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ٥ اور وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ٥ سے مراد قرآن کریم کی آیات لیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی کہا کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی "آیت" یعنی "معجزہ" آپؐ پر کیوں نہیں اتارا گیا۔ یہاں "آیت" کا لفظ ساتھ ساتھ استعمال میں لا کر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ آخری والا لفظ "آیت" کسی نشانی، معجزہ اور مافوق الفطرت واقعہ کے لیے استعمال ہو رہا ہے جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اور یہاں بھی جواب انکار میں نہیں ہے بلکہ کہا گیا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط کہ اے نبیؐ! ان سے کہہ دو کہ نشانیاں اللہ کے پاس موجود ہیں۔ اس قدر واضح آیات کے باوجود اگر کوئی یہ کہے کہ میں انبیائے کرام نے جو معجزات دکھائے ان کو نہیں مانتا یا ان کی کوئی اور توجیہ کرتا ہوں۔ تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ معجزات کے ذریعے (معاذاللہ) اللہ اپنی بات زبردستی منوانا چاہتا ہے تو یہ قیاس غلط ہے۔ کیونکہ ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ویسے ہی فرما چکے ہیں کہ "اگر وہ چاہتا تو سب انسانوں کو ہدایت دے دیتا۔" پھر آپ دیکھیں کہ حضرات انبیائے کرامؑ نے جتنے بھی معجزات دکھائے تو وہ معجزہ دیکھنے والے تمام لوگوں نے قبول نہیں کئے۔ بلکہ کچھ نے قبول کیا اور کچھ نے جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے۔ اس لیے معجزہ سے مقصود اگر قوت ارادی سلب کر کے، ذہن کو ماؤف کر کے اور اختیار و ارادہ بے بس کر کے اپنی بات منوانا ہوتا تو پھر تو فرعون بھی ایمان لے آتا۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ معجزہ کا اصل مقصد کیا ہے

☆وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ‌ؕ وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا‌ؕ وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا۝

(59/17)

"اور ہم نے نشانات (معجزات) کے نازل کرنے سے روک صرف اس لیے کی ہے کہ پچھلے لوگ انہیں جھٹلا چکے ہیں اور ہم نے قوم ثمود کو بطور نشان کے اونٹنی دی لیکن انہوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور ہم تو صرف لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہی معجزات بھیجتے ہیں۔"

اس آیت میں بھی معجزہ کا اثبات ہی ہے۔ آخر کوئی چیز Exist کرتی ہے تو اللہ تعالی نے اس کی روک کی۔ پھر وضاحت سے کہہ دیا کہ قوم ثمود کو تو اونٹنی دی تھی۔ وہ کیا تھی جس کا اللہ تعالی نے بار بار تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ اونٹ اور اونٹنی تو تقریباً تمام زمانوں اور قوموں میں موجود رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالی نے معجزہ کا مقصد بیان کر دیا کہ تکبر، غرور، سرکشی اور یہاں تک کہ جہالت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لیے جب وعظ و نصیحت نے کام نہ کیا تو پھر ان کو نشانیاں دکھائی گئیں تاکہ وہ ڈر کر ہی اس بات پر ایمان لے آئیں کہ خدا صرف ایک ہی ہے جو ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔

اب آتے ہیں اس نکتہ کی طرف کہ آیا حضورؐ کو کوئی معجزہ عطا کیا گیا یا نہیں۔ اس سلسلہ میں ہم جائزہ لیں گے پرویز صاحب کے تصور کا ان دو مقامات کے بارے میں جن کا تذکرہ قرآن کریم نے کیا یعنی "واقعہ معراج" اور "شق القمر"۔

ویسے "معراج" کے نام سے قرآن کریم نے کسی واقعہ کو موسوم نہیں کیا بلکہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت سے ہی ہمارے علماء نے اس کو "معراج" کے نام سے موسوم کر دیا۔ آیئے دیکھتے ہیں پرویز صاحب اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

☆ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝ (17/1)

"پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لیے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کہا! کیا بات ہے ان کی تدبیروں کی! آپؐ کی ذات کے خلاف کفار نے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ انتہائی تدبیر یہ تھی کہ کس طرح سارے قبائل کا ایک ایک نمائندہ مل کر آپؐ کو راتوں رات قتل کر دیا جائے۔ تاکہ روز روز کا ٹنٹا ہی ختم ہو جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ تیرہ سال ہوگئے ہیں اس نے مستقل طور پر زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ اس کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے ان کے متعلق کہا "گھبراؤ نہیں۔ یہ دیکھو کہ وہ ان کی گرفت سے کتنا اونچا ہے، جس نے یہاں ان کے لیے تدبیر کی اور وہ راتوں رات ان کو یہاں سے نکال کر مدینے کی طرف لے گیا۔"

(مطالب الفرقان فی دروس القرآن۔ صفحہ 23 سورۂ بنی اسرائیل)۔

"یہ عجیب چیز ہے اور ہاں! عجیب بات ہے کہ میں نے تو اب مفہوم القرآن میں، بلکہ اس سے بھی پہلے، جب یہ چیز دیکھی تھی کہ سورۂ بنی اسرائیل میں مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے تو یہ حضورؐ کی شب ہجرت کے واقعہ کا بیان ہے اور اس سے مراد "مدینہ" ہے مکہ سے مدینہ کی طرف جانا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عجیب بات ہے انسان ہمہ توکل تو کسی وقت نہیں ہو سکتا۔ میرے سامنے یہ تاریخ نہیں تھی۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو قرآن کریم میں، صرف قرآن میں، غور و تدبر کے بعد، ایک نتیجہ نکالا تھا کہ یہ شب ہجرت کا بیان ہے وہ میں نے لکھ دیا تھا۔

لیکن مدینہ کے نام کے سلسلہ میں بڑی تلاش میں رہا کہ شاید کہیں سے میرے تدبر قرآن کو تصویب مل جائے اس کے بہت عرصہ بعد میں نے مصر سے ایک قرآن کریم منگوایا۔ اس میں اس کے حاشیے پر یہ چیز لکھی ہوئی تھی کہ ''مسجد اقصیٰ سے مراد مدینۃ الیثرب ہے'' پوچھیے نہیں اس دن مجھے اس بات سے کس قدر خوشی ہوئی۔ یہ اللہ کا کتنا فضل ہے کہ ایک بات جو میں نے محض اپنی فکری بنیاد پر لکھی تھی، اس کی ایک تائید ملی۔ پھر مجھے اس کی تلاش ہوئی کہ یہ انہوں نے کیسے لکھا۔ آپ حیران ہونگے کہ اس کے بعد مجھے یہ تاریخیں مل گئیں اور ان تاریخوں میں ایک چیز یہ مل گئی کہ مدینہ کا نام ''مسجد اقصیٰ'' تھا اور خود وہ خچر جس پر سوار ہو کے حضورؐ نے یہ سفر مکے سے مدینے تک کیا تھا اس خچر کا نام ''اسریٰ'' رکھ دیا گیا تھا۔ حضورؐ نے اس خچر پر کئی سفر کئے ہیں اور ہماری تاریخ میں اس کا یہ نام رکھا ہوا تھا۔ میں حیران ہوا کرتا تھا کہ اس کا نام یہ کیسے پڑ گیا۔ اب آ کے یہ عقدہ کھلا کہ یہ وہی خچر تھا جس پر حضورؐ نے یہ سفر ہجرت کیا تھا۔ وہ ''مسجد اقصیٰ'' تو وہاں پہلے سے موجود تھی۔ یہ تو مدینے کا نام مسجد اقصیٰ تھا جیسے مسجد الحرام سے صرف کعبہ ہی مراد نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اس سے پورا مکہ مراد ہوتا ہے خود قرآن میں یہ ہے کہ انہوں نے تمہیں اور وہاں کے رہنے والوں کو مسجد الحرام سے نکال دیا اور جب وہ مدینے میں آئے تو اس سے مراد کعبہ کے رہنے والے نہیں تھے۔ کعبہ میں تو کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کا انداز بیان ہے مدینے کا نام ''مسجد اقصیٰ'' تھا اور مسجد تو اب ہمارے ہاں چار دیواری کے اندر گھری ہوئی رہتی ہے۔ ورنہ مسجد تو حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ''کل روئے زمین کا تخت، مسلمان کی مسجد ہے''۔ یہ جہاں بھی کھڑا ہو کے اپنے خدا کی اطاعت کرے گا، وہی جگہ مسجد کہلائے گی۔ یہ کسی عمارت کا نام نہیں ہے عزیزان من۔ یہ الگ بات ہے کہ اجتماع کے لیے عمارت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے مسجد صرف اس عمارت کو ہی نہیں کہتے بلکہ جس مقام پر بھی خدا کے قوانین کی بات اونچی ہو گی، غالب آئے گی، اس کے لیے وہ سرزمین مسجد تصور ہو گی۔ (مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ بنی اسرائیل۔ صفحہ 44-45)

پرویز صاحب کی ان تشریحات کے بعد اب ہم قرآن کریم کی اس آیت کا کیا مفہوم کریں گے ؟ جس میں "اسری" خچر ہو، مسجد حرام سے مراد پورا "مکہ" ہو اور مسجد اقصی سے مراد "مدینہ" ہو ؟

پرویز صاحب کے نزدیک یہ ہجرت کا واقعہ ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ کیونکہ ایک ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصی تک کا سفر عقلی ضابطوں پر پورا نہیں اترتا۔ اس لیے پرویز صاحب کو اس آیت کی ایسی تشریح کرنا پڑی۔

ان تشریحات پر تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ قرآنی آیت اپنی جگہ واضح ہے۔ اور یہ ایک رات یا رات کے کچھ حصے کا سفر ہے۔ مسجد حرام سے مسجد اقصی تک کا۔ جس میں اللہ نے اپنے بندے، یعنی محمدؐ کو کچھ نشانیاں دکھائیں۔

قرآن کریم نے اس واقعہ کی مزید تفصیلات بیان نہیں کیں۔ بات صرف اتنی ہی ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اسی پر ہی اکتفا کیا جاتا۔ مگر اس میں قصے کہانیاں اور افسانہ طرازیاں اس انداز سے کی گئی ہیں کہ بات کچھ کی کچھ ہو کر رہ گئی ہے اور مفسرین کرام نے اللہ سبحانہ و تعالی اور نبی کریمؐ کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا۔ پھر آسمانوں کی سیر وغیرہ۔ حالانکہ قرآن کریم نے ایسی کوئی تفصیلات بیان نہیں کیں، اور پرویز صاحب کی ان قصہ کہانیوں پر تنقید بجا ہے۔ (تفصیل کے لیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن۔ سورئہ بنی اسرائیل اور سورئہ نجم ویڈیو درس، پہلی دو کیسٹس ملاحظہ فرمائیں۔)

یہ واقعہ اللہ تعالی اور نبی کریمؐ کے درمیان ہوا۔ اس کو بطور معجزہ اس وقت کے انسانوں کے سامنے نہیں دکھایا گیا۔ لوگوں کو صرف اس کی اطلاع دی گئی اس پر امنا و صدقنا ہی کہنا چاہیے تھا۔ مگر کتب روایات و تفاسیر میں ایسی باتیں شامل کی گئیں جو نہ تو عقلی طور پر میل کھاتیں اور نہ ان کو قرآنی دلائل کی سہولت میسر تھی۔

یہ تھا واقعہ معراج، اب دیکھتے ہیں شق القمر کا واقعہ۔

☆اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ٥ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَۃً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ٥ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ٥ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ٥لا حِكْمَۃٌم بَالِغَۃٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ٥لا فَتَوَلَّ عَنْهُمْ م يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ٥لا خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ٥لا مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ط يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ٥ (8-1/54)

قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ یہ اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ زور دار چلتا ہوا جادو ہے۔ انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام ٹھیرے ہوئے وقت مقرر پر ہے۔ یقینا ان کے پاس وہ خبریں آچکی ہیں جن میں ڈانٹ ڈپٹ کی نصیحت ہے اور کامل عقل کی بات ہے۔ لیکن ان ڈرائونی باتوں نے بھی کچھ فائدہ نہ دیا۔ پس اے نبیؐ تم ان سے اعراض کرو جس دن ایک پکارنے والا ناگوار چیز کی طرف پکارے گا۔ یہ جھکی قبروں سے اس طرح نکل کھڑے ہونگے کہ گویا وہ پھیلا ہوا ٹڈی دل ہے۔ پکارنے والے کی طرف دوڑتے ہونگے اور کافر کہیں گے یہ دن تو بہت سخت ہے۔"

اب دیکھتے ہیں پرویز صاحب نے اس کا کیا مفہوم کیا ہے۔

1۔ وہ انقلاب کی گھڑی (جس کے متعلق ان سے اتنی مدت سے کہا جارہا تھا) بالکل قریب آپہنچی ہے اب ان مخالفین عرب کی قوت و شوکت ختم ہوجائے گی۔ اور ان کا پرچم (جس پر قمر کا نشان ہے) ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا۔

2۔ اس آنے والے انقلاب کی کئی ایک علامات ان کے سامنے آچکی ہیں۔ لیکن ان کی سرکشی اور مدہوشی کا یہ عالم ہے کہ یہ ان پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کرتے۔ بلکہ الٹے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب وہی جھوٹے افسانے ہیں جنہیں ہم ایک عرصہ سے سنتے چلے آئے ہیں۔

3۔ یہ اس انقلاب سے متعلق ہر بات کو جھٹلاتے ہیں اور بدستور اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ (اور جب ان سے ذرا زور سے کہئے تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ جس تباہی کے متعلق یوں دھمکیاں دی جا رہی ہیں اسے لے کر کیوں نہیں آتے۔ انہیں معلوم نہیں کہ) اعمال کے نتائج اپنے وقت پر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں۔

یہ تھا پرویز صاحب کا مفہوم۔ ظاہر ہے اس میں گرامر کے قواعد و ضوابط، تراجم کے اسلوب، لسان العرب، سیاق وسباق و دیگر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ یہ ان سب سے وراء پرویز صاحب کے ذہن کی اختراع ہے۔ جس میں چاند کے پھٹنے کو پرچم کے پھٹنے پر محمول کیا گیا۔ حالانکہ دوسری آیت پہلی آیت کو مزید واضح کر رہی ہے کہ " اگر وہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ زور دار چلتا ہوا جادو ہے۔" پرچم کا پھٹنا تو جادو نہ تھا۔ جبکہ چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا جادو ہی ہو سکتا ہے۔ (ان لوگوں کی نظر میں)۔ جبکہ وہ تو معجزۂ خداوندی تھا۔

{☆☆☆☆☆}

باب چہارم: قانون

علامہ غلام احمد پرویز کے لٹریچر میں اور ان کی تقاریر میں ایک چیز جو سب سے زیادہ ملے گی وہ ہے لفظ ''قانون'' یا ''قانون مکافات عمل''۔ اس کے بارے میں ان کا تصور یہ ہے کہ انسانی دنیا میں کوئی بھی کام اور حرکت قانون کی کارفرمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں پر عمل اور حرکت کے پس منظر میں علت اور معلول (Cause & Effect) کارفرما ہے۔ اور اس عمل میں خدا تعالی کی ذات بھی کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ یعنی انسانی دنیا کے معاملات میں خدا تعالی بھی قانون کا پابند ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کے ایسے تمام مقامات جہاں مافوق الفطرت واقعات کا تذکرہ ملتا ہے۔ پرویز صاحب نے ان کی توجیہ ایسے انداز میں کی ہے کہ ان کو قانون کا پابند کر دیا ہے۔ اس کے لیے انہیں تحریف / ایجاد لغت کے غیر معمولی استعمال، سائنسی شواہد اور الفاظ کے بیان کا سہارا لینا پڑا۔ اور اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ ان کا پیش کردہ مفہوم عربی گرائمر اور سیاق وسباق پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ قرآن کریم نے ''قانون'' کے لیے کسی واضح لفظ کا استعمال نہیں کیا لیکن پرویز صاحب نے اسے کیسے اخذ کیا۔ آیئے انہی کے الفاظ میں دیکھتے ہیں۔

'' اس سلسلہ میں ایک لفظ کا ذکر خصوصیت سے کرنا ضروری ہے جو آپ کو زیر نظر لغت میں بکثرت ملے گا۔ وہ لفظ ہے ''قانون''۔ ہمارے ہاں قانون سے عام طور پر مفہوم وہ (Laws) لئے جاتے ہیں جن کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن لفظ قانون کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ قانون سے مراد ایسے محکم اصول ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ مثلاً ''قانون فطرت'' سے مراد ہیں وہ لگے بندھے اصول وضوابط جن کے مطابق خارجی کائنات کا محیر العقول سلسلہ اس نظم وضبط سے چل رہا ہے۔ ''قوانین خداوندی'' سے مراد ہیں انسانی زندگی سے متعلق وہ اصول وضوابط جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ وقس علی ذلک۔ لہذا اس لغت میں جہاں یہ لفظ (قانون) آئے سیاق وسباق کے مطابق اسکا مفہوم سمجھ لینا چاہئے۔''

(لغات القرآن۔28)

یہ تو تھا قانون کا ایک تعارف۔ لیکن یہ لفظ آیا کہاں سے اس کے بارے میں لغات القرآن میں امر (ام ر) کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

"قرآن کریم میں خَلْقٌ کے مقابلہ میں اَمْرٌ کا لفظ آیا ہے (7/54)۔ اور اس کا ایک خاص مفہوم ہے جس کے سمجھنے کے لیے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یعنی علامت۔ اشارہ۔ راہ نمائی نیز ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نشو و نما کے بھی ہیں۔ اور (جیسا کہ عنوان خ۔ل۔ق میں لکھا گیا ہے) خَلْقٌ کے معنی ہیں مختلف عناصر میں نئی نئی تراکیب سے نئی نئی چیزوں کو پیدا کرنا۔ خَلْقٌ پیدائش کا یہ وہ مرحلہ ہے جب اشیاء بالعموم اپنی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اشیاء کے اس طرح وجود میں آنے سے پہلے بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے جب یہ ہنوز تدبیری حالت (In the Process of Becoming) میں ہوتی ہیں۔ "یہ تدبیری مرحلہ" عالم امر سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ کائنات میں ایک تو اشیائے کائنات ہیں (مثلاً سورج۔ چاند۔ ستارے۔ زمین۔ درخت وغیرہ) اور دوسرے وہ قانون ہے جس کے مطابق یہ تمام اشیائے کائنات ایک نظم و ضبط کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ اس قانون کو بھی اَمْرٌ کہتے ہیں۔ (اس کا تفصیلی تعارف مشیت کے ضمن میں عنوان ش۔ی۔ ا کے ماتحت ملے گا)۔

اشیا کی "تدبیری حالت" کے متعلق قرآن کریم میں ہے اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (2/117)

"جب وہ ایک تدبیر (امر) کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس امر سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔" یہ امر کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح متشکل ہوتا ہے اسکے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمارا عالم محسوسات کی دنیا تک محدود ہے اور یہ امور عالم محسوسات سے آگے کی باتیں ہیں۔ مشہور مفکر Pringle Attison کہتا ہے کہ یہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے جس میں تخلیق کے لیے صرف ایک لفظ (Creation) ہے۔ حالانکہ محسوس کائنات کی تخلیق اور غیر مرئی و غیر محسوس کی تخلیق میں جو اہم فرق ہے اس کے اظہار کے لیے ضروری تھا کہ دو الگ الگ الفاظ ہوتے۔ قرآن نے اس کے لیے خلق اور امر الگ الگ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

امر کا دوسرا حصہ، جس سے مفہوم وہ قانون خداوندی ہے جو کائنات کے رگ و پے میں کار فرما ہے۔ ہمارے سامنے ہے اور اس کے متعلق ہم علم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی صرف اس حد تک کہ فلاں چیز کس قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ وہ قانون ایسا کیوں ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ یہ اس کا قانون ہے۔ لیکن پانی کو کیوں ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اَمرٌ (یعنی قانون کائنات) کی شہادتوں سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ وَالشَّمسَ وَالقَمَرَ والنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمرِہٖ (7/54) سورج، چاند، ستارے، خدا کے امر (قانون) کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ وَالفُلکَ تَجرِیْ فِی البَحرِ بِاَمرِہٖ (22/65) کشتی سمندر میں اس کے امر (قانون) کے مطابق چلتی ہے۔ آیت (24/12) میں اِذنٌ اور اَمرٌ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ (اذن کے معنے بھی قانون خداوندی ہیں۔ دیکھئے عنوان 'اذن')

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی کائنات (Physical world) میں تمام اشیاء ایک خاص قانون کے تحت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ہر نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی (اقوام کا) عروج و زوال اور زندگی اور ہلاکت ایک خاص قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ یہ مکافات عمل کا قانون ہے اور اسے بھی اَمرٌ کہا گیا ہے۔

لِیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمرًا کَانَ مَفْعُوْلًا ۵ لِّیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْ بَیِّنَۃٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَۃٍ (8/42) (یہ سب اسلئے ہے کہ) خدا کا امر پورا ہو کر رہے۔ یعنی جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے، وہ بھی دلیل و برہان کے مطابق زندہ رہے" یہ اَمرٌ (قانون مکافات عمل) وہ ہے جس کی نتیجہ خیزی میں کسی انسان کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کوئی انسان اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ رسول بھی نہیں۔ لَیْسَ لَکَ مِنَ الاَمرِ شَیْءٌ (3/127) اے رسول تجھے اس قانون میں کوئی دخل نہیں۔ یہ امر (قانون) جس کا تعلق انسانی اعمال سے ہے وحی کے ذریعے (رسولوں) کو ملتا ہے اور ان کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو۔ وَاٰتَیْنٰھُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ

الْاَمْرِ (17/45) "اور ہم نے انہیں امر کی واضح باتیں دیں۔" یا "ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ اَنْزَلَہٗ اِلَیْکُمْ (5/65) "یہ خدا کا امر (قانون) ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔"

لہٰذا خدا کے امر کے تین گوشے ہیں۔ ایک وہ جہاں ہر قانون متعین ہوتا ہے اور ہر تدبیر بنائی جاتی ہے۔ اس گوشے کی حقیقت و کیفیت کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ دوسرا گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا امر، قانون کائنات کی شکل میں کارفرما ہے۔ یہ قانون ہر شے کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کا علم تجربہ، عقل، بصیرت اور مشاہدات کی رو سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور تیسرا گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا قانون انسانوں کی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ قانون وحی کی رو سے رسولوں کو ملتا ہے اور رسولوں کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو۔ یہ قانون قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ جس کے مطابق قوموں کی موت اور زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اور ہر انسان زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ گوشہء اول میں خدا اپنے ارادے اور مشیت کے مطابق جس طرح کا قانون چاہتا ہے مرتب کرتا ہے۔ گوشہء دوم میں خدا اپنی اسکیم کو اپنے مرتب فرمودہ قوانین کے مطابق چلاتا ہے۔ اور اشیائے کائنات اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ گوشہء سوم میں خدا کا قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے لیکن انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو اس کی اطاعت کریں اور جی چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کر لیں۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کرے گا۔ اسی کے مطابق نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ خدا کا امر (قانون) خارجی کائنات سے متعلق ہو یا انسانی زندگی سے، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ یہ بھی خدا کا فیصلہ ہے۔" (لغات القرآن 257-259)

پرویز صاحب نے اس کتاب کا نام "لغات القرآن" رکھا ہے حالانکہ اس کتاب کے انداز بیان کی رو سے یہ نام غیر مناسب ہے۔ لغت کا مطلب ہوتا ہے الفاظ کے معانی۔ اور لغات القرآن کا مطلب ہے قرآن کریم میں موجود الفاظ کے معانی۔ لیکن اس کتاب کے طرز تحریر میں پرویز صاحب کے ذاتی تصورات و خیالات کا غلبہ ہے۔ اب پرویز صاحب نے اس کا بالکل ذکر نہیں کیا کہ لغت کے لحاظ سے امر کا معنی قانون ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس لفظ کو

ان معنوں میں ہی استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک عالم امر کا تعلق ہے۔ تو قرآن کریم میں اس کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ تین گوشے جو پرویز صاحب نے بیان کئے ہیں۔ پرویز صاحب نے یہ ساری تمہید صرف اپنے ذاتی مفہوم کو ٹھونسنے کے لیے بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ پرویز صاحب کا یہ عمومی انداز ہے کہ وہ آیات میں سے دو تین الفاظ لے کر اس کو بطور حوالہ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ پوری آیت سامنے لائی جائے تو بات کچھ اور بنتی ہے۔ اب اوپر پرویز صاحب نے ایک حوالہ دیا ہے "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (3/127) اے رسول تجھے اس قانون میں کوئی دخل نہیں۔" پوری آیت اور اس سے پچھلی آیت سامنے لائیں تو بات یوں بنتی ہے۔

☆ لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْ یَکْبِتَھُمْ فَیَنْقَلِبُوْا خَآئِبِیْنَ ٥ لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ ٥ (3/127-128)

" (تاکہ اللہ) کافروں کی ایک جماعت کو کاٹ دے یا انہیں ذلیل کر ڈالے اور سارے کے سارے نامراد ہو کر واپس چلے جائیں۔ اے پیغمبرؐ آپ کے اختیار میں کچھ نہیں۔ اللہ تعالی چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے یا عذاب دے۔ کیونکہ وہ ظالم ہیں۔"

اب اس ٹکڑے میں امر کا مطلب قانون نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ واضح کر دیا گیا کہ پیغمبرؐ کو اس سلسلے میں کوئی اختیار نہیں اور اختیار صرف اللہ تعالی کے پاس ہے۔ اور وہ چاہے تو انہیں عذاب دے یا ان کی توبہ قبول کر لے اور اس آخری ٹکڑے نے یہ بات مزید واضح کر دی کہ اللہ تعالی بھی قانون کا پابند نہیں ہے۔ اس کے بعد پرویز صاحب ایک اور ٹکڑا پیش کرتے ہیں۔ "ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ اَنْزَلَہٗٓ اِلَیْکُمْ (65/5) یہ خدا کا امر (قانون) ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔" اس آیت اور اس سے پچھلی آیت کو بھی ہم سامنے لاتے ہیں۔

☆وَالّٰٓئِیۡ یَئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِیۡضِ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡهُرٍ وَّالّٰٓئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ ط وَاُولَاتُ الۡاَحۡمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنۡ یَّضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ط وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ یُسۡرًا ۵ ذٰلِکَ اَمۡرُ اللّٰهِ اَنۡزَلَهٗۤ اِلَیۡکُمۡ ط وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُکَفِّرۡ عَنۡهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُعۡظِمۡ لَهٗۤ اَجۡرًا ۵ (5-4/65)

”تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو گئی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے بچے کا پیدا ہو جانا ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالی سے ڈرے گا اللہ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہارے پاس بھیجا ہے اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا اور اسے بڑا بھاری اجر دے گا۔“

پرویز صاحب نے ایک چیز کو بالکل فراموش کر دیا ہے کہ قانون اور حکم دو الگ الگ چیزیں بھی ہیں۔ فطری قوانین کی خلاف ورزی پر سزا فوری طور پر اثر کرتی ہے۔ جیسے آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ جھلس جاتا ہے۔ یا پانی میں ڈوبنے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور انسانی قوانین کی خلاف ورزی پر بھی ایکٹ لاگو ہو جاتا ہے۔ جیسے قتل کے کیس میں یا ڈکیتی کے کیس میں سزا واجب ہو جاتی ہے۔ یہ ہے قانون۔ مگر جہاں تک اللہ تعالی کے احکام ہیں تو ان میں ترغیب کا پہلو سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں فوری سزا لاگو نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص کی ساری زندگی گناہوں میں گزرتی ہے مگر ایک مقام پر آکر وہ توبہ کر لیتا ہے اور صالح زندگی گزارنا شروع کر دیتا ہے۔ تو یہ اللہ تعالی کا اختیار ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے سارے گناہوں کو بخش دے۔ سابقہ اقوام کے سلسلہ میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نبیؑ کا کام آخر وقت تک اس جدوجہد میں ہی رہنا ہے کہ اس کی قوم بد اعمالیوں کو چھوڑ کر اچھے عمل شروع کر دے۔ اور اس کے لیے بعض اوقات ڈرانے کے لیے معجزات کا ظہور بھی ہوتا رہا۔ چونکہ انسان اختیار و ارادہ سے عبارت ہے اس لیے اسے قوانین کی جکڑ بندیوں میں قید رکھنا ناممکن ہے۔ لہذا اللہ کے قانون اور اللہ کے حکم کا فرق محلِ نظر رہنا ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ”امر“ کا لفظ قرآن میں ہر جگہ ”قانون“ کے معنی ہی میں استعمال ہوا ہو۔ بلکہ بہت سارے مقامات پر اس کا

استعمال حکم، معاملہ، کام اور دیگر معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جن کی تفصیل ہم آگے دیکھیں گے۔ پہلے ایک نظر ڈالتے ہیں پرویز صاحب کے "عالم خلق" اور "عالم امر" سے متعلق تصور پر۔

عالم خلق۔ عالم امر۔ خدا اس وقت بھی خدا تھا جب یہ کائنات ظہور میں آئی تھی اور اس وقت بھی خدا رہے گا جب یہ سلسلہ باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا "خدا کی دنیا" اس کی تخلیق کردہ کائنات ہی نہیں۔ اس سے ماورا اور بھی ہے۔ قرآن کریم نے اسی جہت سے "خدا کی دو دنیاؤں" کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام ہے عالم امر، جو خدا کی تخلیق کردہ کائنات سے ماورا ہے۔ اور دوسرا ہے عالم خلق، جو خدا کی پیدا کردہ کائنات پر مشتمل ہے۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (54/7) آگاہ رہو کہ عالم خلق اور عالم امر دونوں خدا کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کا تعلق عالم خلق سے ہوگا، عالم امر سے نہیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں نہ کوئی معلول (Effect) بغیر علت (Cause) کے وجود میں آسکتا ہے۔ اور نہ کوئی شے کسی پہلے سے موجود مسالہ (Material) کے بغیر وجود پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ لیکن اس کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ عالم امر سے نہیں۔ خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ یعنی اس نے اسے کسی پہلے سے موجود مسالہ کے بغیر پیدا کر دیا۔ اس کا یہ فیصلہ کہ ایسی کائنات ظہور میں آنی چاہیے اور پھر اس کا یہ عمل، جس سے اس نے اسے پیدا کر دیا۔ قانون علت و معلول اور (دنیا میں) نظام تخلیق و تولید کے یکسر خلاف ہے۔ ان امور کا تعلق عالم امر سے ہے۔ جس میں کوئی قانون نہیں بلکہ خدا کا ارادہ کار فرما ہوتا ہے۔ یہی "خدا کی وہ دنیا ہے" جہاں یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ (22/14) وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (11/107) یقیناً تیرا رب اپنے ارادے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (5/1) وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہے فیصلہ کرتا ہے۔ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (22/18) وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (21/23) اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔ (کتاب التقدیر 35-36)

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عالم امر میں ہر فیصلہ یا ہر کام، خدا کے اختیار مطلق اور ارادۂ کامل کے ماتحت سر انجام پاتا ہے۔ وہاں کوئی لگا بندھا قانون نہیں جس کے مطابق ہر فیصلہ صادر ہو۔ لیکن عالم خلق میں خدا کا امر قاعدے اور قانون کی چار دیواری میں محدود ہو جاتا ہے۔ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرًا (33/38) خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔ اور اس طرح قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا (65/3) خدا نے ہر شے کے لیے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس چیز کو قرآن نے قدر کہہ کر پکارا ہے۔ اسے ہماری اصطلاح میں قانون فطرت (Law of Nature) کہا جاتا ہے۔ لہذا، قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا (65/3) کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اشیائے کائنات کے لیے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق وہ وجود میں آتی، بڑھتی، پھولتی، پھلتیں اور اس کے بعد معدوم ہو جاتیں۔ (یا کوئی دوسری ہیئت اختیار کر لیتی ہیں۔) (کتاب التقدیر 39-40)

4۔ اجمالی طور پر تمام اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِيۡرًا (25/2) اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس کے لیے ایک اندازہ اور پیمانہ مقرر کر دیا۔ بلکہ ہر شے کو پیدا ہی ایک خاص پیمانے کے مطابق کیا۔ اِنَّا كُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ (54/49) سورۂ الاعلیٰ کی وہ دو آیتیں بڑی غور طلب ہیں جن میں کہا کہ اَلَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰى ۙ (87/2-3) خدا نے ہر شے کی تخلیق کا آغاز کیا۔ پھر اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے۔ اس کا تناسب قائم کیا۔ پھر اس کے لیے ضروری پیمانے مقرر کئے اور اس کے اندر اس امر کی راہ نمائی رکھ دی کہ وہ ان پیمانوں کے مطابق اپنی نشو و نما کس طرح کر لے۔

5۔ اب آپ اس گوشے کی طرف آیئے جس میں اس لفظ (قدر) کا مفہوم، عصر حاضر کی اصطلاح میں (قانون فطرت) کے مطابق زیادہ وضاحت سے سامنے آجاتا ہے۔ ہمارے ہاں (اب) ابتدائی جماعتوں کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ دن اور رات، ایک دوسرے کے بعد کس طرح آتے ہیں۔ یہ زمین کی گردش کا نتیجہ ہیں اور اس کی گردش ایک لگے بندھے قانون کے مطابق ہو رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دن اور رات (طلوع اور غروب آفتاب) کے اوقات اس حتم ویقین کے ساتھ متعیّن کر لیے جاتے ہیں کہ ان میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔ اس کے متعلق کہا کہ وَاللّٰہُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ (20/73) اللہ نے دن اور رات کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ اسی طرح چاند کے متعلق کہا وَقَدَّرَہٗ مَنَازِلَ (5/10) خدا نے اس کی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔

اس کے بعد دیکھئے کہ لفظ تقدیر کے معنی کس قدر واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں کہا کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا۔ سورج (نظام شمسی) بھی اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (12/41) (یہ خدا کے مقرر کردہ پیمانے، قوانین ہیں) ان تصریحات سے واضح ہے کہ تقدیر کے معنی قانون فطرت کے ہیں نہ کہ "انسان کی قسمت" کے۔ (کتاب التقدیر 41)

متذکرہ بالا تصریحات میں پرویز صاحب کا کہنا یہ ہے خدا کی دو دنیائیں ہیں ایک عالم امر، جو خدا کی تخلیق کردہ کائنات سے ماوراہے اور دوسرا ہے عالم خلق۔ جو خدا کی پیدا کردہ کائنات پر مشتمل ہے۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (54/7) جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ قرآن کریم میں ایسی کسی تقسیم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ پرویز صاحب نے قرآنی آیت کا صرف ایک ٹکڑا اس کے ثبوت میں پیش کر دیا ہے۔ آیئے ہم ذرا اس پوری آیت کو ملاحظہ کرتے ہیں۔

☆اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ قف يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا لا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ط اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۵ (7/54)

”بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ شب سے دن کو ایسے طور پر چھپا دیتا ہے کہ وہ شب اس دن کو جلدی آلیتی ہے۔ اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا۔ بڑی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔“

اس آیت میں ”خلق“ اور ”امر“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پہلے ”خلق“ سے مراد یہ کہ اللہ تعالی نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور پھر ”امر“ یہ کہ سورج، چاند، ستارے اسی کے حکم کے تابع ہیں اور پھر کہا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ یاد رکھو اللہ کے لیے ہی خاص ہے خالق اور حاکم ہونا۔ یعنی ان دونوں صفات میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں زمین و آسمان کو نہ تو کسی اور خالق نے پیدا کیا ہے اور نہ ہی سورج، چاند، ستارے کسی اور خالق کے حکم کے تابع ہیں۔ یہ صفات صرف اللہ تعالی ہی کے لیے خاص ہیں۔

اس آیت میں یہ کہیں واضح نہیں کہ کوئی ایسی دو دنیائیں ہیں۔ ”عالم امر“ اور ”عالم خلق“ اور دوسری بات یہ کہ بقول پرویز صاحب ایسی کائنات جس میں کوئی قانون، علت و معلول موجود نہیں بلکہ خدا کا ارادہ کار فرما ہوتا ہے وہ ”عالم امر“ ہے۔ جس کے ثبوت کے طور پر پرویز صاحب نے کچھ آیات کے ٹکڑے پیش کیے ہیں۔ (21/22,23/18, 5/1, 11/107, 22/14) آیئے ہم ان آیات کو پورا درج کرتے ہیں۔

☆اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۵ (22/14)

”بے شک اللہ تعالی ان لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے۔ بے شک اللہ جو ارادہ کرے اسے کر کے رہتا ہے۔“

☆ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَھُمْ فِیْھَا زَفِیْرٌ وَّ شَھِیْقٌ ٥ لا خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ طاِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ٥ (11/106-107)

”پس جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہونگے وہاں ان کی باریک اور موٹی گدھے جیسی آواز ہو گی وہ وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک آسمان و زمین بر قرار رہیں۔ سوائے اس وقت کے جو اللہ کا چاہا ہوا ہے۔ یقینا تیرا رب جو کچھ چاہے کر گزرتا ہے۔“

☆ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ٥ ط اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ طاِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ٥ (5/1)

”اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو، تمھارے لیے مویشی، چوپائے حلال کئے گئے ہیں بجز ان کے جن کے نام پڑھ کر سنا دیئے جائیں گے مگر حالت احرام میں شکار کو حلال جاننے والے نہ بننا۔ یقینا اللہ جو چاہے حکم کرتا ہے۔“

☆ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ الْعَذَابُ ط وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ ط اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ٥ (22/18)

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ کے سامنے سجدے میں ہیں سب آسمانوں والے اور سب زمینوں والے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی۔ ہاں بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب لازم ہو چکا ہے۔ اور جسے اللہ ذلیل کر دے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

☆ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِھَۃً مِّنَ الْاَرْضِ ھُمْ یُنْشِرُوْنَ ٥ لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ج فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ٥ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ ٥ (21/21-23)

”ان لوگوں نے جنھیں معبود بنا رکھا ہے کیا وہ مردوں کو زمین سے زندہ کر دیتے ہیں۔ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے علاوہ اور بھی معبود ہوتے تو فساد برپا ہو جاتا۔ پس اللہ ہر اس وصف سے پاک ہے جو یہ مشرک بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے جوابدہ نہیں۔ اور سب اس کے آگے جوابدہ ہیں۔“

ان آیات پر غور کرنے سے ایک چیز واضح ہو جاتی ہے کہ ان تمام آیات کا تعلق تو انسانی دنیا سے ہے اور انسانوں کے بارے میں ہی قواعد بیان کئے جا رہے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ بغیر علت و معلول کے خدا کا ارادہ عالم امر میں قائم ہوتا ہے جس کا اس دنیا سے تعلق نہیں غلط ہے۔ اس لئے پرویز صاحب کو چاہئے تھا کہ پوری آیات درج کرتے تاکہ بات واضح ہو جاتی۔ نہ کہ صرف آیات کے ٹکڑے لے کر اپنا مفہوم بیان کرتے۔ اس لیے عالم امر کے وجود کے اثبات میں یہ آیات بطور دلیل پیش نہیں کی جاسکتیں۔

اس کے بعد پرویز صاحب کا یہ کہنا کہ ”عالم خلق میں خدا کا امر قاعدے اور قانون کی چار دیواری میں محدود ہو جاتا ہے۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (38/33) خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔“

”عالم خلق“ کے متعلق جو دو آیات کے آخری ٹکڑے پرویز صاحب نے پیش کئے ہیں۔ ان کو بھی ہم پورا درج کرتے ہیں۔

☆مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ط سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ط وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۵۱ (38/33)

”جو چیزیں اللہ نے اپنے نبی کے لیے حلال کی ہیں ان میں نبی پر کوئی حرج نہیں۔ یہی اللہ کا دستور ان میں بھی رہا جو پہلے ہوئے۔ اللہ تعالی کے کام اندازے پر مقرر کئے ہوتے ہیں۔“

☆يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ج وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ج لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ط وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ط وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ط لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ

ذٰلِکَ اَمۡرًا ۵ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمۡسِکُوۡھُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡھُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّ اَشۡھِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ وَ اَقِیۡمُوا الشَّھَادَۃَ لِلّٰہِ ط ذٰلِکُمۡ یُوۡعَظُ بِہٖ مَنۡ کَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۵ ط وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا ۵ لا وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ط وَ مَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسۡبُہٗ ط اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمۡرِہٖ ط قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ۵ (65/1-3)

”اے نبیؐ! (اپنی امت سے کہہ دو) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو ان کی عدت میں انھیں طلاق دو۔ اور عدت کا حساب رکھو اور اللہ سے جو تمھارا پروردگار ہے ڈرتے رہو۔ نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود نکلیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ کھلی ہوئی برائی کر بیٹھیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جو شخص اللہ کی حدوں سے آگے بڑھ جائے اس نے یقینا اپنا ہی برا کیا۔ تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ تعالی کوئی نئی بات پیدا کر دے۔ پس جب یہ عورتیں اپنی عدت پوری کرنے کے قریب پہنچ جائیں تو انہیں یا تو قاعدہ کے مطابق اپنے نکاح میں رہنے دو یا دستور کے مطابق انھیں الگ کر دو۔ اور آپس میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ کر لو۔ اور اللہ کی رضامندی کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔ یہی ہے وہ جس کی نصیحت اسے کی جاتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے۔ اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو۔ اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا۔ اللہ اسے کافی ہو گا اللہ تعالی اپنا کام پورا کر کے ہی رہے گا۔ اللہ تعالی نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔“

یہ تھی پوری آیت اور اس آیت کا آخری ٹکڑا جس سے پرویز صاحب نے ”عالم خلق“ میں قانون کی عملداری کی بات کی۔ متذکرہ بالا آیات میں صاف نظر آرہا ہے کہ عائلی قوانین کی بات کی جارہی ہے اور اس کو بیان کرنے کے بعد اللہ فرماتے ہیں کہ اس نے سارے کاموں کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ تو اس آخری ٹکڑے کو بنیاد بنا کر یہ کہنا کہ یہ ”عالم خلق“ ہے اور یہاں سارے کام فطری قوانین کے مطابق وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اور ان قوانین میں اللہ تعالی کی ذات بھی پابند ہو گئی ہے اور وہ بھی اس میں دخل نہیں دے سکتی۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ ”عالم امر“ اور ”عالم خلق“ کی تقسیم غیر قرآنی ہے۔ اور دنیا میں اور

انسانی معاملات میں اللہ تعالی کو قانون کا پابند بنانا بھی غیر قرآنی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ نارمل حالات میں دنیا کا نظم و نسق فطری قوانین کے مطابق چل رہا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں بیان کردہ معجزات اور فطری قوانین میں مطابقت نہیں ہے۔ عام دستور کے مطابق تو بنی اسرائیل کے تمام بچوں کو فرعون قتل کر دیتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کھول کر دیکھئے کہ موسیٰؑ کے لیے کیوں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ فرعون ان کو قتل نہ کر سکا۔ یا عام حالات میں آگ تو ہر حال میں جلاتی ہے۔ مگر ابراہیمؑ کو بالکل نقصان نہیں پہنچاتی۔ قرآن کریم ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ بوڑھے ہوگئے ہیں اور ان کی بیوی بھی بانجھ ہو چکی ہے مگر دعا کرنے سے ان کو اولاد عطا کر دی جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ خدائے بزرگ و برتر اس دنیا میں فطری قوانین کا پابند ہے۔ وہ قادر مطلق ہے بااختیار و باارادہ ہے۔ اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ اور اس سے پوچھا نہیں جاسکتا۔ وہ جوابدہ نہیں ہے۔ اس لیے بندگی اور خدائی کا فرق ملحوظ خاطر رہنا چاہئے۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے قانون کے لیے کَلِمَۃُاللّٰہ اور سُنَّۃُاللّٰہ کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ آیئے ان کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

کَلِمَۃُاللّٰہ اور سُنَّۃُاللّٰہ۔ قانون خداوندی کے لئے قرآن میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ایک کَلِمَۃُاللّٰہ اور دوسرے سُنَّۃُاللّٰہ۔ قرآن پر تدبر سے ان دونوں میں یہ فرق سامنے آجاتا ہے کہ کلمہ قانون کی نظری حیثیت ہے۔ جسے فارمولا کہا جا سکتا ہے۔ اور سنت اللہ اس فارمولا کی عملی شکل۔ یعنی جب وہ نظری قانون، عملی پیکر اختیار کرے تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ یعنی وہ روش جس پر خدا چل رہا ہے۔ یا جس پر وہ کائنات کو چلا رہا ہے۔ یہ دونوں غیر متبدل ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰہ (6/34) کلمات اللہ (قوانین خداوندی) کو کوئی بدل نہیں سکتا (18/27), (16/115) دوسری جگہ ہے لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰہ (10/64) کلمات اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ سنت اللہ کے سلسلہ میں سورۂ احزاب میں ہے ۔سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۝ (33/62) خدا کی یہی سنت (روش) اقوام سابقہ کے سلسلہ میں بھی رہی ہے (اور یہی قوم مخاطب کی

صورت میں بھی رہے گی) تو سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔(23/48), (85/40) دوسرے مقامات پر تبدیل کی جگہ تحویل کا لفظ آیا ہے۔ یعنی روش خداوندی اپنا رخ تک نہیں بدلتی۔(43/35), (77/17)

(کتاب التقدیر۔44)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے سمٹا کر بیان کیا جائے تو حسب ذیل نتائج سامنے آئیں گے۔

1۔اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔ خدا نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور انہی قوانین کی رو سے وہ ان پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے۔

2۔اشیائے کائنات ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہیں۔

3۔یہ قوانین " قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ " ہیں۔ یعنی ان کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انسان میں اس کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔(جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے) قصہ آدم میں جو کہا گیا ہے کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا(31/2) "ہم نے آدم کو تمام "اسما" کا علم دے دیا۔ تو اس سے مراد علم اشیائے کائنات۔ یعنی قوانین فطرت اور اشیائے کائنات کی خصوصیات و تاثیرات کا علم ہے۔ جب انسان، ان قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے تو فطرت کی قوتیں اس کے کنٹرول میں آجاتی ہیں۔ قصہ آدم میں اسے "ملائکہ کے سجدہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (34/2)

قرآن کریم نے ان تمام تصریحات کو چند جامع الفاظ میں سمٹا دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ (13/45) خدا نے تمام اشیائے کائنات کو قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ تم ان سے فائدے حاصل کر سکو۔ انہیں اپنے کام میں لا سکو۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ٥(13/45)

جو قوم بھی اس حقیقت پر غور و فکر کرے گی وہ اس میں، (کائنات میں انسان کا مقام متعین کرنے کے لئے) بڑی واضح نشانیاں پائے گی۔

ہم نے دیکھ لیا کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی اس نئی منزل میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا ہے اور وہ یہ کہ خدا کا امر (جو کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند نہیں تھا) "امر مقدور" ہو گیا۔ یعنی وہ مطلق اختیار کے بجائے قانون ہو گیا۔ اور قانون بھی ایسا جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دیگر، اس مرحلہ میں خدا نے اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کر لیں۔ خدا کے لئے "پابندی" کے تصور سے احساس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن جب اس نے خود ہی ایسا کیا اور کہا ہے تو ہمارے لئے ایسا تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے۔ اور "باک" کے کیا معنی؟ جب یہ ایک حقیقت ہے جس کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ (کہ قوانین خداوندی غیر متبدل ہیں) تو اسے تسلیم کرنا ہی صداقت شعاری ہے۔ سورئہ انعام میں ہے۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (6/54) اس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ قرآن کریم میں کَتَبَ کا لفظ ان مقامات پر آیا ہے جہاں کسی بات کو کسی پر فرض (یعنی لازم) قرار دیا گیا ہو۔ جیسے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (2/183) تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ یعنی یہ فریضہ خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد کیا گیا ہے۔ لہٰذا کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اپنے آپ پر خود یہ پابندی عائد کی ہوئی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ٥ (10/103) مومنین کو مصائب و آلام سے محفوظ رکھنا، خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔ یہاں حَقًّا عَلَیْنَا کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ٥ (30/47) مومنین کی مدد کرنا ہمارے اوپر واجب ہے۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ٥ (58/21) خدا نے یہ لکھ رکھا ہے۔ (فیصلہ کر رکھا ہے) کہ ہم اور ہمارے رسول ضرور غالب رہیں گے۔ (الحج 22/16)

خدا کی یہ رحمت، مومنین کی نجات، فتح و نصرت، غلبہ و تمکن، (جنھیں خدا نے اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے۔) کن شرائط سے مشروط ہے۔ اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ خدا نے خود اپنے اوپر بھی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ ان پابندیوں کو، خدا کا وعدہ، بھی کہا گیا ہے۔ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا (38/16) یہ خدا کا وعدہ ہے۔ جس کا ایفا کرنا اس نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔ (نیز 40/77,40/55,35/5,31/9) ان "وعدوں" کے متعلق اس نے بالتصریح کہہ دیا کہ ان کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوگی۔ وَعۡدَ اللّٰہِ ط لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ (30/6) یہ خدا کا وعدہ ہے اور یاد رکھو کہ خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ (نیز 3/193)

خدا کے وعدے۔ خدا کے یہ "وعدے" درحقیقت اس کے مقرر کردہ قوانین ہیں اور انکی خلاف ورزی نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہ ہے مراد اس "پابندی" سے جو خدا نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ (کتاب التقدیر 46-48)

تصریحات بالا سے "تقدیر کا مفہوم واضح ہو گیا ہو گا۔ لفظ "تقدیر" کے صحیح مفہوم کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے۔ اسے ایک بار پھر سامنے لایئے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ وَجَعَلَ الَّیۡلَ سَکَنًا وَّ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ط ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۵ (6/96) خدا نے رات کو آرام کے لیے اور سورج اور چاند کو (وقت کے) حساب و شمار کا ذریعہ بنایا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی "تقدیر" ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے۔ کہ "یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے"۔ اسی طرح سورۂ یسین میں ہے۔ وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّھَا ط ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۵ (36/38) اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جارہا ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی تقدیر ہے۔ تیسری جگہ ہے۔ وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ق صلے وَحِفۡظًا ط ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۵ (41/12) اور ہم نے تمہاری قریبی فضا میں جگمگاتے چراغ (ستارے) روشن کر دیئے اور انہیں تمہاری حفاظت کا ذریعہ بھی بنایا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی تقدیر ہے۔ اجمالاً سورۂ فرقان میں ہے۔ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ۵ (25/2) اس نے ہر شے کو

پیدا کیا اور پھر ان کے لئے "تقدیر" مقرر کر دی۔ یہاں بھی "تقدیر" سے مراد خدا کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ سورۂ الدھر میں جنت کے آبخوروں کے متعلق ہے۔ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيْرًا ۱۵(16/76) یہ آبخورے چمکدار چاندی کے ہوں گے۔ اور انھیں خاص پیمانوں کے مطابق بنایا گیا ہو گا۔

قرآن کریم میں انہی مقامات پر تقدیر کا لفظ آیا ہے۔ اور اس کے معنی بالکل واضح ہیں۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ پیمانے، یا قوانین خداوندی، جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات سرگرم عمل ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جن معنوں میں یہ لفظ (تقدیر) ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے وہ اس قرآنی مفہوم کے بالکل خلاف ہے۔ "انسان کی تقدیر"، "اس کی تقدیر"، "میری تقدیر" یہ سب غلط ہے۔ تقدیر تو صرف خدا کی ہے۔ یعنی قانون خداوندی۔ لہذا انسانوں کی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ تقدیر، خدا کا وہ قانون ہے جو انسان کی حالت کے مطابق اس پر وارد ہو جاتا ہے۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کرلے۔ اسی قسم کی خدا کی تقدیر (خدا کا قانون) اس پر منطبق ہو جاتی ہے۔ جو شخص آگ میں انگلی ڈالتا ہے۔ خدا کی تقدیر اس پر وارد ہو جاتی ہے۔ کہ وہ جلن اور سوزش کی تکلیف میں مبتلا ہو اور جب وہ اس پر مرہم لگالیتا ہے۔ تو خدا کی یہ تقدیر اس پر منطبق ہو جاتی ہے کہ اسے راحت اور سکون حاصل ہو جائے۔ (کتاب التقدیر 58-59)

متذکرہ بالا تصریحات میں پرویز صاحب نے یہ تین الفاظ بطور "قانون" کے استعمال کئے ہیں۔ لیکن ان میں بڑا واضح فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ یعنی ایک بات ہے جسے اللہ کی روش کہتے ہیں۔ اور دوسری بات ہے جسے قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کے باہمی معاملات کے تصفیہ کے لیے جو قوانین اللہ تعالی نے عطا کئے ہیں۔ وہ قوانین فطرت سے قطعی مختلف ہیں۔ اور ان کو آپس میں ملایا نہیں جا سکتا۔ مثلاً قانون فطرت ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ جل جاتا ہے۔ یا کسی چیز کو ہوا میں اچھالیں تو وہ واپس زمین کی طرف گرتی ہے۔ یہ قوانین فطرت فوری طور پر اپنا نتیجہ ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور اس میں نتیجہ قانون کے مطابق 100 فیصد درست رہتا ہے۔ مگر انسانی

زندگی کے معاملات میں نتائج مختلف ہو سکتے ہیں۔ جیسے قتل کی سزا قتل ہے مگر ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ قاتل بچ جاتے ہیں یا یہ کہ چوری کی سزا چور کا ہاتھ کاٹنا ہے۔ لیکن اس کو بعض اوقات چوری کی سزا نہیں ملتی۔ پھر یہ کہ کسی موقع پر کوئی فرد اپنے گناہوں سے توبہ کر لے اور اللہ تعالی اس کی توبہ کو قبول کر لے اور اس کی غلطیوں کو معاف کر دے اور اس کے گناہوں کی سزا کو ٹال دے۔

اس چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے اب آتے ہیں اس بات کی طرف کہ "خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عائد کر لیں"۔ یا یہ کہ "خدا قانون کا پابند ہو گیا۔" اس کے لیے پرویز صاحب نے ان آیات کو بطور حوالہ درج کیا ہے۔
کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (6/12) یا حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ (10/103) یا وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا (16/38) اور وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (30/6) "یہ خدا کا وعدہ ہے اور یاد رکھو خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔"

ان چیزوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ خدا تعالی قانون کا پابند ہو گیا ہے درست نہیں ہے۔ آیئے ان ٹکڑوں کی پوری آیات کو دیکھتے ہیں۔

☆ وَاِذَا جَآءَکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ لا اَنَّہٗ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًا بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِہٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ٥ (6/54)

"اور یہ لوگ جب آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو یوں کہہ دیجئے گا تم پر سلامتی ہے۔ تمہارے رب نے مہربانی فرمانا اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے۔ کہ جو شخص تم میں سے برا کام کر بیٹھے جہالت سے۔ پھر وہ اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح رکھے تو یہ اللہ کی شان ہے کہ وہ بڑی مغفرت کرنے والا ہے۔"

☆ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلْ لِّلّٰہِ ط کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ ط لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ط اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَہُمْ فَہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ٥ (6/12)

"آپ کہئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے یہ سب کس کی ملکیت ہے آپ کہہ دیجئے کہ یہ سب اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ اللہ نے مہربانی فرمانا اپنے اوپر لازم فرمالیا ہے۔ تم کو اللہ قیامت کے روز جمع کرے گا اس میں کوئی شک نہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو ضائع کر لیا ہے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"

ان آیات میں واضح ہے کہ اللہ نے رحمت کرنا اپنے اوپر واجب قرار دے لیا ہے۔ لیکن ان آیات اور انہی جیسی دیگر آیات کا یہ مفہوم قطعاً غلط ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے آپ کو فطری قوانین کے تابع کر لیا ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِاور وَعۡدَ اللّٰه اور دیگر آیات بیان تو کر دیں، مگر آخر میں مفہوم کیا نکالا؟ کہ "خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عائد کرلیں۔" یا یہ کہ "خدا کے وعدے" اس کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔"

ان آیات کا مفہوم اپنی جگہ واضح ہے۔ لیکن خدا کو قانون کا پابند بنا کر انسانی دنیا میں اس کی مرضی کو ختم کر دینا سراسر غیر قرآنی ہے۔ جب اللہ تعالی نے فرمادیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ (22/18) اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اور لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـَٔلُوۡنَ (21/21-23) وہ جو کرتا ہے اس بارے اس سے پوچھا نہیں جاسکتا بلکہ سارے اسی کے آگے جوابدہ ہیں۔

اس کے باوجود یہ کہنا کہ خدا قانون کا پابند ہو گیا ہے۔ ایک غیر قرآنی تصور ہو گا۔ اور ایک چیز کو پرویز صاحب نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ جسے کہتے ہیں خدا کی مرضی! اس بات میں تو کوئی دوسری رائے نہیں کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالی ہی جانتا ہے۔ اور فوری طور پر جو چیز خلاف قانون نظر آرہی ہوتی ہے لیکن اس کے وجود پذیر ہونے میں خدا کی حکمت، منشا اور مرضی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (30/47) مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔ مگر بہت سے واقعات میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے انبیاءؑ کو قتل بھی کیا۔ اور خلفائے راشدین میں سے تین خلفاء کو شہید کر دیا گیا۔

یا جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ۵(2/155) اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے۔ خوف سے، بھوک سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے، اور صبر کرنے والوں کو بشارت دیجئے۔

اب اس چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی فرد فطری قوانین کے مطابق اپنی پوری سعی و کاوش سے عمل کرتا ہے۔ لیکن نتائج اس کے برعکس ہوتے ہیں۔

پھر سب سے بڑی بات یہ کہ رزق کی تقسیم اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ تو کس طرح سے ہم انسانی زندگی میں خدا کی مرضی کا انکار کرسکتے ہیں۔ اور اس کو قانون کا پابند بناسکتے ہیں۔

پرویز صاحب نے صرف اپنے تصورات کو بنیاد بناکر "قانون" کے لفظ کا استعمال کیا۔ اور جہاں کہیں بھی قرآنی ترجمہ یا مفہوم اپنے خیالات کے خلاف گیا تو وہاں "قانون" کا لفظ استعمال کرکے اس کو اپنے خیالات کے تابع کیا۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے مشیت خداوندی کو بھی قانون کے دائرے کے اندر محدود کر دیا۔ اور قرآنی اصطلاحات کو من پسند معانی پہنا دیئے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

"لَوْ شَآءَ اللّٰہ۔ قرآن کریم میں یہ ترکیب متعدد مقامات میں آئی ہے۔ اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو۔۔۔، اس کا صحیح ترجمہ یوں کرنا چاہئے کہ " اگر اللہ اس قسم کا قانون مشیت مقرر کر دیتا تو ایسا ہو جاتا۔۔۔" مثلاً اگر کہا جائے کہ نمک، نمکین کیوں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ نمک نمکین ہو۔ اگر اس کا قانون مشیت یہ ہوتا کہ نمک میٹھا ہو، تو نمک میٹھا ہو جاتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ۔۔۔ اگر خدا چاہے تو اب بھی نمک میٹھا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر وہ چاہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسا چاہے گا نہیں۔ کیونکہ اس نے قوانین مشیت مقرر کر دینے کے بعد خود ہی کہہ دیا ہے کہ وہ ان قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا۔ اس ترکیب (لَوْ شَآءَ) میں لَوْ کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ بات کبھی نہیں ہو گی۔" (کتاب التقدیر 197)

"سورۂ یونس میں ہے۔ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعاً۔ اگر مشیت خداوندی میں ایسا ہوتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسا کر دیتا کہ وہ سب ایمان لے آتے۔ (10/99) وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ ھُدٰھَا۔۔([اگر ہماری مشیت کا تقاضا ہوتا کہ تمام انسان مجبوراً ایک ہی راہ پر چلیں تو ہم ان کے اندر ایسی جبلت رکھ دیتے۔] لیکن ہمارا قانون مشیت یہ نہیں۔ انسانوں کے لیے قانون یہ ہے کہ ہم نے رسول کی وساطت سے انہیں بتا دیا ہے کہ ان کے لئے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اور اس کے بعد کہہ دیا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (18/29) جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔" (کتاب التقدیر 199-200)

" اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَھَدَی النَّاسَ جَمِیْعاً ؕ (13/31) اگر خدا کی مشیت کا تقاضا ہوتا تو اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ وہ سب راہ راست پر چلتے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلَ۔۔۔(2/253) اگر مقصود مشیت یہ ہوتا کہ انسانوں میں اختلاف اور قتال کو جبراً روک دیا جائے تو خدا انہیں پیدا ہی مجبور کر دیتا۔" (کتاب التقدیر 202)

"قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت، مشرکین اور کفار، لَوْ شَآءَ اللّٰہُ سے یہی مراد لیتے تھے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا۔۔۔(6/148) اگر اللہ کو ایسا منظور نہ ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے۔ (43/20), (16/35) سورۂ یسین میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھوکوں اور ناداروں کی مدد کرو تو کفار یہ کہتے ہیں کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗ (36/47) کیا ہم ان لوگوں کی روٹی کا انتظام کریں، جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اسے انہیں بھوکا

رکھنا منظور نہ ہوتا تو وہ انہیں امیر کیوں نہ بنا دیتا۔ اس نے جو انہیں غریب رکھا ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ انہیں روٹی دینا ہی نہیں چاہتا۔ اگر ہم انہیں روٹی دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم خدا کی مشیت سے جنگ کریں۔

قرآن نے یہ ذہنیت مشرکین اور کفار کی بتائی ہے اور اسے سخت جہالت اور گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔ لَوْ شَآئَ اللّٰہ کا قرآنی مفہوم وہی ہے جسے پہلے بیان کیا گیا ہے۔"

(کتاب التقدیر 203)

یہاں پرویز صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان آیات کا مفہوم کیا بنے گا۔

مَاشَآئَ اللہ۔ ہمارے ہاں مَاشَآئَ اللہ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔۔ جو اللہ چاہے گا۔ اور اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ہم جو جی میں آئے کر لیں، ہو گا وہی جو خدا چاہے گا۔ یعنی جو خدا کو منظور ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم، تقدیر کے اس تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کی رو سے انسان کو مجبور قرار دیا جاتا ہے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) تقدیر کا یہ تصور خلاف قرآن ہے۔ اس لئے مَاشَآئَ اللہ کا مذکورہ صدر مفہوم بھی صحیح نہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ جو شخص ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ اس کا خمیازہ بھگتتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآئَ (2/255) انسان علم خداوندی میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ بجز اس طریق کے، اور اس حد تک جو اس کے قانون مشیت نے مقرر کر رکھا ہے۔ یعنی عقل و بصیرت کی رو سے یا وحی کے ذریعے۔ یہی دونوں طریق ہیں جو قانون مشیت نے حصول علم کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان کے ذریعے بھی انسان کو، علم خداوندی کے مقابلہ میں، محدود علم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

سورۂ کہف میں، دو باغ والوں کا قصہ تمثیلاً بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ایک صحیح نگاہ رکھتا تھا اور دوسرے کے متعلق کہا ہے وَھُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ (18/35) وہ اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کرتا تھا۔ وہ خدا کا بھی منکر تھا اور اس کے قانون مکافات کا بھی۔ قانون مکافات عمل سے انکار (یعنی اس حقیقت سے انکار کہ انسان جو کچھ بوتا ہے وہی کچھ کاٹتا ہے) کا نتیجہ یہ ہوا کہ (اس نے کھیتی کی طرف سے غفلت برتی اور) وہ تباہ ہو گئی۔ اس پر اس کے ساتھی نے (جو ان امور پر ایمان رکھتا تھا) اس سے کہا کہ تجھے چاہئے تھا کہ اپنی کھیتی اور باغات کو دیکھ کر ہمیشہ یہ کہتا کہ مَاشَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ (18/39)۔ یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی میں ایسی قوت و اقتدار نہیں کہ انہیں پیدا کر سکے اور پروان چڑھا سکے۔"

(کتاب التقدیر 204)

"سورۂ یونس میں ہے کہ اے رسولؐ! یہ مخالفین تجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ اگر ہم غلط روش پر چلتے رہے تو ہماری تباہی آ جائے گی۔ تو ہمیں بتائو کہ وہ تباہی کب آئے گی۔ اس کے جواب میں کہا کہ ان سے کہو کہ تم مجھ سے اس طرح پوچھتے ہو گویا اس انقلاب کا لانا میرے اپنے اختیار میں ہے۔ لہذا میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کب آئے گا۔ یہاں سب کچھ خدا کے قانون مشیت کی رو سے ہوتا ہے۔ وہ انقلاب تو ایک طرف لَآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ (10/49) میں تو خود اپنی ذات کے لیے بھی، خدا کے قانون مشیت کے خلاف، نفع و نقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی مرضی سے اپنے لئے سنکھیا کو ممد حیات بنالوں یا پانی میں زہر کی خاصیت پیدا کر دوں۔ یا ایسا کر سکوں کہ میرے کھیت میں گندم دو ماہ بعد فصل دے دے اور فریق مخالف کے کھیت میں سال بھر کے بعد۔ یہاں ہر بات کے لیے ایک قانون مہلت مقرر ہے۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۵ (10/49) جب مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ایک ثانیہ کی بھی دیر سویر نہیں ہوتی۔ لہذا، یہ انقلاب بھی اسی قانون مہلت کے مطابق واقع ہو گا۔

یہاں سے لَآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کا مفہوم واضح ہو گیا۔"

(کتاب التقدیر 205)

"قرآن کریم میں بعض مقامات پر اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ آتا ہے۔ مثلاً سورۂ الاعلیٰ میں ہے کہ سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۵لا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُط (87/6-7) اے رسول! ہم نے تجھے قرآن کو اس انداز سے دیا ہے کہ تو اس میں سے کچھ بھی بھول نہیں سکتا۔ اس کے بعد ہے اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تو اس میں سے صرف اتنا بھلا سکتا ہے جتنا خدا چاہے۔ اس سے زیادہ نہیں بھلا سکتا۔ خدا کی طرف سے حضورؐ کو جو وحی عطا ہوئی تھی اس کا ایک حرف بھی بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ (86/17) صاحب المنار، مفتی محمد عبدہٗ (مرحوم) نے لکھا ہے کہ

"استثنا، بالمشیت قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لیے آتا ہے۔ یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَآءَ اللّٰہُ وغیرہ الفاظ آئیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ ان مقامات میں اِلَّا کہنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ ان امور کا ثابت اور دائم رہنا خدا کی مشیت کی رو سے ہے۔ اگر اس کی مشیت اس کے خلاف ہوتی تو وہ انہیں ویسا ہی بنا دیتا۔ لہذا فَلَا تَنۡسٰۤی ۵لا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُط کے معنی یہ ہیں کہ تو اسے ہرگز ہرگز نہیں بھلا سکے گا۔

(کتاب التقدیر 206)

" اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ۔ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ میں شَآءَ کا مفہوم ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی خدا کا قانون مشیت۔ باقی رہا حرف اِنۡ تو اس کے معنی عام طور پر "اگر" کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ۔۔۔۔۔ ایک اور معنی بھی ہیں۔ جنہیں (بد قسمتی سے) ہمارے ہاں کے قرآن کریم کے تراجم میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عربی گرامر کی رو سے کہا جائیگا کہ یہ حرف، تعلیل یا سبب بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ یعنی، جس مفہوم کے لیے ہم اردو زبان میں، چونکہ، استعمال کرتے ہیں۔ عربی زبان میں ان معانی کے لئے اِنۡ بھی آتا ہے۔ سیوطی نے (اتقان) میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ اِنۡ کے ان معانی کی رو سے دیکھئے کہ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ کا کیا مفہوم مرتب ہوتا ہے۔ اسے بھی ایک مثال سے

سمجھئے۔ آپ اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ بھائی! مجھے جلدی جانا ہے۔ چائے کا تکلف چھوڑو۔ اس میں بہت وقت لگ جائے گا۔ وہ دوست دیگچی چولھے پر چڑھا دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ چائے میں کیا دیر لگے گی۔ آگ چل رہی ہے۔ پانی میں نے رکھ دیا ہے۔ اب دس منٹ میں چائے تیار ہو جائے گی۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ ۔۔۔ دس منٹ میں ؟۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ اِنْ شَآئَ اللّٰہُ۔ یعنی جو کچھ میں کر رہا ہوں چونکہ یہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہے، اس لئے اس کا نتیجہ بھی ایسا مرتب ہو کر رہے گا۔ یا بالفاظ دیگر جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ جب یہ قانون مشیت کے مطابق ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا نتیجہ ایسا نہ نکلے۔ لہذا ایسا ہو کر رہے گا۔ (کتب لغت میں ہے اِنْ بمعنی اِذْ بھی آتا ہے جس کا ترجمہ ''جب'' ہے)۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ وہی '' اِنْ شَآئَ اللّٰہ ''جو فقدان یقین اور عدم خود اعتمادی کے لئے بولا جاتا تھا۔ اب، حتم ویقین اور کامل خود اعتمادی کا آئینہ دار ہو گیا۔ یہ ہے اِنْ شَآئَ اللّٰہ کا قرآنی مفہوم۔ سیوطی نے اِنْ بمعنی ''چونکہ'' یا ''جب'' کے سلسلہ میں جو مثالیں دی ہیں وہ بڑی واضح ہیں۔ مثلاً سورئہ اٰل عمران کی مشہور آیت وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۵ (3/139) اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ تم مومن ہو۔ اس لئے تم دنیا میں سب سے بلند مقام پر ہو گے۔ یا جب تم مومن ہو۔ تو ہو نہیں سکتا کہ تم بلند ترین مقام پر فائز نہ ہو۔

سورئہ فتح میں ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآئَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ ۔۔۔(48/27) چونکہ تمہارا تمام پروگرام خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہے اس لئے تم ضرور امن وعافیت سے کعبہ (یا مکہ) میں داخل ہو گے۔ یا بالفاظ دیگر، جب تمہارا پروگرام خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم مسجد حرام میں داخل نہ ہو۔ تم داخل ہو گے اور بالضرور داخل ہو گے۔

جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور دیگر اہل خاندان مصر میں آئے تو آپ نے ان سے کہا۔ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآئَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ (12/99) چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس لئے تم مصر میں امن و آرام رہو گے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے خسر نے (جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ تھے) حضرت موسیٰؑ سے کارندگی کا معاملہ طے کیا تو ان سے کہا کہ سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (27/28) چونکہ میں خدا کے قوانین کا پابند ہوں۔ اس لئے تم مجھے اچھے لوگوں میں پاؤ گے۔ (نیز 37/102, 18/69) جنگ احزاب میں منافقین نے بڑی غداری کی تھی۔ بعد میں یہ سوال سامنے آیا کہ ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے۔ مجرمین کے سلسلہ میں، خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر کسی میں اصلاح کا امکان نظر آئے اور وہ اپنے کئے پر نادم ہو۔ تو اسے معاف کر دیا جائے۔ اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو، جرم کی سزا دی جائے۔ اس قانون کے پیش نظر، ان (منافقین) کے متعلق بھی کہا گیا کہ وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ (33/24) انہیں سزا دی جائے یا معاف کر دیا جائے۔ اس کا فیصلہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو گا۔ (جسکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے)۔

سورۂ لقمان میں ہے کہ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا (31/34) کوئی شخص یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ یہ اس لئے کہ واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے سلسلہ میں بعض ایسی کڑیاں بھی رونما اور موثر ہو جاتی ہیں۔ جن کا انسان کو قبل از وقت علم نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ کڑیاں ہیں جنہیں غیب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور جن کے متعلق کہا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں کہا گیا کہ مستقبل کے جو امور ایسے ہوں جن کے اسباب (Causes) کی تمام کڑیوں کا تمہیں قبل از وقت علم نہ ہو، ان کے متعلق تم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً یہ تو تم کہہ سکتے ہو کہ آج سے سو سال بعد سورج گہن کس وقت لگے گا۔ لیکن یہ تم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مکھی، اس جگہ سے اڑ کر کس جگہ بیٹھے گی۔ ایسے معاملات کے سلسلہ میں کہا کہ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ تم یہ مت کہو کہ میں کل یقینی طور پر ایسا کروں گا۔ جو کچھ تم نے کرنا ہے اس کے لئے قانون خداوندی کے مطابق ضروری اسباب مہیا کرتے جاؤ اور یہ کہو کہ اگر اس کے قانون کے مطابق جملہ اسباب مہیا ہو گئے تو پھر یقیناً ایسا ہو گا۔

مَنۡ یَّشَآءُ۔ عقیدۂ جبر کی سند اور تائید میں جو آیات شد و مد سے پیش کی جاتی ہیں۔ وہ، وہ ہیں جن میں مَنۡ یَّشَآءُ کے الفاظ آتے ہیں۔ اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ " جسے چاہے، مثلاً یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ (16/93) وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔" یا فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ (2/284) وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے، جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ یا یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ (17/30) وہ جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وغیرہ۔

اگر اس قسم کی آیات کے یہی معنی لئے جائیں جو ان کے عام ترجموں کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔ تو یہ انہی مضامین سے متعلق قرآن کی بے شمار دیگر آیات کے خلاف جاتے ہیں۔ مثلاً ہدایت و ضلالت کے متعلق ہے۔ وَ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ (18/29) ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ عذاب و مغفرت کے متعلق بے شمار مقامات میں کہا گیا ہے کہ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۵ یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ رزق کی بسط و کشاد وغیرہ کے سلسلہ میں اصول یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53/39) انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ اگر مَنۡ یَّشَآءُ سے متعلق آیات کے معنی یہ لئے جائیں کہ "وہ جسے چاہتا ہے" دے دیتا ہے۔ اس کے لیے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں، تو قرآن کریم کی مختلف آیات ایک دوسرے کے متضاد ہو جائیں گی۔ اور (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) قرآن کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے۔ کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لہٰذا مذکورہ صدر آیات، باہمد گر متضاد نہیں ہو سکتیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

عربی زبان کے قاعدے کی رو سے، مَنۡ یَّشَآءُ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ " جسے اللہ چاہے "۔ اور دوسرے یہ کہ "جو شخص ایسا چاہے۔" مثلاً یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ

جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ کہ جو شخص ہدایت لینا چاہے، اسے ہدایت مل جاتی ہے اور جو گمراہ رہنا چاہے وہ گمراہ رہتا ہے۔ اسی طرح رزق سے متعلق آیت کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ اسے رزق کشادہ ملے اسے کشادہ مل سکتا ہے۔ جو اپنے لئے رزق کی تنگی چاہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں معانی میں ترجیح کن معانی کو دی جائے گی۔ سو اس کا جواب آسان ہے ۔(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) ان آیات کا وہ مفہوم صحیح ہو گا جو قرآن کریم کی دیگر آیات اور اس کی کلی تعلیم کے مطابق ہو۔ قرآن کریم کی کلی تعلیم کا محور، قانون مکافات عمل ہے۔ یعنی انسان کو اس کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ لہذا ان آیات کا وہی مفہوم قرآنی تعلیم کے مطابق ہو گا۔ جس میں مَنۡ یَّشَآءُ کا فاعل انسان کو تصور کیا جائے۔"

(کتاب التقدیر 216-218)

یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ۔ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔۔۔ وہ جو ارادہ کرتا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ آپ دوسرے باب پر نگہ بازگشت ڈالئے۔ اس میں بتایا گیا (اور اسے بعد میں دہرایا گیا ہے) کہ خدا کے تخلیقی مراحل کے دو پروگرام ہیں۔ مرحلہ اول، عالم امر کا ہے جس میں "خدا" اشیا کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اور ان کے حفظ و بقا، نشو و ارتقا اور محو و ثبات کے لئے قوانین مقرر کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس کی قدرت مطلقہ اس طرح کارفرما ہوتی ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے لیے نہ پہلے سے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر ہوتا ہے۔ نہ کوئی حدود و قیود عائد۔ یہاں یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ (42/49) کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہی ہے کہ وہ جو جی میں آئے پیدا کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ ۵ (22/14)۔ جو کچھ اس کے ارادے میں ہوتا ہے۔ وہ ویسے ہی کرتا ہے۔ لَا یُسۡـَٔلُ عَمَّا یَفۡعَلُ وَ ھُمۡ یُسۡـَٔلُوۡنَ ۵ (21/23)، اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے فلاں چیز کو ایسا کیوں بنایا ہے۔

یا جو قوانین وہ وضع کرتا اور جو احکام نافذ کرتا ہے۔ وہ ویسے کیوں ہیں۔(2/253, 5/1) " (کتاب التقدیر 219-220)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

" اس کے تخلیقی پروگرام کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں ہر کام اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ جن میں وہ کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ اس مرحلہ میں یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ کے معنی ہونگے ۔۔۔۔ وہ ہر بات اپنے قانون مشیت کے مطابق کرتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ مثلاً

ا۔ سورۂ رعد میں ہے۔ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ۵ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (13/38-39) ہر عمل کے نتیجہ کے لیے ایک میعاد ہوتی ہے اور یہ میعاد خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ اس کے مطابق اقوام یا اشیاء کا محو و ثبات (باقی رہنا یا مٹ جانا) ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں پہلے یہ کہا ہے کہ ہر بات کے لیے ایک قانون (کتاب) مقرر ہے اور اس کے بعد مَا یَشَآءُ کہا۔ ظاہر ہے کہ یہاں مَا یَشَآءُ، کے معنی "خدا کے قانون مشیت کے مطابق" ہو سکتے ہیں۔

۲۔ محو و ثبات کے اس اصول کے متعلق سورۂ ابراہیمؑ میں ہے کہ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ قف لا خدا نے ایک محکم قانون حیات نظریہ زندگی مقرر کر رکھا ہے۔ اسی کے مطابق دنیا اور آخرت میں، جماعت مومنین کو قیام و ثبات نصیب ہوتا ہے۔ اور اسی کے مطابق ظالمین تباہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کہا وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (14/27)، ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایسا محکم قانون اور اصول بنانے کے بعد بھی " وہ جس طرح جی میں آئے " کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ جسے چاہتا ہے یونہی تباہ کر دیتا ہے۔ (کتاب التقدیر 221)

قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی لَوْ شَآئَ اللّٰہ، مَا شَآئَ اللّٰہ، اِنْ شَآئَ اللّٰہ اور مَن یَّشَآء جیسے الفاظ آئے ہیں۔ پرویز صاحب نے ان کا مفہوم کیا ہے "قانون مشیت"، اور دوسری بات جو پرویز صاحب نے کہی کہ ان مقامات پر مَنْ یَّشَآء کا فاعل انسان کو مانا جائے تو مفہوم درست ہو گا۔

جہاں تک "فاعل" والی بات کا تعلق ہے تو اس کا تعین صرف سیاق وسباق ہی کر سکتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جہاں اس کا فاعل انسان ہے۔ لیکن جہاں یَشَآء کے ساتھ "اللہ" لکھا ہوا ہے وہاں تو انسان کو فاعل نہیں مانا جا سکتا۔

اب آتے ہیں پہلی بات کی طرف یعنی "قانون مشیت" ۔ اس چیز کو بنیاد بنا کر قرآن کریم میں جہاں بھی ایسے الفاظ آئے ہیں۔ "سو اللہ چاہے"، "اگر اللہ چاہتا"، "جسے اللہ چاہے" وغیرہ۔ وہاں پرویز صاحب نے ان کا مطلب قانون مشیت کر دیا ہے۔ اور ذات خداوندی کو انسانی دنیا اور انسانی معاملات سے لاتعلق کر دیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ "قانون مشیت" ہے کیا؟ فطری قوانین کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ تمام کائنات سائنسی قوانین کے ماتحت ہے اور مغربی اقوام ان قوانین کو تسخیر کر کے، تسخیر کائنات کی طرف گامزن ہیں اور ترقی یافتہ بھی ہیں اور خوشحال بھی ہیں۔

"قانون مشیت" کے بارے میں نہ تو ہمیں اس کائنات سے کوئی راہنمائی ملتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم نے کچھ بتایا ہے کہ یہ کیسا قانون ہے؟ اور آیا کہ یہ بھی قابل تسخیر ہے؟ اور ہونا تو یہ بھی چاہئے تھا کہ مغربی اقوام اس قانون کو بھی مسخر کر لیتیں، اور ترقی یافتہ کے ساتھ ساتھ "ہدایت یافتہ" بھی شمار ہوتیں۔ مگر وہاں ترقی تو نظر آتی ہے ہدایت کم ہی نظر آتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے سائنسی یا فطری قوانین کو کم ہی بیان کیا ہے۔ اس کا زیادہ تر

مخاطب انسان اور انسانی معاملات ہیں۔ اور جہاں کہیں انسانی معاملات کا بیان ہو گا۔ وہاں ذات خداوندی کا بیان بھی ہو گا۔ کوئی چیز اللہ نے بذاتہ اپنی طرف منسوب کی ہے تو اسے ہم "قانون مشیت" کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

اب ہم چند قرآنی آیات بیان کرتے ہیں جن سے ان الفاظ کا مفہوم مزید واضح ہو گا۔

☆ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰي غَضَبٍ ط وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۵ (2/90)

"بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ وہ انکا کفر کرنا ہے اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ چیز کے ساتھ محض اس بات سے جل کر کہ اللہ تعالی نے اپنا فضل اپنے جس بندہ پر چاہا نازل فرمایا۔ اس باعث یہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کافروں کے لیے رسوا کرنے والے عذاب ہیں۔"

☆ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰھُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ط (2/272)

"انہیں ہدایت پر لے آنا تیرے ذمہ نہیں ہے۔ بلکہ ہدایت اللہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔"

☆ ھُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۵ (3/6)

"وہی ہے جو ماں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جس طرح کی چاہتا ہے بناتا ہے۔ اسکے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔"

☆ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۵ (3/26)

”آپ کہہ دیجئے اے میرے معبود! اے تمام جہان کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ تیرے ہاتھ میں سب بھلائیاں ہیں بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

☆اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ج وَمَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدِ افۡتَرٰۤی اِثۡمًا عَظِیۡمًا ۵ (4/48)

”بے شک اللہ تعالی اپنے ساتھ شرک کئے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جو اللہ تعالی کے ساتھ شرک مقرر کرے اس نے بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔“

☆اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ اَیُّہَا النَّاسُ وَیَاۡتِ بِاٰخَرِیۡنَ ط وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیۡرًا ۵ (4/133)

”اگر وہ چاہے تو اے لوگو! وہ تم سب کو فنا کر دے اور دوسروں کو لے آئے۔ اللہ تعالی اس پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔“

☆وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُکۡمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ط مَنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضۡلِلۡہُ ط وَمَنۡ یَّشَاۡ یَجۡعَلۡہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۵ (6/39)

”اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ تو طرح طرح کی ظلمتوں میں بہرے، گونگے ہو رہے ہیں۔ اللہ جس کو چاہے گمراہ کر دے اور وہ جس کو چاہے سیدھی راہ پر لگا دے۔“

☆وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ وَکَلَّمَہُمُ الۡمَوۡتٰی وَحَشَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ کُلَّ شَیۡءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ یَجۡہَلُوۡنَ ۵ (6/111)

”اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات کو ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لا کر جمع کر دیتے تب بھی یہ لوگ ہر گز ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ہی چاہے تو اور بات ہے لیکن ان میں زیادہ تر لوگ جاہل ہیں۔“

☆یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِکُوۡنَ نَجَسٌ فَلَا یَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ بَعۡدَ عَامِھِمۡ ھٰذَا ۚ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَیۡلَۃً فَسَوۡفَ یُغۡنِیۡکُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۸﴾ (28/9)

”اے ایمان والو! مشرک بالکل ہی ناپاک ہیں۔ وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائیں اگر تمہیں مفلسی کا خوف ہے تو اللہ تمہیں دولت مند کر دے گا اپنے فضل سے اگر چاہے۔ اللہ علم و حکمت والا ہے۔“

☆وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡھَا حَیۡثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾ (56/12)

”اسی طرح ہم نے یوسف ؑ کو ملک میں بسا دیا کہ وہ جہاں چاہے رہے سہے۔ ہم جسے چاہیں اپنی رحمت پہنچا دیتے ہیں۔ ہم نیکو کاروں کا ثواب ضائع نہیں کرتے۔“

☆فَبَدَاَ بِاَوۡعِیَتِھِمۡ قَبۡلَ وِعَآءِ اَخِیۡہِ ثُمَّ اسۡتَخۡرَجَھَا مِنۡ وِّعَآءِ اَخِیۡہِ ؕ کَذٰلِکَ کِدۡنَا لِیُوۡسُفَ ؕ مَا کَانَ لِیَاۡخُذَ اَخَاہُ فِیۡ دِیۡنِ الۡمَلِکِ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوۡقَ کُلِّ ذِیۡ عِلۡمٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷۶﴾ (76/12)

”پس یوسف ؑ نے ان کے سامان کی تلاش شروع کی اپنے بھائی کے سامان کی تلاش سے پہلے۔ پھر اس جام کو اپنے بھائی کے سامان سے نکالا۔ ہم نے یوسف ؑ کے لیے اسی طرح یہ تدبیر کی۔ اس بادشاہ کے قانون کی رو سے یہ اپنے بھائی کو نہ لے سکتا تھا۔ مگر یہ کہ اللہ ایسا چاہتا تھا۔ ہم جس کے چاہیں درجے بلند کر دیں۔ ہر علم والے سے بڑا ایک علم والا موجود ہے۔“

☆اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡھِبۡکُمۡ وَ یَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿ۙ۱۹﴾ (19/14)

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بہترین تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور نئی مخلوق لے آئے۔“

☆یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ج وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیۡنَقفلا وَیَفۡعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ۵ (27/14)

"ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پکی بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور ظالم لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ جو چاہے وہ کرتا ہے۔"

☆یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ۵(2/16)

"وہی فرشتوں کو اپنی وحی دے کر اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔ کہ تم لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ پس تم مجھ سے ڈرو۔"

☆رَبُّکُمۡ اَعۡلَمُ بِکُمۡ اِنۡ یَّشَاۡ یَرۡحَمۡکُمۡ اَوۡ اِنۡ یَّشَاۡ یُعَذِّبۡکُمۡ ط وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ وَکِیۡلًا ۵ (54/17)

"تمہارا رب تم سے بہ نسبت بہت زیادہ جاننے والا ہے وہ اگر چاہے تو تم پر رحم کر دے۔ چاہے تمہیں سزا دے۔ ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار ٹھیرا کر نہیں بھیجا۔"

☆وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡہَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِہٖ عَلَیۡنَا وَکِیۡلًا ۵ (86/17)

"اور اگر ہم چاہیں تو جو وحی آپ کی طرف ہم نے اتاری ہے۔ سب سلب کر لیں۔ پھر آپ کو اس کے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی میسر نہ آ سکے۔"

☆نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ط یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ط(35/24)

"نور پر نور ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جسے چاہتا ہے۔"

☆وَلَوۡ شِئۡنَا لَبَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَۃٍ نَّذِیۡرًا ۵(51/25)

"اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔"

☆اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ج وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ج ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا٥(25/45)

"کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے کس طرح سائے کو پھیلا دیا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرا ہوا ہی کر دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس کا رہنما بنایا۔"

☆وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ٥(32/13)

"اگر ہم چاہتے تو ہر فرد کو ہدایت نصیب فرمادیتے۔ لیکن میری یہ بات بالکل حق ہو چکی ہے کہ میں ضرور جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھر دوں گا۔"

☆لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ط یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ٥ لا اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ج وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ط اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ٥(42/49-50)

"آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت اللہ تعالی ہی کے لیے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے۔ یا انہیں جمع کر دیتا ہے بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی۔ اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے اور وہ بڑے علم والا اور کامل قدرت والا ہے۔"

☆وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ط اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌ ۢ بَصِیْرٌ٥(42/27)

"اگر اللہ تعالی اپنے سب بندوں کی روزی فراخ کر دیتا تو وہ زمین میں فساد برپا کر دیتے۔ لیکن وہ اندازے کے ساتھ جو چاہتا ہے نازل فرماتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے پورا باخبر ہے اور خوب دیکھنے والا ہے۔"

☆اَللّٰهُ لَطِیْفٌ ۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ ج وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ٥(42/19)

"اللہ تعالی اپنے بندوں پر بڑا ہی لطف کرنے والا ہے۔ جسے چاہتا ہے کشادہ روزی دیتا ہے اور وہ بڑی طاقت والا اور بڑے غلبہ والا ہے۔"

☆وَلَوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانۡتَصَرَ مِنۡھُمۡ لا وَلٰکِنۡ لِّیَبۡلُوَا۠ بَعۡضَکُمۡ بِبَعۡضٍ ط(4/47)

"اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا لیکن اس کا منشا یہ ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے کا امتحان لے۔"

☆وَکَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُھُمۡ شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَرۡضٰی ۵(26/53)

"اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی۔ مگر یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالی اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کے لیے چاہے اجازت دے دے۔"

☆کَلَّاۤ اِنَّہٗ تَذۡکِرَۃٌ ۵ ج فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ ۵ ط وَمَا یَذۡکُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ط ھُوَ اَھۡلُ التَّقۡوٰی وَاَھۡلُ الۡمَغۡفِرَۃِ ۵(74/54-56)

"سچی بات تو یہ ہے کہ یہ قرآن ایک نصیحت ہے۔ اب جو چاہے اسے یاد کرلے اور وہ بھی جب ہی یاد کریں گے جب اللہ تعالی چاہے۔ وہ اسی لائق ہے کہ اسی سے ڈریں اور اس لائق بھی کہ وہ بخش دے۔"

☆اِنَّ ھٰذِہٖ تَذۡکِرَۃٌ ج فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیۡلًا ۵ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۵ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ط وَالظّٰلِمِیۡنَ اَعَدَّ لَھُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۵(76/29-31)

"یقیناً یہ قرآن تو ایک نصیحت ہے پس جو چاہے اپنے رب کی راہ لے لے۔ اور تم نہ چاہو گے مگر یہ کہ اللہ ہی چاہے۔ بے شک اللہ تعالی دانا اور حکمت والا ہے۔ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرلے اور دردناک عذاب کی تیاری تو صرف گنہ گاروں کے لیے ہے۔"

☆اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۵ لا لِمَنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ ۵ ط وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۵(81/27-29)

"یہ قرآن تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت نامہ ہے۔ بالخصوص اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے۔ اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔"

ان آیات پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی مرضی" کو قانون مشیت کے پیرائے میں بیان کرنا درست نہیں ہے۔ پرویز صاحب نے ہر جگہ جہاں بھی کسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے وہاں "قوانین خداوندی"، "قانون مشیت" وغیرہ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی ذات کو انسانی دنیا سے کاٹ دیا ہے۔ اور "قانون" کے لفظ کے استعمال سے ان کا مفہوم اسی طرح کے فطری یا سائنسی طریق کے قوانین ہیں جن پر کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ اس کے بعد جہاں دل کیا "قانون مشیت" کا لفظ استعمال کر لیا اور جہاں دل کیا "مشیت خداوندی" کا لفظ استعمال کر لیا۔ اور جہاں دل کیا اس کو "مرضی" یا "رضا" یعنی اصل معنوں میں استعمال کر لیا۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ ج (18/29) جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

مقام حیرت ہے کہ جہاں پر " لَوْ شَآءَ" کا لفظ کافر لوگ استعمال کر رہے ہیں وہاں اسی مفہوم کو صحیح سمجھا جا رہا ہے۔ آیئے یہاں کچھ آیتیں دیکھتے ہیں۔

☆وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ طکَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ج فَھَلْ عَلَی الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۵ (16/35)

"مشرک لوگوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالی چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادے اس کے سوا کسی اور کی عبادت ہی نہ کرتے، نہ اس کے فرمان کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے۔ یہی فعل ان سے پہلے کے لوگوں کا رہا۔ تو رسولوں پر تو صرف کھلم کھلا پیغام کا پہنچا دینا ہے۔"

☆وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ط مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ق اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۵ ط (20/43)

"اور وہ کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے، انہیں اس کی کچھ خبر نہیں، یہ تو صرف اٹکل پچو (جھوٹ باتیں) کہتے ہیں۔"

☆وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ لا قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ ق صلے اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۵ (47/36)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ خرچ کرو تو کافر کہتے ہیں مسلمانوں سے کہ ہم انہیں کیوں کھلائیں۔ جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود ہی کھلا دیتا۔ تم تو ہو ہی کھلی گمراہی میں۔"

پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں (35/16) آیت کے لیے "لَوْ شَآءَ اللّٰهُ" کا مطلب یہی کیا ہے۔ "اگر اللہ چاہتا تو"۔ اور باقی آیات میں بھی۔

اب دیکھئے کہ ان آیات میں لفظ "قانون مشیت" استعمال کریں تو ان آیات کا کیا مطلب بنے گا، مثلاً (47/36) کو اگر پرویز صاحب کے الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم ہو گا

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ خرچ کرو تو کافر، ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ رزق تو اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہی ملتا ہے۔" (معاذ اللہ)

اس لیے یہ طریقہ کار غلط ہے کہ قرآنی الفاظ کے مطالب اپنی مرضی سے کہیں کچھ استعمال کئے جائیں اور کہیں کچھ ؟ اللہ تعالی نے تو ان آیات میں یہ الفاظ کفار کے منہ سے ادا کرواکے ان کے کیسے معانی واضح کر دیئے ہیں۔

اب دی گئی آیات کریمہ پر غور کریں تو دیکھیں کہ کس طرح قانون مشیت کسی کو بیٹے، کسی کو بیٹیاں دے سکتا ہے؟ اور کسی کو بانجھ رکھ سکتا ہے اور کس طرح رزق کی کمی بیشی کر سکتا ہے؟ سائے کو اللہ تعالی نے پھیلا دیا ہے اگر وہ چاہتا تو اسے ساکن کر دیتا۔ اس کا تو قانون مشیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ پھر اگر اللہ تعالی چاہتا تو خود ہی بدلہ لے لیتا۔ لیکن اس نے تو بعض کی بعض کے ذریعے سے آزمائش بھی کرنا ہے۔

ان بیان کردہ آیات میں جو بھی افعال بتائے گئے ہیں وہ ایک کلی بااختیار و ارادہ اور مقتدر ہستی ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ اور "قانون" نام کی کوئی جامد چیز ایسے کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ اس لیے یہ کہنا کہ اللہ نے انسانی دنیا کے لیے قوانین بنادیئے ہیں۔ اور اب ان میں دخیل نہیں ہوتا۔ ایک قطعاً غلط تصور ہے۔ اللہ تعالی نے فطری / سائنسی قوانین خارجی کائنات کے لیے بنائے ہیں۔ کیونکہ باقی کائنات ان قوانین کی پیروی کے لیے مجبور پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالی کا بالواسطہ تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ جہاں اس انداز کے قوانین ناقابل عمل ہیں۔

اگر انسانی زندگی اور دنیا میں اللہ تعالی دخل نہیں دیتا تو پھر قرآن میں بیان کردہ معجزات کے واقعات کس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لوطؑ اور ان کے ساتھی تو عذاب سے بچ جاتے ہیں مگر ان کی بیوی اور دیگر قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قوم عاد، قوم ثمود اور دیگر اقوام کے ساتھ ہوا۔ اور اللہ تعالی نے اس چیز کو زور دے کر بیان کیا ہے۔ کہ ہم ایمان والوں کو بچالیں گے۔

اس کے علاوہ یہ بھی دیکھیں کہ اگر اللہ تعالی کو انسانی دنیا میں "داخل" نہیں کرتے پھر "دعا" کا کیا وجود رہ جاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ "یونسؑ نے تاریکیوں میں ہمیں پکارا تو ہم نے اسے نجات دی۔" اس کے علاوہ دیگر انبیاء کی انفرادی دعائیں بھی ہیں۔

اب آتے ہیں دوسری بات کی طرف کہ "مَنۡ يَّشَآءُ" کا ترجمہ "جسے اللہ چاہے" کرنے سے "مسئلہ جبر" لازم آتا ہے تو یہ تصور غلط ہے۔ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر بیان کیا ہے کہ انسان ایک بااختیار و ارادہ ہستی ہے اور یہ چیز ہم اپنی روزمرہ زندگی میں بھی دیکھتے ہیں۔ بلکہ خود اللہ تعالی نے اس کی تردید کی ہے جب کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو زبردستی ہدایت پر ڈال دیتا۔ " يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ" صرف ایک ٹکڑے کو بنیاد بنا کر "مسئلہ جبر" کو لازم نہیں کیا جا سکتا جبکہ قرآن نے فرمایا ہے۔ "يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا وَّيَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِيۡنَ ۙ (26/2)" اس سے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے اور گمراہ فقط فاسقوں کو کرتا ہے۔" پھر کہا" وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيۡنَ (27/14) " وہ تو ظالم لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ " وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا" کہ جو لوگ ہمارے راستے کی جانب جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کے لیے راستے آسان کر دیتے ہیں۔

پھر ساری قرآنی تعلیم کا یہی تو فلسفہ ہے کہ نیک لوگ جنت کے حقدار ہوں گے اور کافر، ظالم اور فاسق لوگ ہی دوزخ کے حقدار ہوں گے۔" "مسئلہ جبر" کے حوالے سے کبھی قرونِ اولی کے عربوں نے کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ یہ تو زبان کا اسلوب ہے عربوں کی زبان ہے اور انہیں ہر طرح سے زبان کے حوالے سے معاملات کی سمجھ آ رہی تھی۔

دعا۔ اب ہم جائزہ لیں گے دعا کے موضوع پر پرویز صاحب کے تصور کا۔

”ہمارے ہاں دعا کا مفہوم خدا سے کچھ مانگنا لیا جاتا ہے۔ اس میں مانگنے کا تصور ایسا غالب اور عمیق ہوتا ہے کہ ہم ”دعا مانگنے“ کے الفاظ بھی عام طور پر بولتے ہیں۔ حالانکہ اگر خود دعا سے مفہوم ”مانگنا“ لیا جائے تو ”دعا مانگنا“ کی ترکیب بے معنی اور بے ربط ہو جائے گی۔ عربی زبان میں دعا کے معنی مانگنا نہیں۔ بلکہ کسی کو آواز دینا، بلانا، پکارنا ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر کسی کو مدد کے لیے پکارا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے معنی مدد مانگنے کے لئے جاتے ہیں۔

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک ہی لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال کرتا ہے جو حضرات انبیائے کرامؑ کے لائے ہوئے دین خالص کے نہیں، بلکہ اس کی محرف شکل، مذہب کے پیرو ہوتے ہیں۔ اور ان کے سلسلہ میں بھی جو دین خالص (قرآن) کے متبع ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک لفظ کو اول الذکر کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے۔ تو اس سے وہی مفہوم لیتا ہے۔ جو ان کے ہاں مروج ہوتا ہے۔ اور جب اسی لفظ کو ثانی الذکر کے ضمن میں استعمال کرتا ہے تو اس سے صحیح قرآنی مفہوم لیتا ہے۔ مثلاً وہ الہ کا لفظ دونوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن مذہب پرستوں کے ہاں اس کا تصور کچھ اور ہوتا ہے اور دین کی رو سے کچھ اور۔ یا جب وہ عبادت کا لفظ استعمال کرتا ہے تو مذہب پرستوں کے ہاں اس سے مفہوم پرستش، پوجا پاٹ (Worship) ہوتا ہے۔ لیکن دین کی رو سے اس کے معنی احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت ہوتا ہے۔ دین میں پرستش کا تصور نہیں بلکہ اطاعت اور محکومیت کا تصور ہوتا ہے۔ اور الہ سے مفہوم وہ بلند و بالا صاحب اقتدار ہستی، جس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے۔ اسی طرح جب وہ دَعَا۔ یَدْعُوْا وغیرہ کے الفاظ مذہب پرستوں کے لئے لاتا ہے تو اس سے ان کا وہ تصور مقصود ہوتا ہے جس کی رو سے وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ لیکن جب یہی لفظ خدا کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے مقصود محض ”پکارنا“ نہیں ہوتا۔ خدا کی اطاعت کرنا بھی ہوتا ہے۔“

(کتاب التقدیر 361-362)

” وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنّیْ فَاِنّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔۔۔(2/186)

اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے (اے رسولؐ! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں۔)

اس ترجمہ کی رو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بے کس و بے بس، مصیبت زدہ لوگ گڑ گڑا، گڑ گڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن انکی کوئی مصیبت رفع نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے سہتے مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ لہذا اس امر واقع کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا اور اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالی سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا۔ لیکن یہ جواب (قطع نظر اس سے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، بر سر حق مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا۔) بڑے دور رس (تخریبی) نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی۔ بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تو (مذکورہ بالا جواب کی روسے) اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے۔ اس لیے اسے اب نہ اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنی چاہیے۔ اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنی۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے عقائد ظالموں کو کس طرح بے لگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے، ان ظالموں کے خلاف مظلوموں کے دل میں (کم از کم) انتقام کے جذبات تو ابھرتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دست تظلّم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے۔ لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہو گی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا۔ بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا۔ کہ وہ اس کے لیے بہتری کے سامان پیدا کر رہا

ہے۔ یاللعجب۔ آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں اور زیردستوں کے لیے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں۔ تاکہ وہ انہیں ذبح کریں اور یہ ان کے شکر گزار ہوں۔ (کتاب التقدیر 365-366)

دعا سے ہوتا کیا ہے۔ کوئی کام کرنا ہو اس کے لیے سب سے پہلے، ہمارے دل میں آرزو بیدار ہوتی ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ جس قدر یہ آرزو شدید ہو گی، اس قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہو گا۔ اور جس قدر ارادہ مستحکم ہو گا۔ اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں گے۔ علامہ اقبال نے بچوں کے لیے ایک نظم لکھی ہے۔ جسے ہم ابتدائی مدرسہ کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ یعنی وہ نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔

اس شعر کے مصرعہ اول میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ (یوں تو) بچوں کے لیے ہے۔ لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ بڑی عمیق ہے۔ یعنی جب انسان کی دلی تمنا، حروف و الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے تو اسے دعا کہا جاتا ہے۔ جتنی گہری تمنا، اتنی ہی مخلص دعا۔ جتنی شدید آرزو، اتنی ہی پر کیف پکار۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ پھر، جس قسم کی آرزو، اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے، خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پیش لفظ میں کہا ہے، میں اس کتاب میں، مسئلہ تقدیر اور اس کے تضمنات پر فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا کہ اس سے بات عام فہم بھی نہیں رہے گی۔ اور ہمارا سفر بھی بہت طول طویل ہو جائے گا ورنہ (Subjective Idealism) کا تو یہ کہنا ہے کہ خارجی کائنات کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس کے احوال و کوائف، ہمارے دل ہی کے پرتو ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدت آرزو سے اس

کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا انداز نگاہ بدل دیتی ہے۔ اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے اس قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو، عشق کی ایک جست قصہ تمام کر دیتی ہے۔ وہ شدت آرزو ہی کی پیدا کردہ توانائی کی رو سے ہوتا ہے۔ اس باب میں جب ہم، زمانہ ء جاہلیت' کے عربوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ تمدن و تہذیب سے اس قدر عاری اور فلسفہ و منطق سے اس قدر نابلد ہونے کے باوجود، ان کی نگاہ کس قدر بلند اور ان کی فکر کس قدر عمیق تھی۔ اور اس کے مظاہرہ کا ان کے ہاں ایک ہی ذریعہ تھا۔۔۔ یعنی ان کی زبان۔۔۔ لسان عربی مبین۔۔۔۔ یہ (بادیہ نشین) جب اپنے مویشیوں کا دودھ دوہتے تو تھوڑا سا دودھ تھنوں میں باقی چھوڑ دیتے۔ یہ دودھ، اس دودھ کے نیچے اتارنے کا موجب بن جاتا جسے جانور نے اوپر چڑھا لیا ہوتا۔ اس طرح چھوڑے ہوئے دودھ کو وہ "الدَّاعِيَة" کہتے۔ اس سے دعا کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی وہ کیفیت جو انسانی جذبات کو ابھارنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کا موجب بنے جس سے اس کی مضمر توانائیاں (چھپا ہوا دودھ) مشہود ہو کر باہر نکل آئیں۔ شدت آرزو سے، جس کا دوسرا نام دعا ہے۔

(کتاب التقدیر 379-381)

انبیائے کرامؑ کی انفرادی دعائیں۔

قرآن کریم میں حضرات انبیائے کرامؑ کی بعض انفرادی دعاؤں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً حضرت ایوبؑ نے اپنی انتہائی تکلیف میں خدا کو پکارا اور خدا نے ان کی مصیبت کو رفع کر دیا۔ (21/83-84) حضرت یونسؑ نے اپنے غم و الم کی اندوہناکیوں میں خدا کو پکارا اور انہیں مصیبت سے نجات مل گئی (21/87-88)۔ سو اول تو قرآن کریم نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ ان کے مصائب و آلام دور کرنے کے لیے کس قسم کے اسباب پیدا کئے گئے تھے۔ دوسرے (اور یہ بات بنیادی ہے) کہ نبوت ایک ایسا مقام ہے جس کی کنہ وماہیت کا سمجھنا کسی غیر نبی کے لئے ممکن نہیں۔ ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا اور نبی کا باہمی تعلق کس قسم کا ہوتا تھا۔ خدا نبی سے کس طرح ہم کلام ہوتا تھا۔ نبی خدا سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ لہذا جس حقیقت کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے اس

کے متعلق بحث و گفتگو سے کیا حاصل! ویسے بھی ختم نبوت کے بعد، اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ خدا اور نبی کے اس باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ خدا اور انسانوں کا تعلق خدا کی اس وحی کی رو سے قائم ہوتا ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ خدا سے کسی کے براہ راست تعلق پیدا کرنے کا نہ امکان ہے نہ کوئی ذریعہ۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ خواہ اس کے لئے الفاظ یا اصطلاحات کچھ ہی کیوں نہ استعمال کی جائیں۔ چونکہ اب نبوت کا دعویٰ باطل ہے۔ اس لئے خدا سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کا دعویٰ بھی غلط ہے۔ کشف، الہام وغیرہ قسم کے تصورات، سب غیر قرآنی ہیں اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیے ہوئے۔ قرآن کریم میں تو یہ الفاظ تک بھی نہیں آئے۔

حضور نبی اکرمؐ کی جو انفرادی دعا قرآن کریم میں آئی ہے۔ وہ ہر انسان کے لئے قیامت تک حسن آرزو کا بلند ترین نمونہ ہے آپؐ سے کہا گیا کہ " قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا(20/114)" کہو! اے میرے نشو و نما دینے والے، مجھے علم فراواں عطا فرما۔ اے کاش حضورؐ کے نام لیوا، اپنے سینوں کو اس ایک آرزو کا گہوارہ بنا لیتے تو آج ان کا مقام کیا ہوتا۔" (کتاب التقدیر 385-386)

یہ تھا پرویز صاحب کا تصور دعا۔ آیئے اس کا قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

انسانی دنیا میں خدا کے بطور ایک مقتدر ہستی کے وجود کی سب سے بڑی دلیل دعا ہے۔ اور جس انداز سے اللہ تعالیٰ نے دعا کا عمل سکھایا ہے اس سے یہ تصور اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ۵(2/186) جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں میں بہت قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار کو

قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے۔ اس لیے انہیں چاہیئے کہ میری بات کو مانیں اور مجھ پر ہی ایمان رکھیں تاکہ وہ ہدایت پر ہوں۔

پرویز صاحب کا کہنا کہ ایسا ترجمہ کرنے سے دشواری پیش آتی ہے کہ ظالم ظلم کرتا رہے اور مظلوم گڑ گڑا کر دعائیں مانگتے رہیں۔ اب اس چیز کی وجہ سے کیا اس آیت کا ترجمہ بدل دیا جائے؟ یہ تو ناممکن ہے۔ تو پھر اس کا مفہوم ہی بدلا جاسکتا ہے۔ اب پرویز صاحب نے تو اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔

اس طرح کی باتیں کر کے پرویز صاحب ایک چیز بھول جاتے ہیں کہ ابتلا اور آزمائش بھی کوئی چیز ہے اور اللہ تعالی نے اپنے مقرب انبیائے کرامؑ کو بھی بہت بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالا۔ اور فرمایا وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ۵(2/155) اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے خوف سے، بھوک سے، مال اور جان کی کمی سے اور پھلوں کی کمی سے۔ پس بشارت دے دو ان کو جنھوں نے صبر کیا۔ اَلَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ لا قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ۵ اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ قف وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ۵(2/156-157) وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالی کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

پھر جیسا کہ پرویز صاحب نے کہہ دیا کہ "امر واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی عمر مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے" اس لیے یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا اور اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔" ہم یہ نہ بھی کہیں کہ کوئی فرد کسی آزمائش سے دوچار ہے پھر بھی انفرادی طور پر تو خدا سنتا اور قبول کرتا ہے۔ آیئے اس کی دلیل قرآن کریم سے دیکھتے ہیں۔

☆وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ج فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ط كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۵(10/12)

”اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی، پھر جب ہم اس کی تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اپنی تکلیف کے لیے جو اسے پہنچی تھی کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال ان کو اسی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں۔“

☆هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ طحَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ لا دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۵ ج لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۵ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط(10/22-23)

”وہ اللہ ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں لیے لیے پھرتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو، اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ ان سے خوش ہوتے ہیں۔ ان پر ایک جھونکا سخت ہوا کا آتا ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ (برے) آگھرے (اس وقت) سب خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارتے ہیں کہ اگر تو ہم کو اس سے بچالے تو ہم ضرور شکر گزار بن جائیں گے۔ پھر جب اللہ تعالی ان کو بچالیتا ہے تو فوراً ہی وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔“

ان آیات میں اللہ تعالی نے انسان کی ایک کیفیت بیان کی ہے کہ وہ جب مصیبت میں ہوتا ہے تو اللہ کو مدد کے لیے پکارتا ہے پھر جب اللہ اس کی مصیبت کو رفع کر دیتے ہیں تو انسان فراموش کر دیتا ہے۔ یہ چیز یہی ظاہر کرتی ہے کہ مشکلات میں صرف اللہ ہی سنتا ہے اور جواب دیتا ہے بلکہ قبول کرتا ہے۔

☆اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۵(27/62)

"کون ہے جو بے کس کی پکار کو قبول کر کے سختی کو دور کر دیتا ہے جب وہ پکارے۔ اور تمہیں زمین میں خلیفہ بناتا ہے کیا اللہ تعالی کے ساتھ کوئی اور الہ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی حضرات انبیائے کرامؑ کی انفرادی دعائیں بھی ہمارے لیے باعث نمونہ اور باعث نصیحت ہیں کہ جب بھی ان پر کوئی سختی یا تنگی آئی تو انہوں نے اللہ کو پکارا اور مدد طلب کی تو اللہ تعالی نے ان کی مدد کی۔

☆وَاَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ج ۵ صلے فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَکَشَفۡنَا مَا بِہٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّاٰتَیۡنٰہُ اَہۡلَہٗ وَ مِثۡلَہُمۡ مَّعَہُمۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَذِکۡرٰی لِلۡعٰبِدِیۡنَ ۵ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِدۡرِیۡسَ وَ ذَا الۡکِفۡلِ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ ۵ وَ اَدۡخَلۡنٰہُمۡ فِیۡ رَحۡمَتِنَا اِنَّہُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۵ وَ ذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّہَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ ق صلے اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ج ۵ صلے فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ لا وَ نَجَّیۡنٰہُ مِنَ الۡغَمِّ ط وَ کَذٰلِکَ نُنۡجِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۵ وَ زَکَرِیَّاۤ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ ج ۵ صلے فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ ز وَ وَہَبۡنَا لَہٗ یَحۡیٰی وَ اَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ ط اِنَّہُمۡ کَانُوۡا یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَ یَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّ رَہَبًا ط وَ کَانُوۡا لَنَا خٰشِعِیۡنَ ۵ (21/83-90)

" اور ایوبؑ کی حالت کو یاد کرو جبکہ اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے یہ بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور جو دکھ انہیں تھا اسے دور کر دیا اور اس کو اہل وعیال عطا فرمائے۔ بلکہ ان کے ساتھ ویسے ہی اور اپنی خاص مہربانی سے تاکہ سچے بندوں کے لیے سبب نصیحت ہو۔ اور اسمعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ یہ سب صابر لوگ تھے۔ ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔ یہ سب لوگ نیک تھے۔ مچھلی والے (حضرت یونسؑ) کو یاد کرو! جب کہ وہ غصہ سے چل دیا اور خیال کیا کہ ہم اسے پکڑ نہ سکیں گے۔ بالآخر وہ تاریکیوں کے اندر سے پکار اٹھا کہ الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ بے شک میں ظالموں میں ہو گیا۔ تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی۔ اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچایا کرتے ہیں۔ اور زکریاؑ کو یاد کرو جب اس نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے پروردگار مجھے تنہا نہ

چھوڑ، تو سب سے بہتر وارث ہے۔ تو ہم نے اس کی دعا کو قبول فرما کر اسے یحییٰؑ عطا فرمایا۔ اور ان کی بیوی کو ان کے لیے درست کر دیا۔ یہ بزرگ نیک کاموں کی طرف جلدی کرتے تھے۔ اور ہمیں لالچ، طمع اور ڈر خوف سے پکارتے تھے۔ اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔“

تصریحات بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس ساری کائنات میں بطور مقتدر ہستی کے موجود ہے۔ اور سارا نظام کائنات بشمول انسانی دنیا اسی کی منشا کے مطابق رواں دواں ہے۔ وہ خالق ہے، مالک ہے، رازق ہے اور ہر انسان کی پکار کو سننے والا ہے۔ اور ہر ایک کے عمل سے باخبر ہے۔ نیکی اور بدی میں فرق اس نے بتا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کو رغبت دلائی ہے کہ اپنے آپ کو جتنا اس کے سپرد کر کے رکھو گے۔ اتنا ہی وہ تمہارے معاملات میں سہولت پہنچائے گا۔ اور یہ کہ وہ کسی بھی طرح کے قانون کا پابند نہیں ہے۔ قادر مطلق ہے اور بااختیار و ارادہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے وہ اسباب بیان کر دیئے ہیں جن سے انبیاء کرامؑ کی تکالیف دور کر کے ان کو سکون مہیا کیا گیا۔

اس لیے ذات خداوندی کے بارے میں پرویز صاحب کا تصور درست نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہر جگہ قرآنی مفاہیم کے لیے لفظ ”قانون“ کا استعمال غیر قرآنی ہے۔

{☆☆☆☆☆}

باب پنجم: معاشی نظام

اب ہم دیکھتے ہیں پرویز صاحب کے معاشی نظام کو جو بقول ان کے قرآنی نظام کے عین مطابق ہے اور صدر اول میں ایسا ہی نظام متشکل تھا۔ اس کے لیے ان کی تصنیف ہے "نظام ربوبیت"۔ جس کا بیشتر حصہ فلسفیانہ مباحث سے متعلق ہے۔ اور معاشی نظام جو انہوں نے بیان فرمایا اس کے چند نکات اس طرح ہیں۔

ا۔ انسانی ضروریات زندگی کا پورا کرنا نظام مملکت کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار نظام مملکت کی ملکیت میں رہیں اور زمین کی انفرادی ملکیت کا تصور غلط ہے۔

۳۔ ہر فرد اپنی دی گئی استعداد کے مطابق کام کرے اور اپنی موجود ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی سب کچھ نظام مملکت کے حوالے کر دے۔ اور نظام باقی لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دے۔ اس طرح معاشی مساوات قائم ہو جائے گی۔

۴۔ انفاق، صدقات، خیرات اور وراثت کے احکامات عبوری دور سے متعلق ہیں۔

یہ چند نکات ہیں اس کے بارے میں تفصیلات ہم ”نظام ربوبیت“ سے اخذ کر کے نیچے درج کرتے ہیں تا کہ معاشی نظام کے بارے میں پرویز صاحب کا تصور واضح طور پر سامنے آجائے۔

”نظام مملکت کی ذمہ داری۔

یہ ہیں رزق کے سلسلہ میں وہ پیچیدگیاں جن کا حل، انسانوں کے وضع کردہ معاشی نظاموں میں سے کوئی نظام نہیں کر سکا۔ اس کا حل قرآن نے بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ضروریات زندگی کا پورا کرنا افراد کی ذمہ داری نہیں۔ یہ نظام مملکت کی ذمہ داری ہے۔ افراد کے ذمے، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اس کام کا سر انجام دینا ہے۔ جو ان کے سپرد کیا جائے۔ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی ضروریات زندگی پورا کرنا مملکت کا کام ہے۔ صرف انہی افراد کی نہیں بلکہ مملکت کے دائرے کے اندر ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری قرآنی حکومت کے سر پر ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (11/6) ”زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔“

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ ”ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے“ لیکن خدا ایسا نہیں کرتا کہ ہر شخص تک رزق خود پہنچائے۔ خدا کی اطاعت کا عملی طریق اس حکومت کی اطاعت ہے جو احکام خداوندی کو نافذ کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیتی ہے۔ اسی انداز سے، ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری اس نظام پر عائد ہوتی ہے۔ جو دنیا میں خدا کے نام پر حکومت قائم کرتا ہے۔ وہ نظام خدا کی طرف سے (On His Behalf) یہ اعلان کرتا

ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6/152) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار۔

اس سے واضح ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں وہ ذمہ داریاں جنہیں خدا نے اپنے اوپر عائد کر رکھا ہے۔ اس حکومت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے۔

(شاہکار رسالت۔332-333)

زمین کی انفرادی ملکیت۔ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے (کم کرتے) چلے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہو گی) اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کو لوٹا نہیں سکتی۔ ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔(13/41)

سورۃ الانبیاء میں کہا کہ انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین متاع حیات حاصل کرنے کے لیے ملی تھی۔ اس پر زمانہ گزر گیا تو انہوں نے اس پر قبضہء مخالفانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔(21/44) یوں اس دوسری منزل میں اس نظام کے قیام کی عملاً ابتدا کر دی۔ (شاہکار رسالت346)

زمین کی اس پوزیشن کو قرآن کریم نے، قوم ثمود کی تاریخی شہادت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیا کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ رہا۔ اس نے کہا کہ قوم ثمود کی معیشت کا مدار گلّہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ ان کے گردونواح کھلی چراگاہیں اور پانی کے چشمے تھے لیکن قوم کے سرداروں نے ان پر اپنا ذاتی قبضہ جما رکھا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے مویشی بھوکے اور پیاسے رہ جاتے تھے۔ ان کی طرف حضرت صالحؑ پیامبر انقلاب بن کر آئے۔ انہوں نے سرداران قوم کے اس غصب و نہب کے خلاف آواز بلند کی۔ ان سرداروں نے

آپ سے پوچھا کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمْ اٰیَۃً فَذَرُوْھَا تَاْکُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ ٥(13/7) یہ زمین خدا کی ہے، نہ تمہاری ہے نہ میری۔ اور یہ مویشی بھی اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے ان مویشیوں کو آزادی ہونی چاہیے کہ یہ اپنے خدا کی زمین سے چریں چگیں۔ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ تم ارض اللہ (خدا کی زمین) پر اس طرح حد بندیاں قائم کردو۔ کہ اس کی مخلوق اس کی زمین میں تمہاری عائد کردہ حدود سے آگے نہ جاسکے۔(11/64, 7/73)(شاہکار رسالت 351)

جس انقلاب کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی وہ عہد فاروقیؓ میں کئی منزلیں آگے بڑھ کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ جہاں اراضیات کو مملکت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔ یہ سوال اس وقت زیر غور آیا جب شام اور عراق کا علاقہ فتح ہوا۔ عراق میں دجلہ و فرات کی وادیاں صحیح معنوں میں زرخیز، (سونا اگلنے والی) تھیں۔ اس قسم کی اس قدر وسیع اراضیات جب مفتوحہ قرار پائیں تو ان کی تقسیم کا سوال سامنے آیا۔ اس سے پیشتر مفتوحہ زمینوں کو بھی مال غنیمت قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ سپاہیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اگر حضرت عمرؓ ان اراضیات کو بھی حسب دستور سابق سپاہیوں میں تقسیم کر دینا چاہتے تو اس کے لئے کسی غور و فکر اور بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ان کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس لئے انہوں نے ضرورت سمجھی کہ اسے مجلس مشاورت میں پیش کیا جائے۔ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ اس حیثیت سے بھی کہ اس میں اس فیصلہ کے خلاف فیصلہ کیا گیا جو عہد رسالت مآبؐ اور دور صدیقیؓ میں نافذ العمل تھا اور اس جہت سے بھی کہ معاشیات کے سلسلہ میں یہ ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کے متعلق جو بحث ہوئی تھی۔ اسے پوری تفصیل کے ساتھ درج کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے جب "غیر رسمی طور پر" صحابہؓ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار فرمایا تو آپ نے دیکھا کہ جہاں اکثر صحابہؓ آپ سے متفق تھے، بعض کو اس سے اختلاف بھی تھا۔ ان (موٴخر الذکر) میں حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ جیسے حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے مجلس مشاورت کے سامنے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ اس میں ان کا کچھ حصہ نہ رہے۔ کیا آپ لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آمدنی ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور نسلاً بعد نسلاً اسی طبقہ میں منتقل ہوتی رہے۔ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائیگی۔ بیواؤں اور حاجت مندوں کی کفالت کہاں سے ہو گی۔ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے بارے میں بھی فساد کرنے لگیں گے۔

اس کی تائید میں حضرت علیؓ نے تقریر کی جس میں فرمایا۔

"میری رائے ہے کہ کاشتکاروں اور اراضی کو جوں کا توں رہنے دیجئے۔ تاکہ یہ (اراضیات) سب لوگوں کے لیے یکساں معاشی قوت کا ذریعہ ہوں۔ (فوجوں میں زمین تقسیم کرنے سے یہ انہی میں سمٹ کر رہ جائے گی۔)

حضرت معاذؓ نے فرمایا

اگر آپ نے زمینیں تقسیم کر دیں تو زرخیز زمینوں کے بڑے بڑے ٹکڑے فوج میں بٹ جائیں گے پھر ان کے مرنے کے بعد کسی کی وارث کوئی عورت ہو گی اور کسی کا وارث کوئی اکیلا مرد۔ اسکے علاوہ سرحدوں کی حفاظت اور فوجیوں کی کفالت کے لئے حکومت کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لئے آپ کو وہ کام کرنا چاہئے جس میں آج کے لوگوں کے لئے بھی فائدہ اور سہولت ہو اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی۔"

اس تجویز کی مخالفت میں، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے جو تقاریر فرمائیں، ان کا ملخص یہ تھا کہ!

"جو مال اللہ نے ہمیں غلبہ سے عطا فرمایا ہے۔ وہ ہم لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ اسی طرح جس طرح رسول اللہؐ نے خیبر تقسیم کر دیا۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں، ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی اولاد کے لیے ہیں اور بعد والے اپنی اولاد کے لیے۔

حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے امیر المؤمنین کو مخاطب کر کے متعین طور پر پوچھا کہ

"کیا یہ اراضی اور ان کے غیر مسلم مالک، اللہ نے ہمیں فتح کے نتیجے میں نہیں دیئے؟"

اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:۔

"اے عبد الرحمن! بات وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں لیکن میں ان اراضیات کی تقسیم کے حق میں نہیں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اب، میرے بعد، کوئی ایسا ملک فتح نہیں ہو گا جس سے مسلمانوں کو اتنا نفع حاصل ہو، جتنا اب تک ہو چکا ہے۔ بلکہ (یہ بھی ممکن ہے کہ) آئندہ فتح ہونے والے علاقے مسلمانوں پر بار ثابت ہوں۔ سو اگر شام اور عراق کی اراضیات موجودہ مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں تو آئندہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے مال کہاں سے آئے گا۔ اور آج کے بعد فتح ہونے والے علاقوں کے یتیم اور بیواؤں کی کفالت کیونکر کی جا سکے گی۔

لیکن یہ حضرات اس پر بھی حضرت عمرؓ کی تجویز سے متفق نہ ہوئے۔ لہذا طے پایا کہ اس مسئلہ پر مجلس مشاورت کی آئندہ نشست میں غور کیا جائے۔ اس مجلس کی دوسری نشست میں انصار کے قبیلہ اوس و خزرج کے ممتاز عمائد کو بھی دعوت شرکت دی گئی کیونکہ وہ اراضیات کے معاملہ میں، مہاجرین کے مقابلہ میں بہتر تجربہ رکھتے تھے۔ اس نشست کا افتتاح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بار امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں بعض حضرات نے میری مدافعت کی تھی اور بعض نے مخالفت۔ مجھے نہ اس پر ملال ہے کہ اس باب میں کس نے میری مخالفت کی ہے، نہ اس پر فخر کہ کس نے میری موافقت کی۔ میں ہر گز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں۔ اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ

اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ (لیکن حق کا معیار نہ آپ کی رائے ہے نہ میری۔ حق کا معیار خدا کی کتاب ہے) اور یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے، اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطق بالحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہو گا۔"

آپ نے یہاں تک فرمایا تھا کہ آوازیں آنے لگیں "اے امیر المومنین! ہمیں تسلیم ہے کہ جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں وہی مناسب ہے۔" حضرت عمرؓ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

آپ نے میرے ان دوستوں کی آوازیں سنی ہونگی جو اس باب میں میری مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں شاید ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں حالانکہ میرے نزدیک کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا جائز نہیں۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے آج تک کسی شخص کے جائز حق پر تصرف کر کے اس پر ظلم نہیں کیا۔ یہ حضرات خود گواہ ہیں کہ مال منقولہ میں نے فوجیوں میں تقسیم کر دیا حتیٰ کہ خمس بھی اس کے مناسب موقع پر صرف کر دیا ہے۔ اب سوال زمین کا ہے۔ اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے۔ (اسے مملکت کی تحویل میں رہنے دیا جائے۔ اس کے انتظام کے متعلق میں نے سوچا ہے کہ) اسے موجودہ کاشتکاروں کے پاس رہنے دیا جائے اور ان سے خراج وصول کر لیا جایا کرے۔ تاکہ یہ آمدنی اجتماعی مفاد کے کام میں لائی جا سکے اور اس کے ذریعے فوج کے اخراجات نیز موجودہ اور بعد میں آنیوالی نسلوں کی پرورش کا سامان مہیا کیا جائے۔ آپ حضرات غور کیجئے کہ کیا یہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے؟ آخر جزیرہ، بصرہ، کوفہ، عراق، شام، مصر وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں فوجیوں کی چھاؤنیاں نہیں بنانی پڑیں گی؟ آخر ان کا خرچ کہاں سے پورا کیا جائے گا؟"

اس مقام پر دو قسم کی روایات سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے سورۂ حشر کی ان آیات سے جن کا ذکر اب کیا جائے گا، اسی مجمع میں استدلال فرمایا تھا جس پر تمام حضرات متفق ہو گئے اور بعض روایات میں ہے کہ

یہاں بھی اختلاف ہوا تو آپ نے مزید غور و فکر کے لیے تین دن کی مہلت طلب کی اور اس دوران میں قرآن مجید پر گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ تیسرے دن جب پھر مجلس کا انعقاد ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کتاب اللہ پر مزید غور و فکر کیا تو للہ الحمد کہ مجھے اس سے اپنی تجویز کے حق میں راہنمائی مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ حشر کی آیات (59/7-10) تلاوت فرمائیں۔ اور کہا کہ دیکھیے، ان میں مال فے کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ اس میں

ا۔ مہاجرین کا حق ہے۔۔ مہاجرین میں، جنگ میں شرکت کرنے والوں اور شرکت نہ کرنے والوں میں کوئی تخصیص وغیرہ نہیں کی گئی۔ صرف احتیاج (ضرورت مندی) کو شرط قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ انصار کا حق ہے اور ان میں بھی مندرجہ بالا تفریق نہیں کی گئی۔

ان دونوں کے بعد کہا گیا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ جَآئُوْا مِنْ م بَعْدِ ھِمْ (59/10)

"اور ان لوگوں کا بھی حق جو ان کے بعد آئیں۔"

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس قرآنی استدلال کو سن کر صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور وہ (مخالفین و موافقین سب) جوش مسرت سے بیک زبان پکار اٹھے کہ

آپ کی رائے بالکل درست ہے۔ ہم سب آپ سے متفق ہیں۔

اس طرح اس مشکل ترین اور اہم ترین معاملہ کا فیصلہ نہایت خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔

(شاہکار رسالت 384-388)

"اس مسئلہ کے حل کے لئے جو کچھ قرآن کریم سے میں سمجھا ہوں وہ یہی ہے کہ قرآن کسی کے پاس فاضلہ دولت رہنے نہیں دیتا۔ اور وسائل پیداوار پر (خواہ وہ فطری ہوں یا مصنوعی) کسی کی ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ خواہ ملکیت افراد کی ہو اور خواہ اسٹیٹ (مملکت) کی۔۔۔۔ قرآنی تصور حیات کی رو سے یہ تمام کائنات ایک حکیم و خبیر ہستی کی پیدا کردہ ہے۔ اور اسی کے غیر متبدل قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ اس کی تخلیق ایک عظیم مقصد کو لئے ہوئے ہے۔ انسانوں کی تخلیق بھی اسی خدا کے پروگرام کے مطابق عمل میں آئی ہے۔ اس نے انسانی زندگی کو اس کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے اپنی طرف سے راہ نمائی عطا کی ہے۔ جسے وحی کہا جاتا ہے۔ یہ وحی ان مستقل اقدار اور غیر متبدل قوانین پر مشتمل ہے۔ جو تمام نوع انسانی کے لئے بطور ضابطہء حیات کام کرتے ہیں۔ اس ضابطہء حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس زندگی کی خوشگواریاں بھی نصیب ہوتی ہیں اور وہ اس قابل بھی ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے۔ جو معاشرہ اس ضابطہء حیات کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ اسے قرآنی نظام کا حامل کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہوتی چلی جائے۔ اسی کا نام تکمیل ذات یا استحکام خودی ہے۔ یعنی ہر فرد کی انفرادیت کا ثبات اور اس کی تکمیل۔ اس نظام میں یہ کچھ نہ میکانکی طور پر رونما ہوتا ہے۔ اور نہ ہی کسی قسم کے جبر و تشدد سے پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ چیز اس معاشرہ کے افراد کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی، ان کے ذہن کی کاوشوں سے نشو و نما پاتی اور ان کے بازوئوں کی قوت سے پروان چڑھتی ہے۔ اس لئے کہ ان افراد کا ایمان ہوتا ہے کہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے دنیا میں کوئی عمل حتیٰ کہ کوئی خیال تک بھی بلا نتیجہ نہیں رہتا۔ انسانوں کا ہر عمل اور ارادہ وحی خداوندی (یعنی مستقل اقدار) سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ فرد پوری محنت سے کام کرتا ہے۔ اور اپنے لئے صرف اتنا لیتا ہے جو اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب کچھ اپنے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اس سے اس کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور وہ ابدی مسرتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس طرح اس معاشرہ میں نہ فاضلہ

دولت کسی کے پاس رہتی ہے اور نہ ہی پیداوار کے ذرائع پر ذاتی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔" (نظام ربوبیت۔23-24)

"باقی رہا ذاتی ملکیت کا "تقدس"۔ سو اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ یہ تصور یورپ کے ان فلاسفروں اور معاشی رہنمائوں کا پیدا کردہ ہے جو نظام سرمایہ داری کے بنیادی ستون ہیں بودن (Bodin) ہابز (Hobbes)، لاک (Locke)، والٹیر (Voltaire)، ہیوم (Hume) سب اسی زمرہ کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ذاتی ملکیت کو انسان کے فطری حقوق (Natural Rights) کی فہرست میں شامل کیا اور اس کا تحفظ حکومت کا اولین فریضہ قرار دیا۔ ان کے برعکس قرآن کریم کو دیکھئے۔ وہ حضرات انبیاء کرامؑ کے مسلک کو نوع انسانی کے لئے بطور دلیل راہ پیش کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے کسی رسول کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں کیا۔ خود حضور خاتم النبیین صلعم کے متعلق یہ حقیقت سب کو تسلیم ہے کہ (روزمرہ کی اشیا مستعملہ کے سوا) نہ حضورؐ کی کوئی ذاتی ملکیت تھی نہ فاضلہ دولت۔ بلکہ ایک حدیث کے مطابق (جو قرآن کریم کے مطابق ہے اور اس لئے قابل قبول) حضورؐ نے فرمایا کہ انا لا نورث۔ ہمارا کوئی وارث نہیں۔ ماترکنا صدقہ۔ ہم جو کچھ چھوڑ رہے ہیں وہ سب مفاد عامہ کے لئے ہے۔ (بخاری جلد نمبر2، صفحہ 996) چنانچہ اس اصول کے مطابق باغ فدک، جو حضورؐ کے ذاتی گزارے کے لئے تھا بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوا، بلکہ امت کی مشترکہ تحویل میں آگیا۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن کریم میں وراثت وغیرہ کے احکام کس لئے دیئے گئے ہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے۔ اس لئے وہ جہاں اس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے۔ عبوری دور کے لئے بھی ساتھ کے ساتھ راہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے گزر کر معاشرہ انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں ایسے ممالک بھی ہوں گے۔ جہاں مسلمان

اقلیت میں غیر مسلم (یا غیر قرآنی) نظام حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہونگے۔ وہاں انکی انفرادی زندگی مسلمانوں کی سی ہوگی۔ اس لئے ان کے لئے انہی احکام قرآنی پر عمل پیرا ہونا ممکن ہوگا جنہیں ہم نے عبوری دور کے احکام کہہ کر پکارا ہے۔ ان کے لئے کشاد کی راہ تو یہی ہوگی کہ آخر الامر، اس مملکت کی طرف ہجرت کر جائیں۔ جہاں قرآنی نظام نافذ ہو، لیکن جب تک یہ ممکن نہ ہو، انہیں بہر حال انفرادی احکام پر عمل پیرا ہی رہنا ہوگا۔" (نظام ربوبیت 26-27)

انفاق۔ اس لئے جو کچھ بھی نوع انسانی کی ربوبیت (رب العالمینی کو مشہود کرنے) کے لئے کھلا رکھا جائے گا۔ وہ خود تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ (وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ 2/272) یہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوگی۔ (يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ 2/272) اسلئے کہ اس سے تمہاری ذات میں پختگی پیدا ہو جائے گی۔ (تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ) اس سے تمہاری نگاہوں میں فراخی اور ظرف میں وسعت آجائے گی۔ اور اس طرح تمہاری ذات حدود فراموش ہوتی چلی جائے گی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ 3/92))

اور اگر تم وسعت و کشادگی چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی محنتوں کا عزیز ترین ماحصل ربوبیت عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ وہ انفاق جس سے دل میں کبیدگی پیدا ہو اور طوعاً و کرھاً کیا جائے اس کا نتیجہ کچھ نہیں۔ (وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ 9/54) ربوبیت عامہ کے لئے انفاق کی صورت یہ ہوتی ہے کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید (لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا 76/9) اس لئے کہ جو انفاق قانون خداوندی کی ربوبیت اعلیٰ کے لئے ہوتا ہے (اِبْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى 92/20) اس کا صلہ انسان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتا ہے۔ (الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى 92/18) اس لئے اس کے بدلہ میں دوسروں سے صلہ اور ستائش کا کیا سوال؟ اسی لئے سورئہ مدثر میں ہے

کہ (وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ 74/6) اس کا صلہ یہ ہے کہ اس سے خود تمہاری ذات کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ (هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ 55/60)

یہ ہے انفاق کا صحیح مفہوم۔ قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں تمام افراد معاشرہ اس قسم کے انفاق (اپنی محنتوں کے ماحصل کو ربوبیت عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینے) کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ وہ اس قسم کے مثالی معاشرہ کو (Ideal Society) جنت کہہ کر پکارتا ہے۔" (نظام ربوبیت 99-100)

"حقیقت یہ ہے کہ خود لفظ انفاق جسے قرآن نے اس تکرار کے ساتھ اپنے ہاں استعمال کیا ہے۔ اس تصور کا صحیح مفہوم سامنے لے آتا ہے۔ نفق ایسی سرنگ کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے کھلی ہو۔ (بر خلاف سرب کے جس میں صرف اندر داخل ہونے کا راستہ ہو۔ آگے نکلنے کا راستہ نہ ہو) منافق کو اسی لئے منافق کہتے ہیں کہ وہ دین میں ایک طرف سے داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انفاق کے معنی "کھلا رکھنے" یا "عام کرنے" کے ہیں۔ "انفاق" کا ترجمہ عام طور پر خرچ کرنا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے بنیادی معنی کی رو سے "خرچ کرنا"، اس کے مفہوم کو صحیح طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ "انفاق فی سبیل اللہ" کا صحیح ترجمہ ہونا چاہیے۔ "مفاد عامہ کے لئے کھلا رکھنا۔" (نظام ربوبیت 97)

اَلَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَکَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ﴿67/25﴾)

"وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو اس میں اسراف نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی (موقعہ پر) تنگی بھی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی روش ان دونوں حالتوں کے بین بین، اعتدال پر ہوتی ہے۔ (نظام ربوبیت 154)

انفرادی ملکیت۔ انسان کی عقل اپنے اس مسلک کے جواز میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتی ہے کہ مختلف انسانوں میں کمانے کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔ جو شخص زیادہ کماتا ہے اسے اپنی کمائی پر پورا پورا حق ملکیت حاصل ہونا چاہئے۔ اس سے اس کی کمائی چھین کر دوسروں کو دے دینا ظلم اور غصب ہے۔ جو شخص دن میں بیس روپے کماتا ہے۔ اس سے یہ کہنا کہ تم چار روپے رکھو اور سولہ روپے دوسروں کو دے دو، اگر جور و استبداد نہیں تو اور کیا ہے۔ حق و انصاف کا کون سا قانون ہے جس کی رو سے آپ اس کی محنت کا ماحصل چھین سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی کمائی میں سے کچھ رقم خیرات کرنا چاہے تو یہ اور بات ہے۔ آپ اس کے حق ملکیت میں تصرف نہیں کر سکتے۔ آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ مفاد پرستی اور سرمایہ داری کے پورے نظام کی عمارت اسی "دلیل" پر قائم ہوتی ہے۔ قرآن نے (بنی اسرائیل کے) قارون کو نظام سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس پر اعتراض کیا جاتا کہ اس کے پاس اس کی اس روش کا کیا جواز ہے کہ اس نے اس قدر دولت کے خزانے بھر رکھے ہیں اور غریب بھوکے مر رہے ہیں۔ تو وہ اس کے جواب میں کہتا ہے اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ۔ (28/78) میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنر مندی سے کمایا ہے۔

اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ میری ملکیت میں دست اندازی کرے! قرآن کہتا ہے کہ یہی دلیل ہر مفاد پرست اور سرمایہ دار گروہ پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ اور یہی دلیل اس تمام فتنہ کی جڑ ہے۔ (بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ 39/49) قرآن نہایت حسن و خوبی سے اس دلیل کا تجزیہ کرتا ہے اور حقائق کو سامنے لا کر اس کی کمزوری کو بے نقاب کرتا ہے۔ سنیے اس باب میں وہ کہتا کیا ہے۔

ذرا غور کرو تم صبح سے شام تک کام کرتے ہو اور ایک مزدور بھی صبح سے شام تک کام کرتا ہے۔ تمہارا دن بھر کا کام اتنا پیدا کرتا ہے جس کی قیمت (مثلاً) دو روپے ہے۔ تم دونوں کی کمائی میں دو عنصر شامل ہیں ۱۔ محنت ۲۔ کمائی کی استعداد کا فرق۔ شق نمبر ۱ دونوں میں مشترک ہے۔ فرق شق نمبر ۲ میں ہے۔ اور اسی فرق کی بنا پر تمہاری پیداوار کی قیمت (مزدور کی پیداوار سے) اٹھارہ روپے زیادہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ تمہاری استعداد کی زیادتی، تمہاری

اپنی ہے۔ اس لئے اس سے پیدا شدہ کمائی بھی تمہاری اپنی ہونی چاہیے۔ اس دلیل کی بنا پر تم اس زائد کمائی کو اپنی ملکیت میں رکھتے ہو۔ اس سے سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس سرمایہ سے تم بہت سی چیزیں خرید کر اپنی ملکیت میں لے آتے ہو۔ (مثلاً زمین، وسائل، آب پاشی، مکانات، صنعت وغیرہ) اس سے تمہاری آمدنی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ [پھر یہی جمع شدہ سرمایہ تمہاری اولاد کو وراثتاً مل جاتا ہے۔ انہیں نہ محنت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور نہ ہی کمانے کی استعداد کی حاجت۔ وہ بغیر کام کئے اس سرمایہ پر عیش کرتے ہیں۔ لہٰذا اس دلیل کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے کہ جس شخص میں کمانے کی استعداد زیادہ ہے۔ اسے اپنی زیادہ کمائی پر حق ملکیت حاصل ہے۔]

قرآن کہتا ہے کہ ذرا ان دونوں چیزوں کا تجزیہ کرو، یعنی ۱۔ تمہاری ذہنی استعداد اور ۲۔ سرمایہ کے ذریعے خرید کردہ وسائل پیداوار۔ اور پھر دیکھو کہ ان میں تمہارا حصہ کس قدر ہے۔

ایک انسان کی ذہنی استعداد کی تخلیق و تعمیر میں حسب ذیل عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔

۱۔ دماغی خلیات (Brain Cells) کی ساخت جس کا تعلق پیدائش سے ہے۔

۲۔ ابتدائی ماحول

۳۔ تعلیم و تربیت

۴۔ ذہنی استعداد کے استعمال کے موزوں مواقع۔

(ان سب کا تعلق اسی معاشرے سے ہے جن میں بچہ پیدا ہوتا ہے۔)

آپ غور کیجئے کہ ان تمام عناصر میں سے وہ کون سا عنصر ہے جو آپ کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ یا جس میں آپ کے کسب و ہنر کا دخل ہے؟ اگر آپ کا دماغ اچھا ہے تو یہ چیز آپ کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔ بلکہ وہبی (یا یوں کہیے کہ پیدائشی) ہے۔ اگر آپ کی تربیت اچھے ماحول میں ہوتی ہے۔ تو اس میں بھی آپ کی ذاتی کاریگری (تو ایک طرف

اختیار و ارادہ) کو بھی کوئی دخل نہیں۔ اگر اتفاق سے آپ کا ماحول خراب ہوتا تو آپ کیا کر لیتے؟ اسی طرح، اگر آپ کی تعلیم کے لئے اچھی درسگاہیں موجود تھیں تو اس میں بھی آپ کی اپنی کاریگری کا کوئی دخل نہیں۔ اگر اس علاقے میں، جہاں آپ پیدا ہوئے تھے۔ کوئی اسکول ہی نہ ہوتا۔ یا اسکول میں تعلیم کا اچھا انتظام نہ ہوتا تو آپ کی تعلیم ناقص رہ جاتی۔

اب لیجئے وہ وسائل پیداوار جنہیں آپ اپنے سرمایہ سے خرید کر ان کے اجارہ دار بن جاتے ہیں۔ ان سب سے بنیادی وسیلہ ارض (زمین) ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ قرآن نے معاشی زندگی کے لئے بھی ارض کی اصطلاح استعمال کی ہے کیونکہ تمام معاشی وسائل کی ام (ماں) ارض ہی ہے۔) قرآن کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ ارض کی تخلیق اور اس کے ذریعہء رزق ہونے میں تمہاری ہنرمندی کو کیا دخل ہے؟ یہی صورت پانی، حرارت، روشنی، ہوا، معدنیات وغیرہ کی ہے۔ قرآن نے اس بنیادی حقیقت کو اپنے مخصوص دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا اس کھیتی پر غور کرو جس کے ماحصل کے تم واحد مالک بننا چاہتے ہو۔ (اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ 56 / 63) تم اتنا ہی کرتے ہو نا! کہ ہل چلا کر بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد، کیا یہ قوت بھی تمہیں حاصل ہے کہ اس بیج کو زمین سے اگا کر پودا بنا دو؟ کیا یہ کچھ تم کرتے ہو یا ہمارا قانون کرتا ہے۔ جس پر تمہیں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ (ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ 56 / 64) اگر ہم اس کھیتی کو پروان نہ چڑھائیں اور اسے پکنے سے پہلے ہی چورا چورا کر دیں تو فصل کا گھر لے جانا تو ایک طرف، تمہاری محنت اور بیج کی قیمت بھی تم پر چٹی پڑ جائے۔ (لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ 56 / 65) اس سے آگے بڑھو اور اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری فصلوں اور خود تمہاری اپنی زندگی کا دارومدار ہے۔ (اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ 56 / 68) کیا اس پانی کو تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہمارا قانون برساتا ہے۔ (ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝56 / 69) فرض کرو، ہم ایسا انتظام نہ کرتے کہ سورج کی شعاعیں عمل کشید سے صاف اور مقطر پانی اوپر لے جائیں اور سمندر کے تمام نمک (جس سے اس کا پانی پینے کے قابل ہوتا ہے اور نہ ہی زراعت کے کام

آسکتا ہے) سمندر میں باقی رہ جائیں تو بتاؤ اس میں تم کیا کر لیتے؟(لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰہُ اُجَاجًا فَلَوۡلَا تَشۡکُرُوۡنَ۵ 56/71) اور آگے بڑھیے، اور اس آگ پر غور کیجئے جس پر کھانے پینے کی اشیاء اور زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اس میں حرارت تمہاری پیدا کردہ ہے یا ہماری؟ (اَفَرَءَیۡتُمُ النَّارَ الَّتِیۡ تُوۡرُوۡنَ۵ 56/70) کیا یہ درخت تمہاری ہنر مندی سے پیدا ہوئے ہیں جن سے آگ روشن کی جاتی ہے؟ یا (ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَہَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ۵ 56/72) ذرا سوچو کہ اس سارے کاروبار میں تمہاری ہنر مندی اور کاری گری کا کتنا دخل ہے اور ہمارے کائناتی قانون ربوبیت کا کس قدر حصہ ہے؟

سوچو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد ساز گار؟ خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نور آفتاب؟

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب

موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

یہ سب کچھ ہمارے قانون کا کیا ہوا ہے۔ اس میں تمہاری صرف محنت تھی۔ باقی سب کچھ ہمارا تھا۔ اب بات یوں ہوئی کہ ایک مشترکہ کاروبار تھا۔ جس میں محنت تمہاری تھی اور ہمارا سرمایہ (Capital) اس کاروبار کے منافع (پیداوار) کو اسی نسبت سے بانٹ لینا چاہیے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ لے لو اور ہمیں ہمارے سرمایہ کا حصہ دے دو۔ ہم نے اپنا حصہ، انسانیت کی ربوبیت عامہ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے ان تک پہنچا دو۔ (نَحۡنُ جَعَلۡنٰہَا تَذۡکِرَۃً وَّ مَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِیۡنَ۵ 56/73) ہم نے اسے بھوکوں کے لیے وقف کر رکھا ہے، اور اس طرح خدا کی ربوبیت عامہ (عظیم ربوبیت) کے قیام و استحکام میں سرگرم عمل رہو۔ (فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ 56/74) اسی

طرح سورہ عبس میں ہے کہ انسان ذرا اپنی خوراک پر غور کرے۔ جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اور سوچے کہ اس میں کس قدر حصہ اس کی کاریگری کا ہے اور کتنا حصہ ہمارا ہے۔ (فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ 24/80) ہمارا قانون ربوبیت بارش برساتا ہے۔ پھر اسی قانون کے مطابق زمین پھٹتی ہے اور اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے۔ پھر اس سے بالیں بنتی ہیں۔ اور ان میں دانے پڑتے ہیں۔ پھر اس طرح انگور اور ترکاریاں، زیتون اور کھجور اور طرح طرح کے پھلوں کے گھنے باغات اور چارہ پیدا ہوتا ہے۔ (80/25-31) یہ پھل اور چارہ کس مقصد کے لیے ہے۔ تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی پرورش کے لئے (مَتَاعًا لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ 32/80)

سورئہ ق میں ہے کہ ہم نے زمین کو اس طرح پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ پیدا کر دیئے۔ اور اس نظام زراعت و آب رسانی کے ذریعے طرح طرح کی خوشنما چیزیں اگا دیں۔ اس نظام میں ہر شخص کے لئے جو اپنی توجہات کو اس طرف منعطف کرے گا، سامان بصیرت و تذکیر ہے (50/7-9) پھر ہم نے بادلوں سے مینہ برسایا۔ جس سے بڑے بڑے باغات اگائے اور کھیتی بھی۔ نیز کھجوروں کے تہ بہ تہ خوشے۔ یہ سب کچھ انسانوں کی پرورش کے لئے ہے۔ (رِزۡقًا لِّلۡعِبَادِ 10/50)

ان حقائق کو سامنے لانے کے بعد قرآن ایک سوال کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بتائو کہ یہ تمام وسائل معیشت کس کے پیدا کردہ ہیں؟ (اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ يَرۡزُقُكُمۡ 67/21) اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بتائو کہ اگر وہ اس رزق کو روک لے تو تمہاری ہنر مندی کیا کرے؟ (اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ 67/21) اگر وہ (مثلاً پانی کو نیچے لے جائے اور سطح زمین سے اوپر نہ آنے دے تو تم کیا کرلوگے 67/30) وہ کہتا ہے کہ سوچو کہ یہ بات کس قدر صاف اور واضح ہے ۔ ہم نے زمین کو پھیلا دیا۔ ہم نے بادلوں کو بلند کیا اور ان سے پانی برسایا۔ ہم نے اس میں سے پھل اور غذا کی دوسری چیزیں پیدا کیں (2/22) یہ سب کچھ تو ہم نے کیا لیکن تم ہو کہ بجائے اس کے کہ اس متاع (سامان معیشت) کو ہمارے قانون ربوبیت کے مطابق استعمال میں لائو۔ اس قانون کی بجائے اپنے ہی قاعدے اور قانون بنالیتے ہو اور رزق کی تقسیم ان کے مطابق کرنے لگ جاتے ہو؟

(فَلَاتَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۵ 2/22) اس تمام کاروبار میں تمہارا حصہ محنت کا ہے وہ تم لے لو، اور باقی حصہ ہمارے سرمائے کا ہے وہ ہمیں دے دو۔ (وَاٰتُوۡا حَقَّہٗ یَوۡمَ حَصَادِہٖ 6/141) سورئہ حجر میں ہے کہ اس پیداوار میں صرف تمہارے لئے ہی سامان معیشت نہیں بلکہ ان کے لئے بھی ہے جن کے متعلق تم (بزعم خویش اپنے معاشی نظام کے ماتحت) سمجھتے ہو کہ ان کا اس میں کچھ حق نہیں۔ (وَجَعَلۡنَا لَکُمۡ فِیۡھَا مَعَایِشَ وَمَنۡ لَّسۡتُمۡ لَہٗ بِرٰزِقِیۡنَ ۵ 15/20) ہم نے اس سامان معیشت کو تمام نوع انسانی (بلکہ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق) کے لئے وجہء ربوبیت بنایا ہے۔ (وَالۡاَرۡضَ وَضَعَھَا لِلۡاَنَامِ ۵ 55/10) اور اس کے ساتھ ہی میزان (خدا کا وہ ضابطہء قوانین جس کی روسے رزق کی صحیح صحیح تقسیم ہوتی ہے اور معاشرہ کا توازن قائم رہتا ہے) بھی بھیجا ہے۔ اس لئے میزان کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور کسی کے حصے میں کمی بیشی نہ کرو۔ (وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ۵ 55/9)

ان تمام تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ وسائل پیداوار خدا کی بخشائش ہیں۔ جن کا مقصد تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔ اس لئے کسی کو حق نہیں کہ ان کی حدبندی کر کے انہیں اپنی ملکیت میں لے لے۔ (وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحۡظُوۡرًا ۵ 17/20) اور جو کچھ تیرے رب کی طرف سے بطور بخشش عطا ہوا ہے۔ اس کی حدبندی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے گرد حصار نہیں کھینچا جاسکتا۔

زمین کی انفرادی ملکیت۔ یہ ظاہر ہے کہ ان معاشی وسائل میں جو خدا کی طرف سے بطور بخشش (تمام نوع انسانی کو مفت) عطا ہوئے ہیں زمین کی حیثیت بنیادی ہے۔ اس لئے زمین کے متعلق اور بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے عام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ سورئہ حم السجدہ میں ہے۔

قُلۡ اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ بِالَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَتَجۡعَلُوۡنَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا ؕ ذٰلِکَ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۵ 41/9

"ان سے کہہ دو کہ کیا تم اس خدا کے قانون ربوبیت سے انکار کرنا چاہتے ہو۔ جس نے زمین کو دو مدارج میں پیداوار کے قابل بنایا۔ اس لئے کہ وہ تمام کائنات کا ربوبیت کرنے والا ہے۔ لیکن تم اوروں کو بھی خدا کا ہمسر بنا دیتے ہو۔" اس کے بعد ہے

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۞ (40/41)

"اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ (تاکہ آب رسانی کا سلسلہ ٹھیک ٹھیک کام کرے) اور زمین میں فراوانی رزق کی استعداد پیدا کر دی۔ اور چار موسموں میں اس کی پیداوار کے اندازے مقرر کر دیئے۔ اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔

یہ بنیادی ذریعہ پیداوار (زمین) خدا کی طرف سے بلا قیمت عطا ہے۔ تاکہ اس سے تمام نوع انسانی کی پرورش ہو سکے۔ زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر اسے ذاتی ملکیت قرار دے لینا، خدا کے خلاف سرکشی اور اس کے قانون ربوبیت سے بغاوت ہے۔ جو کچھ خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر ملا ہے۔ قرآن کی رو سے ان پر انفرادی ملکیت کا تصور ہی باطل ہے۔ ہوا، پانی، روشنی، حرارت، زمین، سب انسانی زندگی اور اس کی پرورش کے اسباب و ذرائع ہیں جو خدا کی صفت ربوبیت کی وجہ سے مفت عطا ہوئے ہیں۔ انہیں انسانوں کی پرورش کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔" (نظام ربوبیت 120-126)

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"وسائل پیداوار۔ سو ان کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ سب "نِعْمَةٌ مِّنَ اللّٰہِ" ہیں۔ اس لئے ان پر کسی کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ تم اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا کیوں نہیں رکھتے۔ (وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ 10/57) کیونکہ ارض و سما کی ملکیت خدا ہی کی ہے تمہاری نہیں۔ (وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ 10/57)" (نظام ربوبیت 128)

اور آخر میں لکھتے ہیں۔

"لیکن اس تمام بحث کے باوجود ایک بنیادی نکتہ کو بھی سامنے رکھئے۔ مومن وہ ہے جو بطیبخاطر اسے اپنے دل کی کامل رضامندی سے، اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی استعداد کے مطابق پوری پوری محنت کرے اور اس کے ماحصل (اپنی کمائی) میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے کے باقی نوع انسان کی نشو ونما کے لئے عام کر دے۔ حتی کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے۔ اس "ایمان" کے بعد اگر (بفرض محال) اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جو کچھ ایک شخص کماتا ہے۔ وہ سب کا سب اس کی ذاتی ملکیت قرار پائیگا۔ تو جہاں تک ایک مومن کا تعلق ہے اس سے اصل مسئلہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب کچھ اس کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنی ذاتی ملکیت کو اپنے دل کی پوری رضامندی سے نوع انسانی کی نشو ونما کے لئے اپنے معاشرہ (نظام مملکت) کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسلام کا معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو اس قسم کا ایمان رکھتے ہیں۔ لہذا، جماعت مومنین کے ضمن میں یہ سوال کچھ اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک فرد کی محنت کا ماحصل اسکی ذاتی ملکیت ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ ذاتی ملکیت ہو یا نہ ہو۔ انکے نزدیک وہ ان لوگوں کا حق ہوتا ہے۔ جن کی ضروریات انکی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں۔ یہ اس مشکل ترین مسئلہ کا آسان ترین حل ہے۔

(نظام ربوبیت 134)

"کہیں انہیں محتاجوں اور غریبوں کو خفیہ اور علانیہ خیرات دینے کی تلقین کی جاتی ہے (2/271) اور کہیں حکم دیا جاتا ہے کہ دولت کو گردش دیتے رہو لیکن اس انداز سے کہ وہ اوپر ہی اوپر کے طبقہ میں نہ پھرتی رہے۔ (کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ 7/59) کہیں انہیں دولت جمع کرنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے ڈرایا جاتا ہے۔ (9/24) اور کہیں سود خواری کے نتائج سے متنبہ کیا جاتا ہے۔ (2/275) حقیقت یہ ہے کہ اگر

بنظر تعمق دیکھا جائے تو ان ہی تدریجی احکامات سے اس جماعت میں ایسی کیفیت پیدا کر دی جاتی ہے کہ اس میں ذاتی املاک اور جائیداد کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً دیکھئے

ا۔ زمین کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے لئے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ (سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ) یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے گی۔ لہذا زمین خرید خرید کر زمینداریاں اور جاگیرداریاں پیدا کرنے کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔

۲۔ جب زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی تو ظاہر ہے کہ کرائے پر دینے کے لئے مکانات بنانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ جب زمین ہی نہ ہوگی تو مکان کہاں بنایا جائے گا۔ مکان اپنی رہائش کے لئے درکار ہوگا۔ سو اس کی ذمہ داری خود معاشرہ نے لے رکھی ہے۔ نہ ہی زمین کو بٹائی پر دینے کا سوال پیدا ہوگا۔

۳۔ روپیہ جمع نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ نہ ہی اسے کسی خاص حلقے میں گردش دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ اپنی ضروریات کے لئے نہ ہی اسراف کیا جاسکتا ہے نہ تبذیر۔ یعنی نہ زائد از ضرورت خرچ کیا جاسکتا ہے نہ بلا ضرورت۔

۵۔ کسی کو روپیہ قرض دے کر اس پر سود نہیں لیا جاسکتا۔

اب فرمایئے کہ اگر کسی کے پاس زائد از ضرورت روپیہ ہو تو، ان احکام کی موجودگی میں وہ اس روپے کو کریگا کیا؟ یہ روپیہ تو اس کے لئے وبال جان بن جائے گا۔ کیونکہ (قرآنی احکام کی رو سے) اس روپے کے رکھنے (یا خرچ کرنے) کی کوئی جگہ ہی نہیں ہوگی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس روپے سے کارخانے لگائے جائیں۔ تجارت کی جائے۔ بہت اچھا! لیکن اس تجارت اور ان کارخانوں سے جو روپیہ آئے اسے کیا کیا جائے؟ بات پھر وہیں آجائے گی۔" (نظام ربوبیت 155)

" قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اقوام عالم کا پرورش کرنے والا ہے۔(رب العلمین) زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔(11/6) یا یہ کہ تم لوگ اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کر دیا کرو۔(نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ 17/31) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ اور تمہاری اولاد کے بھی۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان سب کے رزق کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے تو ان میں سے کسی کو بھی بھوکا نہیں رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں کروڑوں انسان بھوکے مرتے ہیں۔ ایک ایک قحط میں لاکھوں جانیں روٹی نہ ملنے کی وجہ سے تلف ہو جاتی ہیں۔ کتنے بچے ہیں جو محض غذا نہ ملنے (یا کم ملنے) کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس سے انسان (معاذاللہ) اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ خدا کی ذمہ داری اچھی ہے۔ جو اس قدر مخلوق بھوکوں مر جاتی ہے۔ لیکن ان آیات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ ان ذمہ داریوں کو براہ راست پورا کرتا ہے۔ یہ پوری ہوتی ہیں معاشرہ کے ہاتھوں۔ اگر معاشرہ، ضابطہء خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے تو اللہ کی یہ تمام ذمہ داریاں پوری ہوتی جاتی ہیں۔ اور اس طرح انسان دیکھ لیتا ہے کہ وہ کس طرح رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ ہر شے کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ لیکن اگر معاشرہ غیر خداوندی خطوط پر متشکل ہو تو اس کا(6/165) نتیجہ ربوبیت عامہ نہیں ہوتا۔"

(نظام ربوبیت 159)

خارجی کائنات میں خدا کی ربوبیت خدا کے قانون کائنات کی رو سے از خود کار فرما ہوتی جاتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں یہ ربوبیت انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہو سکتی ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام سے قائم ہوتا ہے۔ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لیتا ہے جو خدا کی طرف منسوب ہیں۔ اور اس کے بدلے میں افراد معاشرہ وہ تمام فرائض و واجبات پورے کرتے رہتے ہیں جن کا عہد انہوں نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے۔ افراد معاشرہ اس نظام کی اطاعت کے اس وقت تک مکلف ہوتے ہیں۔ جب تک یہ نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي

الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا(6/11)،زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔ یہ ذمہ داری اس معاشرہ کے سر ہو گی جو خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہو گا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تمہاری پرورش کا سامان اس طرح کر دیا جائے۔ تو پھر تم رزق سمیٹ کر جمع کیوں کرو، تم اسی لئے جمع رکھنا چاہتے تھے کہ کل کو وقت پڑنے پر وہ تمہارے اور تمہاری اولاد کے کام آئے۔ لیکن جب تمہاری اور تمہاری اولاد کی پرورش کی تمام ذمہ داریاں معاشرہ اپنے سر لے لے تو تمہیں جمع کرنے کی کیا ضرورت رہے گی؟ (نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ 31/17)ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ تم اس لئے جمع کرنا چاہتے تھے کہ جب تم بوڑھے ہو جائو اور تم میں کمانے کی استطاعت نہ رہے اور تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو اس وقت تمہاری اور ان کی پرورش کا کیا انتظام ہو گا۔(2/266)لیکن اس نظام ربوبیت میں اس قسم کا خیال بھی دل میں نہیں آنا چاہیے۔اس میں ہر ایک کی پرورش کا انتظام موجود ہوتا ہے۔" (نظام ربوبیت 159-160)

"اس کے برعکس، دوسرا معاشرہ ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ کی اپنی اور اس کی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری معاشرہ اپنے ذمے لے لیتا ہے۔اس میں کسی شخص کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی عدم اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ کام کرتا ہے۔اور چین کی نیند سوتا ہے۔اسے نہ جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے نہ چوری کرنے کی حاجت،نہ فریب دینے کی ضرورت ہے نہ بد دیانتی کرنے کی مجبوری۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو اس نئی جماعت کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔اس میں نہ تو کسی کو مستقبل کی فکر ستاتی ہے اور نہ ہی یہ خدشہ ہوتا ہے کہ میری محنت کا ماحصل، اس طبقہ کی عیش پرستیوں کی نذر ہو جائے گا۔ جس کے ہاتھ میں معاشرہ کا نظم و نسق ہے۔ نظام ربوبیت میں اس قسم کا کوئی طبقہ ہی نہیں ہوتا۔ ارباب نظم و نسق بھی اسی قانون اور فیصلے کے پابند ہوتے ہیں۔ جس پر دوسرے افراد معاشرہ گامزن ہوتے ہیں۔اس میں ارباب حل و عقد کو عملاً بتانا ہوتا ہے کہ (مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ۵ 51/57) ہم افرادِ معاشرہ کے ذمے کچھ کام ہیں۔اسی طرح ہمارے ذمے بھی کچھ کام ہیں۔ اور جس طرح دیگر افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے۔ اسی طرح ہماری

ضروریات کا پورا کرنا بھی معاشرے کے ذمے ہے۔ ہم میں اور دیگر افراد معاشرہ میں کوئی فرق نہیں۔ ہم اپنے لئے کوئی خاص معاوضہ نہیں چاہتے۔ ہمارا معاوضہ بھی اسی طرح خدا کے ذمے ہے۔ جس طرح دوسرے افراد کا (فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ 10/72) ہم بھی دیگر افراد معاشرہ کے ساتھ اس نظام ربوبیت کے اجزا ہیں۔ (وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ 10/72)" (نظام ربوبیت 161)

"تجارت میں نفع۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ جب نظام ربوبیت میں تمام ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر پر ہوگی۔ اور اس طرح نہ کسی کو روپیہ اپنے پاس رکھنے کی ضرورت ہوگی نہ جائیداد کی ذاتی ملکیت کی حاجت، تو اس وقت تجارت میں نفع لینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ نفع تو ایک طرف، اس وقت تجارت کا موجودہ نظریہ ہی بدل جائے گا۔ اس وقت چیزیں تیار کرنے والے انہیں تیار کرتے جائیں گے۔ اور جنھیں ان کے استعمال کی ضرورت ہے وہ ان تک پہنچا دی جائیں گی۔ چیزیں بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں دونوں کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوگی۔ ہمارا موجودہ معاشرہ اپنی پیدا کردہ مصیبتوں سے تنگ آکر زیادہ سے زیادہ یہ سوچتا ہے کہ نقدی کے مبادلے کی بجائے، اجناس کا مبادلہ (Barter System) بہتر ہو سکتا ہے۔ اس باب میں کہا یہ جاتا ہے کہ

"مبادلے کے عدل کے یہ معنی ہیں کہ جن چیزوں کا تبادلہ کیا جائے۔ ان کی قیمتیں برابر ہوں۔"

لیکن اس کے بعد دقت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ چیزوں کی قیمتوں کو کیسے متعین کیا جائے۔ مثلاً موچی نے جوتا تیار کیا۔ وہ اسے گیہوں کے عوض فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ کیسے متعین کیا جائے کہ کس قدر گیہوں کی قیمت جوتے کی قیمت کے برابر ہے؟ لیکن جس معاشرہ میں موچی اور کسان دونوں کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو، اس میں "قیمت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ وہاں سوال ہوگا ضرورت کا۔ اس لئے قرآنی نظام ربوبیت میں "تجارت" کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اس میں تجارت سے دراصل مراد ہوگا۔ اشیائے ضروریہ کی مناسب

تقسیم کا انتظام۔ اس نظام کے کارندوں کی ضروریات زندگی معاشرہ (نظام مملکت) کی طرف سے مہیا ہوتی رہیں گی۔ اسی کو ان کا "منافع" کہہ لیجئے۔

اسی طرح اس نظام میں کام کرنے والوں (موجودہ اصطلاح میں محنت کشوں، مزدوروں) کی اجرتیں مقرر کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہو گا۔ وہ اپنی استعداد کے مطابق وہ کام کریں گے۔ جو انہیں تفویض کیا جائے گا۔ اور معاشرہ انکی ضروریات پوری کرتا جائے گا۔ یہی ان کی محنت کا معاوضہ ہو گا۔" (نظام ربوبیت 162-163)

"حضورؐ کے دور میں۔ میں نے جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا ہے (اور جو کچھ اس کے بعد آئے گا) اس میں آپ نے ایک چیز کو نمایاں طور پر محسوس کیا ہو گا۔ اور وہ یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی سند میں صرف قرآن کی آیات پیش کی ہیں۔ تاریخ اور روایات سے کچھ نہیں لکھا۔ (حتیٰ کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نبی اکرمؐ نے جس نظام ربوبیت کو متشکل فرمایا اس کے تفصیلی خط و خال کیا تھے اور وہ کب تک علی حالہ قائم رہا) اس کی یہ وجہ نہیں کہ تاریخ و روایات میں قرآنی نظام ربوبیت کی تائید میں کچھ نہیں ملتا۔ تفحص و تجسس سے ان میں، اس کی تائید میں شہادات مل سکتی ہیں۔ لیکن ان تاریخی روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں جہاں کسی مسئلہ کی تائید میں کچھ ملتا ہے وہاں اس کی تردید میں بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔" (نظام ربوبیت 189)

"ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا ہے۔ وہ قرآن کی رو سے صحیح ہے تو اس کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ نبی اکرمؐ نے اسی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل فرمائی ہو گی۔" (نظام ربوبیت 190)

"ہم نے دیکھا کہ قرآن کی رو سے

۱۔ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔(اس کی عملی شکل کیا ہوگی۔اس کا فیصلہ وہ نظام کرے گا۔)

۲۔ عفو، یعنی ضرورت سے زائد، فردِ متعلقہ کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رہنا چاہیے۔(یہ الگ بات ہے کہ اسلامی نظام ان زوائد کو فرد کی تحویل میں رہنے دے اور صرف عندالضرورت انہیں طلب کرے یا سابقہ کے ساتھ ہی اپنی تحویل میں لیتا جائے۔)

۳۔ "ذاتی ملکیت" اگر ہو سکتی ہے تو روزمرہ کی عام مستعملہ اشیا میں ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی فرد کو اس کی ضرورت ہی نہ ہوگی کہ وہ ان اشیا کو فروخت کرے۔اس لئے "ملکیت" عملاً استعمال تک محدود رہ جائے گی۔یہی اشیاء بطور ترکہ آگے منتقل ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ، اس کی اولاد اس ترکہ کی بھی محتاج نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کی تمام ضروریات معاشرہ خود پوری کر رہا ہوگا۔" (نظام ربوبیت 195)

"قرآن کا منتہی۔اس قسم کے معاشرے کی تشکیل جس میں۔

۱۔ تمام افراد کی ضروریات زندگی کا کفیل خود معاشرہ ہو۔

۲۔ کسی فرد کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔اور اس طرح

۳۔ عقل کے تقاضوں کی تسکین کے بعد، انسان پورے جذب و انہماک سے نوع انسانی کی بہبود کلی میں مصروف ہو جائے اور اس سے اس کی ذات کی تربیت و استحکام ہوتا جائے۔"

(نظام ربوبیت 223)

یہ تھا پرویز صاحب کے نزدیک قرآن کریم کا بیان کردہ معاشی نظام۔ اب ہم قرآن کریم کی روشنی میں ہی اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ رزق کی ذمہ داری نظام مملکت پر۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ تمام ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری قرآنی حکومت کے سر ہے۔ اور جو چیزیں اللہ نے قرآن میں خاص اپنے لیے وقف کی ہیں ان کو قرآنی معاشرہ پورا کرتا ہے اور ان مقامات پر اللہ یا رسول کا مطلب "نظام مملکت" ہے۔ اس سلسلہ میں وہ دو آیات قرآنیہ کا حوالہ بھی دیتے ہیں 11/6 اور 151/6۔ مگر یہ پرویز صاحب کا انداز ہے کہ وہ پوری آیت درج نہیں کرتے اور آیات کے ٹکڑوں کو بنیاد بنا کر ان پر بہت بڑے فلسفہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ہم ان آیات کو پورا درج کرتے ہیں۔

☆ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ج وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۵ (151/6)

"آپ کہہ دیجئے آئو میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سنائوں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرما دیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالی کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھیرائو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں۔ اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جائو۔ خواہ وہ اعلانیہ ہوں اور خواہ پوشیدہ اور جس کا خون کرنا اللہ تعالی نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو۔ ہاں مگر حق کے ساتھ، اس کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تا کہ تم سمجھو۔"

☆ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ط اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۵ (31/17)

"اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالو! ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ یقیناً ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔"

یہ تھے وہ احکام جن میں سے ایک ٹکڑا لے کر پرویز صاحب نے یہ نظریہ قائم کیا کہ رزق کی ذمہ داری نظام مملکت کے ذمہ ہے۔ حالانکہ اس ٹکڑے میں ''نَحْنُ'' کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس وقت کی بات ہے جب نبی کریمؐ اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ اس وقت لوگوں کو منع کیا جارہا ہے کہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل مت کرو۔ اگر کسی ''نظام مملکت'' کی بات ہوتی تو پھر تو ہر فرد کو یقین ہوتا کہ ''نظام مملکت'' کی ذمہ داری رزق مہیا کرنا ہے تو وہ قتل ہی کیوں کرتا؟ مگر پرویز صاحب کے بقول وہ نظام تو اپنی مکمل شکل میں حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جاکر مکمل ہوا۔

☆وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ (6/11)

''زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ وہی ان کے رہنے سہنے اور ان کے سونپے جانے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔ سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔''

صرف ایک ٹکڑے کی بنیاد پر یہ کہنا کہ رزق کی ذمہ داری نظام مملکت کی ہے درست تصور نہیں۔ کیونکہ بعد والا ٹکڑا یہ بتارہاہے کہ اللہ ہی جانتا ہے ہر چیز کے مستقر اور مستودع کو۔ اگر نظام مملکت تمام ذی حیات کے رزق کا ذمہ دار ہے تو کیا نظام مملکت ہر چیز کے مستقر اور مستودع کو بھی جانتا ہے؟ یہ ناممکن ہے۔

ذی حیات تو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں پھیلا رکھی ہے۔ ایسے مقامات جہاں انسان کی پہنچ ہی نہیں ہے۔ جیسے سمندر کی گہرائیاں، فضا کی بلندیاں، پہاڑوں کے اوپر اور ان کے اندر بسنے والی مخلوق، دور دراز گھنے جنگلات، صحرا، دشت اور انٹارکٹیکا جیسے جمے ہوئے بر اعظم اور ان سب مقامات پر بسنے والی مخلوق کا رازق تو اللہ ہی ہو سکتا ہے یہ نظام مملکت کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور یہ تو اللہ کی ایسی صفت ہے جس میں اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا ہی نہیں جاسکتا۔ کیونکہ بات صرف انسانوں کی نہیں۔ ''وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ'' کی ہو رہی ہے۔

نیز نظام مملکت کے خدو خال، اس کی ہیئت اور بنیادی ڈھانچہ کے بارے میں قرآن کریم نے کوئی واضح ہدایات نہیں دیں۔ اس نے تو صرف اتنا کہا کہ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ اب اگر اتنا اہم معاملہ ہے تو اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کہہ دیتے کہ زمین پر رزق کا ذمہ دار قرآنی معاشرہ ہی ہوگا۔ بلکہ آگے آنے والے حصہ میں یہ واضح طور پر بتایا جائے گا کہ کس طرح رزق کی تقسیم اللہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے۔ اور کسی کو کم کسی کو زیادہ دے دیا ہے تاکہ ان کو آزمائے۔

زمین کی انفرادی ملکیت۔ اس کے بعد پرویز صاحب کہتے ہیں کہ زمین کی انفرادی ملکیت نہیں رکھی جاسکتی۔ آیئے اس بارے میں کچھ آیات قرآنیہ دیکھتے ہیں۔

☆اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۵ 2/107

”کیا تجھے علم نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں۔“

☆لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط 2/284

”آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔“

☆وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۵ 3/109

”اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تمام کام لوٹائے جاتے ہیں۔“

☆وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۵ 3/180

”آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔“

ان تمام آیات میں کہا گیا ہے کہ زمین اور آسمان اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اور اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ نے ہی ان کو اور جو کچھ ان کے اندر ہے ان کو پیدا کیا ہے۔ اب مزید دیکھیئے۔

☆قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْاج اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ قف لا یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآئُ مِنْ عِبَادِہٖط وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۵

128/7

"اور موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو۔ بے شک زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا مالک بنادے۔ اور اخیر کامیابی تو پرہیز گاروں کے لیے ہے۔"

☆وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ م بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۵21 /105

"ہم نے پند و نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہونگے۔"

لیجئے قرآن نے تو واضح طور پر کہہ دیا کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں ہے۔ صرف اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کہہ کر تو اس بات کی دلیل نہیں دی جاسکتی۔ پھر پورے قرآن کریم میں کہیں بھی اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ زمین اور دیگر ملکیتی چیزیں مملکت کی تحویل میں دے دی جائیں۔ یہ تو ایک فطری عمل ہے ہر فرد زندگی میں کبھی غریب ہوتا ہے اور کبھی امیر۔ بعض صدا امیر رہتے ہیں بعض غریب۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ لوگوں کے حالات بدلتا رہتا ہے۔ تاکہ اللہ آزمائے کہ کون اس کا شکر گزار بندہ بنتا ہے۔

ہاں جن لوگوں نے انگریزوں سے وفاداری کے عوض بڑی بڑی جاگیریں لی ہیں یا وہ جو لمبی مدت کے لیے بڑی جاگیریں حکومت سے لیز پر حاصل کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں حکومت قانون سازی کر کے ان کے لیے

زمین کی حدود متعین کر سکتی ہے۔ مگر ان کو زمین کے انفرادی ملکیت کے حق سے محروم کرنا یکسر غیر قرآنی فعل ہو گا۔

☆وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ ۵ لا فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَكۡمَامِ ۵ وَالۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ وَالرَّيۡحَانُ ۵ ج فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۵ (55/10-13)

”اور اسی نے مخلوق کے لیے زمین بچھادی۔ جس میں میوے ہیں اور خوشے والی کھجور کے درخت ہیں اور بھس والا اناج ہے۔ اور خوشبودار پھول ہیں۔ پس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمت کا انکار کرو گے۔“

یہاں اللہ تعالی نے مخلوق پر اپنی قدرت اور اپنے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تم کس طرح سے ان انعامات کا انکار کر سکتے ہو۔ مگر اس میں بھی پرویز صاحب نے پہلی آیت لے کر یہ تعین کر لیا کہ زمین کی انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

اب ایک اہم نکتہ آتا ہے۔ جس کے بارے میں پرویز صاحب نے بڑی تفصیل سے وہ واقعات بیان کئے ہیں۔ جو عہد فاروقیؓ کی فتوحات کے بعد بڑی تعداد میں زمینوں کا اسلامی خلافت کے زیر قبضہ آجاناہے۔ اور ان کی تقسیم کا معاملہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس سارے قصے کا انجام پرویز صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں آیت کا ایک ٹکڑا پیش کر کے کیا ہے۔ ”وَالَّذِيۡنَ جَآءُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ 59/10“ اور اس طرح اس دلیل کی بنیاد پر یہ فیصلہ ہو گیا کہ زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں گی تاکہ بعد میں آنے والے لوگوں کا بھی حق محفوظ رہ سکے۔ (واضح رہے کہ جو گفتگو پرویز صاحب نے پیش کی ہے۔ خلاف معمول اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔)

اس بارے میں پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ ”جس انقلاب کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی وہ عہد فاروقیؓ میں کئی منزلیں آگے بڑھ کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ جہاں اراضیات کو مملکت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔“ حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ اس وقت عمر فاروقؓ نے مکہ، مدینہ، طائف، اور دیگر علاقوں کی زمینیں سرکاری تحویل میں نہیں لی

تھیں۔ اور ان کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ زمین کی انفرادی ملکیت از روئے اسلامی معاشی نظام غلط ہے۔ اور اصل معاملہ سوادِ عراق کی زمینوں کے بارے میں تھا جس پر لوگوں نے کہا کہ یہ زمینیں بھی ان میں تقسیم کر دی جائیں۔ مگر عمر فاروقؓ تیار نہ ہوئے۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر اور مملکت کے دیگر اخراجات کے لیے ضروری ہے کہ یہ زمینیں انفرادی ملکیت میں نہ دی جائیں۔ آیئے اس سلسلے میں کچھ اقتباسات ملاحظہ کرتے ہیں

ا۔ جریر بن عبد اللہ، بجیلہ کے ساتھ السّراۃ سے آئے۔ اور درخواست کی کہ میں العراق جانے کو تیار ہوں۔ مجھے اور میری قوم کو فتوح کا چوتھائی دیا جائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ شرط قبول کر لی۔ (بحوالہ فتوح البلدان از علامہ بلاذری صفحہ 365)

۲۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جریر بن عبد اللہ کو ابو عبید کے شہید ہونے کے بعد، جنہیں پہلے بھیجا تھا۔ الکوفہ بھیجا اور ان سے پوچھا کیا تم العراق جانا پسند کرو گے ؟ اگر تمہیں خمس نکالنے کے بعد تیسرا حصہ دیا جائے۔ کہا ! ہاں۔ (بحوالہ فتوح البلدان از علامہ بلاذری صفحہ 365)

۳۔ جب حضرت عمر فاروقؓ نے السواد فتح کر لیا تو لوگوں نے کہا اس کو ہمارے درمیان تقسیم کرو۔ کیونکہ ہم نے بزور فتح کیا ہے۔ انہوں نے تقسیم کرنے سے انکار کیا۔ اور کہا۔ پھر ان مسلمانوں کے لیے کیا رہے گا جو تمہارے بعد آئیں گے ؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں اس کو تقسیم کر دوں تو پھر تم آپس میں پانی پر بھی فساد کرو گے ؟

راوی نے کہا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اہل سواد کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھا۔ ان کے سروں پر جزیہ اور ان کی زمینوں پر خراج مقرر کیا۔ اور اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہیں کیا۔

(بحوالہ فتوح البلدان از علامہ بلاذری صفحہ 385)

۴۔ حضرت عمر فاروقؓ نے السواد کا علاقہ ان لوگوں کے لیے محفوظ رکھا جو مردوں کی صلب اور عورتوں کے رحم میں ہیں۔ اور اہل سواد کو بھی ذمی قرار دیا۔ ان سے جزیہ لیا جاتا ہے۔ اور ان کی زمینوں پر خراج ہے۔ وہ ذمی ہیں۔ ان کے لیے بند غلامی نہیں ہے۔ سلیمان نے کہا۔ ولید بن عبد الملک نے اہل سواد کو، فے قرار دینا چاہا تھا۔ لیکن میں نے اس کو حضرت عمر فاروقؓ کے طرز عمل کی خبر دی۔ جو انھوں نے اس باب میں اختیار کیا تھا۔ اور اللہ نے اس کو ان کے ساتھ ایسا کرنے سے باز رکھا۔

مجھ سے حسین بن الاسود نے بیان کیا انھوں نے کہا ہم سے یحیٰی بن آدم نے بیان کیا ان سے اسرائیل نے ان سے ابو اسحق نے، اور ان سے حارثہ بن مضرّب نے کہ:- حضرت عمر فاروقؓ نے مسلمانوں کے درمیان السواد تقسیم کرنے کا ارادہ کیا، اور حکم دیا کہ اس کی مردم شماری کی جائے۔

مردم شماری کی گئی۔ معلوم ہوا کہ ایک ایک مسلمان کے حصے میں تین تین کسان پڑتے ہیں۔ پھر انہوں نے اصحاب رسولؐ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا انہیں آزاد چھوڑ دو کہ وہ مسلمانوں کے لیے آمدنی کا مستقل ذریعہ رہیں۔ حضرت عمرؓ نے عثمان بن حُنیف الانصاری کو بھیجا۔ اور انہوں نے اہل العراق پر اڑتالیس یا چوبیس یا بارہ (درہم) فی کس کے حساب سے خراج مقرر کر دیا۔

ہم سے ابو نصر التمار نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا ہم سے شریک نے بیان کیا۔ ان سے اصلح نے ان سے حبیب بن ابی ثابت نے، ان سے ثعلبہ بن یزید نے اور ان سے حضرت علیؓ نے کہ اگر تم ایک دوسرے کا منہ پیٹنے والے (یعنی آپس میں لڑنے والے) نہ ہوتے تو میں السواد تم میں تقسیم کر دیتا۔ (بحوالہ فتوح البلدان از علامہ بلاذری صفحہ 382-383)

اور اس طرح سوادِ عراق کا علاقہ مفتوحہ لوگوں کے قبضہ میں ہی رکھا گیا اور ان زمینوں کی آمدنی سے ان سے جزیہ وصول کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی عمر فارقؓ نے کہا کہ اگر ان کو اپنے پیچھے لوگوں کے لڑنے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ یہ

زمینیں بھی لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ عمر فاروقؓ مختلف لوگوں کو ترغیب دیتے رہے ہیں کہ فلاں علاقے پر حملہ کریں اور زمین کا ربع یا ثلث ان کی ملکیت میں دے دیا جائے گا۔ اس طرح مختلف علاقے لوگوں نے فتح کئے۔ اور اپنے حصے کی زمینیں وصول کیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے ذہن میں ہر گز یہ نہیں تھا کہ زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں ہے۔ یا یہ کہ زمینوں کو سرکاری تحویل میں لے لینا ہے۔ اور مزیداری کی بات یہ کہ اس وقت پہلے سے لوگوں کے پاس جو زمینیں موجود تھیں وہ خلیفہ نے ہر گز ان سے نہیں چھینیں۔ اس بارے میں پرویز صاحب نے کوئی وضاحت نہیں کی۔ آخر مکہ، مدینہ، طائف اور دیگر علاقے اسلامی خلافت کا حصہ تھے۔ اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ان علاقوں کے لوگ زمین کی ذاتی ملکیت کا حق رکھیں اور سوادِ عراق کے لوگ اپنی زمین سرکاری تحویل میں دے دیں؟

اب آتے ہیں آیت کے اس ٹکڑے کی طرف، ہم بتاتے چلیں کہ یہ ٹکڑا مال فے کی تقسیم سے متعلق آیات سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی وہ مال جو بغیر لڑے ہوئے مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ عراق اور شام تو باقاعدہ طور پر مسلمانوں نے جہاد کر کے ہی حاصل کئے تھے۔ اب ہم وہ ساری آیات جو مال فے سے متعلقہ ہیں یہاں درج کرتے ہیں تاکہ جو ٹکڑا پرویز صاحب نے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اس کا مفہوم متعین ہو سکے۔

☆وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۵ مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ لا کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً م بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ط وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ج وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ج وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۵ لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ط اُولٰٓئِکَ

ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ٥ج وَالَّذِیْنَ تَبَوَّئُو الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَایَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْکَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ قف وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْ مبَعْدِ ھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلاًّ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ٥(59/6-10)

”اور جو مال اللہ تعالی نے اپنے رسول کے ہاتھ لگایا ہے۔ جس پر نہ تو تم نے اپنے گھوڑے دوڑائے ہیں اور نہ اونٹ بلکہ اللہ تعالی اپنے رسولؐ کو جس پر چاہے غالب کر دیتا ہے۔ اور اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے۔ بستیوں والوں کا جو مال اللہ تعالی تمہارے لڑے بھڑے بغیر اپنے رسول کے ہاتھ لگائے وہ اللہ کا ہے۔ اور رسولؐ کا اور قرابت والوں کا اور یتیموں مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے۔ تا کہ تمہارے دولت مندوں کے ہاتھ میں ہی یہ مال نہ رہ جائے۔ اور تمہیں جو کچھ رسول دے، لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ۔ اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ تعالی سخت عذاب دینے والا ہے۔ (فے کا مال) ان مہاجر مسکینوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہوں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں۔ اور اللہ تعالی کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی سچے لوگ ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے اپنی طرف سے ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی حاجت نہیں رکھتے۔ بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں گو خود کو کتنی سخت حاجت ہو۔ اور جو بھی اپنے نفس کی حرص سے بچیں وہی کامیاب ہیں۔ اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ایمان داروں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ اور دشمنی نہ ڈال۔ اے ہمارے رب، بے شک تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے۔“

مندرجہ بالا آیات میں مال فے کا مصرف آیت نمبر 8 تک ختم ہو جاتا ہے۔ اور آگے آیت نمبر 9 سے ایک نئی بات شروع ہوتی ہے۔ اور اسی طریقہ سے آیت نمبر 10 میں بھی ایک نئی بات شروع ہو رہی ہے۔ آیت نمبر 9 میں وَالَّذِیۡنَ کا صلہ یُحِبُّوۡنَ ہے اور آیت نمبر 10 میں وَالَّذِیۡنَ کا صلہ یَقُوۡلُوۡنَ ہے۔ مال فے کے حصہ داروں کے لیے (لِ) کا لفظ آرہا ہے۔ لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ اور اس کے بعد ہے لِلۡفُقَرَآءِ الۡمُہٰجِرِیۡنَ۔

اور یہی انداز وراثت کی تقسیم کے حوالے سے ہے۔

☆یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ج فَاِنۡ کُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ فَلَہُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ ج وَاِنۡ کَانَتۡ وَاحِدَۃً فَلَہَا النِّصۡفُ ط وَلِاَبَوَیۡہِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنۡ کَانَ لَہٗ وَلَدٌ ج فَاِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَہٗۤ اَبَوٰہُ فَلِاُمِّہِ الثُّلُثُ ج فَاِنۡ کَانَ لَہٗۤ اِخۡوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ ط اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ ج لَا تَدۡرُوۡنَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ لَکُمۡ نَفۡعًا ط فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۵ (11/4)

اس لیے پرویز صاحب کی یہ دلیل غلط ہے کہ صرف وَالَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ کہہ اس بات کا تعین کر دینا کہ زمین ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتی۔ پوری آیت کو پڑھیں تو آیت کا سیاق وسباق اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ مال فے کا ایک حصہ "وَلِذِی الۡقُرۡبٰی" ہے۔ اب یہ کس کے قرابت دار ہیں۔ ظاہر بات ہے یہ مال لوگوں کو دیا جائے گا تو پھر وہ اسے قرابت والوں کو دیں گے۔ اور ساتھ ہی یہ بات واضح کر دی "تاکہ دولت تم امیروں کے درمیان ہی نہ رہ جائے۔" اور پھر اس کے ساتھ ہی کہہ دیا "اس لیے جو رسول تم کو دے دے وہ لے لو اور جس سے روکے رک جائو۔" اس کے باوجود بھی ذاتی ملکیت کی نفی کرنا غیر منطقی ہے۔

☆وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۵ (8/41)

”جان لو کہ تم جس قسم کی جو کچھ غنیمت حاصل کرو۔ اس میں سے پانچواں حصہ تو اللہ کا ہے۔ اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں اور مسکینوں کا اور راہ چلتے مسافروں کا اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر اس دن اتارا ہے۔ جو دن حق و باطل کی جدائی کا تھا۔ جس دن دو فوجیں بھڑ گئی تھیں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

متذکرہ بالا واضح احکام کی موجودگی میں یہ کہنا کہ ذاتی ملکیت کفر اور شرک ہے۔ بالکل غلط ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد مسلم ریاست کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اور فتح مکہ اور اس کے بعد آنے والی خلافت راشدہ کی فتوحات میں اسلامی ریاست بہت زیادہ رقبہ پر پھیل چکی تھی۔ لیکن اس تمام دور میں ان احکام کو ختم نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی ذاتی ملکیت کی نفی میں کوئی حکم جاری کیا گیا۔ وگرنہ فتح مکہ کے بعد تو لازمی طور پر ایسا حکم دے دیا جاتا۔ اس کے بعد جس طرح کی بحث پرویز صاحب نے خلیفہ ء دوم سیدنا عمرؓ کے حوالے سے کی ہے۔ (اس بارے میں وحید الدین خاں صاحب نے ”سوشلزم اور اسلام“ میں پرویز صاحب کے موقف کو قوی دلائل سے غلط ثابت کیا ہے۔) اس تصور کے خلاف صحابہ کا ردعمل بتا رہا ہے کہ ان کے ذہن میں پہلے ایسا کوئی تصور نہیں تھا وگرنہ وہ اسلام کے تصور ذاتی ملکیت کے حوالے سے ایسی بحث نہ کرتے اور چپ چاپ ذاتی ملکیت کے حق سے دستبردار ہو جاتے۔ علاوہ ازیں وہ مسئلہ نئی فتح شدہ زمینوں (عراق و شام) کے حوالے سے تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے پاس پہلے سے جو زمینیں موجود تھیں ان کے بارے میں قطعاً یہ حکم نہیں دیا گیا کہ ان کو حکومت وقت اپنی تحویل میں لے رہی ہے۔

اَرْضُ اللّٰہِ۔ اب آیئے ایک اور لفظ کی طرف یعنی اَرْضُ اللّٰہِ، اس لفظ کو بنیاد بنا کر پرویز صاحب نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ زمین کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ آیئے دیکھتے ہیں

''ان اصولوں میں سر فہرست یہ اصول ہے کہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ زمانہ ء نزول قرآن میں، ذریعہ ء پیداوار زمین تھی۔ انڈسٹری (صنعت کاری یا نظام کارخانہ داری) ابھی وجود پذیر نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو ذریعہ ء پیداوار اپنی اصل کے اعتبار سے، زمین ہی ہے۔ اسی کی پیداوار ہے جسے کارخانے مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے، اس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس چیز کو قرآن ''خدا کی ملکیت'' کہتا ہے اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام نوع انسان کے فائدے کے لیے ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کو اس نے ایک تاریخی واقعہ سے نہایت بصیرت افروز انداز سے واضح کیا ہے۔ قوم ثمود کے زمانہ میں معاش کا دارومدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ قوم کے مستبد سرداروں نے چراگاہوں اور چشموں پر قبضہ کر کے، کمزور انسانوں کے مویشیوں کو ان سے متمتع ہونے سے محروم کر رکھا تھا۔ ان کے اس نظام کو توڑنے کے لئے آسمانی انقلاب کے داعی، خدا کے رسول حضرت صالحؑ اٹھے۔ کافی جدوجہد کے بعد، ان کے مخالفین اس پر رضامند ہو گئے کہ چراگاہیں اور چشمے تمام مویشیوں کے لیے یکساں طور پر کھلے رہیں۔ لیکن حضرت صالحؑ نے کہا کہ جب تک اس معاہدہ کا عملی ثبوت سامنے نہ آجائے، یقین نہیں کیا جا سکتا کہ تم اس پر قائم رہو گے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہو گا کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ، اس کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ یہ زید کی، بکر کی، امیر کی، غریب کی اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق بس یہ سمجھو کہ یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ فَذَرُوْھَا تَاْکُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ (64/11)، یہ خدا کی اونٹنی ہے اور یہ خدا کی زمین ہے۔ اس اونٹنی کو آزاد چھوڑ دو کہ یہ خدا کی زمین میں چرے چگے۔''

(نظام ربوبیت 279-280)

اس کے بعد آگے چل کر لکھتے ہیں۔

”یعنی اَلْاَرْضُ لِلّٰہ کہنے سے مقصود، خدا کی شان ملکوتی کا اظہار نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمین کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہ سمجھنا (یعنی کسی انسان کو زمین کے رقبے کا مالک قرار دینا) کفر ہے۔ شرک ہے۔ فلَاَ تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا (22/2)، سوا ے مسلمانوں! دیکھنا تم خدا کے شریک اور ہمسر نہ کھڑے کر دینا۔“ (نظام ربوبیت 280-281)

لیجئے پرویز صاحب نے تو زمین کی ذاتی ملکیت تسلیم کرنے والوں کو کافر و مشرک بھی قرار دے دیا۔ اور اوپر کا جو واقعہ (قوم ثمود) کے بارے میں بیان کیا ہے۔ نظر آرہا ہے کہ وہ پرویز صاحب کا ذاتی تصور ہے۔ نہ تو قرآن کریم نے ایسی تفصیل بیان کی ہے۔ اور نہ ہی اس کے لیے پرویز صاحب نے کوئی حوالہ (قرآن کریم اور تاریخ سے) دیا ہے۔ اب ہم قرآن کریم کی آیات دیکھتے ہیں کہ قوم ثمود کے ساتھ اصل معاملہ کیا تھا۔

☆وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا م قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط ھُوَ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْھَا فَاسْتَغْفِرُوْہُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ ط اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۵ قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ ھٰذَآ اَتَنْھٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ مُرِیْبٍ ۵ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰنِیْ مِنْہُ رَحْمَۃً فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ عَصَیْتُہٗ قف فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ ۵ وَیٰقَوْمِ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمْ اٰیَۃً فَذَرُوْھَا تَاْکُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ وَلَا تَمَسُّوْھَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَکُمْ عَذَابٌ قَرِیْبٌ ۵ (11/61-64)

”اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے۔ اور اسی نے اس زمین میں تمہیں بسایا ہے۔ پس تم اس سے معافی طلب کرو۔ اور اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب قریب اور دعائوں کا قبول کرنے والا ہے۔ انہوں نے کہا اے صالحؑ! اس سے پہلے تو ہم تجھ سے بہت امیدیں لگائے ہوئے تھے۔ کیا تو ہمیں ان کی

عبادتوں سے روک رہا ہے۔ جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے۔ ہمیں تو اس دین میں شک ہے جس کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگو! ذرا بتلائو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی مضبوط دلیل پر ہوا اور اس نے مجھے اپنے پاس کی رحمت عطا کی ہو۔ پھر اگر میں نے اس کی نافرمانی کر لی تو کون ہے جو اس کے مقابلے میں میری مدد کرے! تم تو میرا نقصان ہی بڑھا رہے ہو۔ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے ایک معجزہ ہے۔ اب تم اسے اللہ کی زمین میں کھاتی ہوئی چھوڑ دو اور اسے کسی طرح ایذا نہ پہنچائو۔ ورنہ فوری عذاب تمھیں پکڑے گا۔"

یہاں تو بات ہی ساری عبادت کی ہو رہی ہے۔ اور حضرت صالحؑ کہہ رہے ہیں کہ تم نے اللہ کے سوا اور معبود کیوں بنا رکھا ہے۔ جبکہ قوم اپنے آبائو اجداد کے معبودوں ہی کی پیروی پر عمل پیرا رہنا چاہتی تھی۔ اور اس کے بعد "اونٹنی" صرف ایک معجزہ کے طور پر بھیجی گئی۔ اس سے قطعاً یہ پہلو نہیں نکلتا کہ زمین کی ذاتی ملکیت پر کوئی روک لگائی جا رہی ہے۔

اور صرف اَلْاَرْضُ لِلّٰہ، کہہ کر یہ ثابت کرنا کہ زمین کی ذاتی ملکیت سمجھنا کفر و شرک ہے۔ یہ تصور ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح تو اللہ تعالی نے کہا ہے وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (2/286) اور آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ اس سے اگر کوئی یہ نتیجہ نکال لے کہ انسان زمین تو کیا کسی بھی چیز کو ذاتی ملکیت میں نہیں رکھ سکتا۔ اور یہ ساری چیزیں اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے پیدا کی ہیں۔ تو پھر جس کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو کہیں سے بھی اٹھا کر استعمال کر لے۔ اس سے تو صرف فساد ہی پیدا ہو گا۔

پرویز صاحب نے قرآن کریم سے کوئی ایسا واضح حکم بطور حوالہ پیش نہیں کیا۔ جس سے یہ طے ہو جاتا کہ زمین کی ذاتی ملکیت رکھنا خلاف قرآن ہے۔ اور وہ کہتے ہیں۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ، مگر آیت کا اگلا ٹکڑا بیان نہیں کرتے یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ (7/128)، اللہ تو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بناتا ہے۔

وصیت، انفاق، صدقات۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر ذاتی ملکیت حرام ہے تو پھر زکوۃ، صدقات، انفاق اور وراثت کے احکام کا کیا کیا جائے۔ کیونکہ ان تمام احکامات کے مطابق جو کہ قرآن کریم کے اندر کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ پرویز صاحب کے تصور ذاتی ملکیت کی نفی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا پہلا ہی ورق کھولیں تو لکھا ہے۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنفِقُوْنَ (2/3)، اور وہ ہمارے دیئے گئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی بے شمار جگہوں پر کہا یُنفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ 2/273،2/265،2/261-262) (اور پھر کہا وَفِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۵(19/51)، اور وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۵ ص لا لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۵(70/24-25)، اور جن کے مال میں حق ہے سوال کرنے والے اور محروم کا۔ ان تمام آیات پر غور کیجئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو تو اللہ نے مالک بنایا مال کا اَمْوَالَھُمْ یا اَمْوَالِھِمْ، کا صیغہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ مالک ہیں اس مال کے اور اس کے بعد اللہ تعالی انہیں ترغیب دے رہے ہیں کہ اس کی راہ میں یہ مال خرچ کرو۔

پرویز صاحب نے تو ایک سطر میں اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ یہ احکام عبوری دور سے متعلق ہیں۔ آیئے اس بارے پرویز صاحب کا نقطۂ نظر جانتے ہیں۔

''ان حالات میں آپ خود سوچ لیجئے کہ ایسے معاشرے میں صدقہ وخیرات، بیع وشری، اور وصیت و وراثت کے احکام کی ضرورت کہاں پیش آئے گی۔ یہ سب احکام عبوری دور میں ساتھ چلیں گے اور جوں جوں معاشرہ، نظام ربوبیت سے قریب ہوتا جائے گا۔ یہ احکام پیچھے کو کھسکتے جائیں گے۔''

(نظام ربوبیت 195-196)

اسی صفحہ کے فٹ نوٹ پر لکھتے ہیں۔

"وراثت کے متعلق تو قرآن نے بالتصریح فرمایا ہے کہ محنت و مشقت کئے بغیر، محض باپ کے ترکہ سے دولت مند بن جانا سرمایہ پرستی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وہ سورئہ الفجر میں واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ مفاد پرستوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا (19/89) وہ میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے میراث کے احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ جس میں ہنوز اس کا نظام ربوبیت قائم نہ ہوا ہو۔ جس چیز کو وہ مفاد پرستوں کا مسلک قرار دے کر اس بری طرح لتاڑتا ہے، اسے وہ کس طرح ربّانیّون کا مسلک قرار دے سکتا ہے۔"

مزید آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"اس سے ظاہر ہے کہ یہ احکام اس وقت تک کے لیے ہیں جب تک صحیح قرآنی نظام وجود میں نہیں آجاتا۔ جب یہ نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت وہی مسلک ہو گا جس کی طرف نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمادیا۔ (نحن معشر الانبیالانورث) انبیاء کا گروہ وراثت نہیں چھوڑا کرتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز انبیاء کے لیے جائز نہ ہو گی وہ مومنین کے لیے کس طرح جائز ہو گی۔"

اوپر کے پیرا میں پرویز صاحب نے لکھا کہ "قرآن نے بالتصریح فرمایا ہے کہ محنت و مشقت کئے بغیر محض باپ کے ترکہ سے دولت مند بن جانا سرمایہ پرستی کی بنیاد ہے۔" اب دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے

☆لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ص وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ط نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۵ (7/4)

"ماں باپ اور قرابت داروں کے ترکہ میں سے مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی خواہ وہ مال کم ہو یا زیادہ۔ حصہ مقرر کیا ہوا ہے۔"

☆وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ط وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۵ (33/4)

"ماں باپ یا قرابت دار جو چھوڑ مریں اسکے وارث ہم نے ہر شخص کے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن سے تم نے اپنے ہاتھوں معاہدہ کیا ہے انھیں ان کا حصہ دو۔ حقیقتاً اللہ تعالی ہر چیز پر حاضر ہے۔"

لیجئے یہ تو قرآن کریم کا حکم ہے۔ اب جو آیت پرویز صاحب پیش کر رہے ہیں۔ اس کی تفصیل دیکھتے ہیں۔

☆كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۵ لا وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۵ لا وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۵ لا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۵ ط (20-17/89)

"ہرگز نہیں۔ بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور مسکین کے کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے۔ اور مردوں کی میراث سمیٹ کر کھاتے ہو۔ اور مال کو جی بھر کر عزیز رکھتے ہو۔"

اب اس میں مال جمع کرنے اور عزیز رکھنے کی وعید سنائی گئی ہے اور یہ ترغیب دی گئی ہے کہ اسے یتیموں اور مسکینوں کے لیے بھی خرچ کرنا چاہئے۔ جبکہ وراثت کے جو حق ہیں ان سے قطعاً منع نہیں کیا گیا۔

اب ہم وراثت کے بارے میں کچھ آیات بیان کرتے ہیں۔

☆كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ج صلے نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ج حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۵ (180/2)

"تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور مال چھوڑ جاتا ہو تو اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھائی کے ساتھ وصیت کر جائے۔ پرہیز گاروں پر یہ حق ہے۔"

☆يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ج فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ج وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ط وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ج فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ج فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ م بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ط اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ج لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ط فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۵ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ج فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ م بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ط وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ج فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ م بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ط وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ج فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ م بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ج وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۵ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ط وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۵ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ص وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۵ (4/11-14)

"اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انہیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے۔ اگر اس (میت) کی اولاد ہو، اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے۔ ہاں اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو پھر اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔ یہ حصے اس وصیت (کی تکمیل) کے بعد ہیں جو مرنے والا کر گیا ہو۔ یا ادائے قرض کے بعد۔ تمہارے باپ ہوں یا تمہارے بیٹے، تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے۔ یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمتوں والا ہے۔ تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھوں آدھ تمہارا ہے۔ اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمہارے لئے چوتھائی حصہ ہے۔ اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا قرض کے بعد اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لیے چوتھائی

ہے۔ اگر تمہاری اولاد نہ ہو۔ اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر انہیں تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو یعنی باپ بیٹا نہ ہو اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں۔ اس وصیت کے بعد جو کی جائے اور قرض کے بعد جب کہ اوروں کا نقصان نہ کیا گیا ہو۔ یہ مقرر کیا ہوا اللہ تعالی کی طرف سے ہے۔ اور اللہ تعالی دانا ہے بردبار ہے۔ یہ حدیں اللہ تعالی کی مقرر کی ہوئی ہیں اور جو اللہ تعالی کی اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ تعالی جنتوں میں لے جائے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالی کی اور اسکے رسولؐ کی نافرمانی کرے اور اس کی مقررہ حدوں سے آگے نکلے اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ ایسوں ہی کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔"

☆یَسْتَفْتُوْنَكَ ط قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ ط اِنِ امْرُؤٌ ھَلَکَ لَیْسَ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَہٗٓ اُخْتٌ فَلَھَا نِصْفُ مَا تَرَکَ ج وَھُوَ یَرِثُھَآ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّھَا وَلَدٌ ط فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَھُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ ط وَاِنْ کَانُوْٓا اِخْوَۃً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ط یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ط وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۵ (176/4)

"آپ سے فتوی پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالی خود تمہیں کلالہ کے بارے میں فتوی دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور ایک بہن ہو تو اس کے لیے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے۔ اور وہ بھائی اس بہن کا وارث ہو گا اگر اس کے اولاد نہ ہو۔ پس اگر بہنیں دو ہوں تو انھیں کل چھوڑے ہوئے کا دو تہائی ملے گا۔ اور اگر کئی شخص اس ناطے کے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کے لئے حصہ ہے مثل دو عورتوں کے، اللہ تعالی تمہارے لئے بیان فرمارہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھٹک جاؤ اور اللہ تعالی ہر چیز سے واقف ہے۔"

☆یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا شَہَادَۃُ بَیۡنِکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ حِیۡنَ الۡوَصِیَّۃِ اثۡنٰنِ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ اَوۡ اٰخَرٰنِ مِنۡ غَیۡرِکُمۡ اِنۡ اَنۡتُمۡ ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَاَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃُ الۡمَوۡتِ ؕ تَحۡبِسُوۡنَہُمَا مِنۡۢ بَعۡدِ الصَّلٰوۃِ فَیُقۡسِمٰنِ بِاللّٰہِ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ لَا نَشۡتَرِیۡ بِہٖ ثَمَنًا وَّلَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی ۙ وَلَا نَکۡتُمُ شَہَادَۃَ ۙ اللّٰہِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الۡاٰثِمِیۡنَ ۞ فَاِنۡ عُثِرَ عَلٰۤی اَنَّہُمَا اسۡتَحَقَّاۤ اِثۡمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوۡمٰنِ مَقَامَہُمَا مِنَ الَّذِیۡنَ اسۡتَحَقَّ عَلَیۡہِمُ الۡاَوۡلَیٰنِ فَیُقۡسِمٰنِ بِاللّٰہِ لَشَہَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنۡ شَہَادَتِہِمَا وَمَا اعۡتَدَیۡنَاۤ ۫ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ۞(5/106-107)

”اے ایمان والو! تمہارے آپس میں دو اشخاص کا وصی (گواہ) ہونا مناسب ہے جبکہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وصیت کرنے کا وقت ہو۔ وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں اور تم میں سے ہوں یا غیر قوم کے دو شخص ہوں اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو پھر تم پر واقعہ موت کا پڑ جائے۔ اگر تم کو شبہ ہو تو ان دونوں کو نماز کے بعد روک لو۔ پھر دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس قسم کے عوض کوئی نفع نہیں لینا چاہتے۔ اگرچہ کوئی قرابت دار بھی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی بات ہو ہم پوشیدہ نہ کریں گے ہم اس حالت میں سخت گنہ گار ہونگے۔ پھر اگر اس کی اطلاع ہو کہ وہ دونوں گواہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تو ان لوگوں میں سے جن کے مقابلہ میں گناہ کا ارتکاب ہوا تھا اور دو شخص جو سب میں قریب تر ہیں جہاں وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ یہ دونوں کھڑے ہوں پھر دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ بالیقین ہماری یہ قسم ان دونوں کی اس قسم سے زیادہ راست ہے۔ اور ہم نے ذرا تجاوز نہیں کیا ہم اس حالت میں سخت ظالم ہونگے۔“

یہ تھے وہ تمام احکام وراثت کے بارے میں جن کے متعلق پرویز صاحب نے بیک قلم جنبش کہہ دیا کہ یہ عبوری دور سے متعلق تھے۔ اب کچھ آیتیں مزید انفاق کے بارے میں دیکھتے ہیں۔

☆یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝(254/2)

”اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہے نہ دوستی اور نہ سفارش۔ اور کافر ہی ظالم ہیں۔“

☆وَاَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۝ وَلَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (11-10/63)

”اور جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو کہنے لگے اے میرے پروردگار مجھے تو تھوڑی دیر کی مہلت کیوں نہیں دیتا؟ کہ میں صدقہ کروں اور نیک لوگوں میں سے ہو جاؤں۔ اور جب کسی کی مدت عمر پوری ہو جائے پھر اسے اللہ تعالی ہر گز مہلت نہیں دیتا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ تعالی بخوبی باخبر ہے۔“

یہ دونوں آیتیں ظاہر کرتی ہیں کہ انفاق کے لیے کوئی عبوری دور نہیں ہے۔ بلکہ ایک آیت میں فرمایا کہ ”خرچ کرو اپنی موت سے پہلے پہلے“ اور ایک آیت میں فرمایا ”خرچ کرو ایسا نہ ہو کہ آخرت کا دن آجائے۔“ یعنی یہ ظاہر ہے کہ یہ احکام اپنی جگہ پر محکم اور ہمہ گیر ہیں۔ نہ کہ کسی خاص وقت کے لیے۔ اس لیے پرویز صاحب کی یہ توجیہ قطعاً غیر قرآنی ہے۔ اور پرویز صاحب نے قرآن کریم سے کوئی ایسی دلیل نہیں دی جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ احکام عبوری دور کے متعلق ہیں۔

معاوضہ محنت کا۔ اب ہم مزید کچھ آیات کے ٹکڑوں کا ذکر کریں گے۔ جو سیاق وسباق کے لحاظ سے اپنا مفہوم رکھتی ہیں۔ لیکن پرویز صاحب نے ان ٹکڑوں کی بنیاد پر ایسا نظریہ یا سلوگن پیش کیا ہے جو سیاق وسباق کے مطابق اس

کے اصل مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس میں ایک ہے "معاوضہ محنت کا"۔ آیئے پہلے پرویز صاحب کا نقطۂ نظر دیکھتے ہیں۔

"جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور زمین میں ایک فرق ہے۔ پہلی سب چیزیں اپنی استعمالی شکل میں از خود موجود ہیں۔ لیکن خوراک کو زمین سے نکالنا پڑتا ہے۔ جس میں محنت صرف ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت دل نشین انداز میں واضح کر دیا کہ زمین کی پیداوار میں سے تم صرف محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو۔ باقی "خدا کا حصہ" ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تم کسی زمیندار سے بٹائی پر زمین لے کر اس میں کاشت کرتے ہو تو اس میں سے ایک حصہ خود لے لیتے ہو اور دوسرا حصہ زمیندار کو دے دیتے ہو (جسے تم زمین کا مالک سمجھتے ہو)۔ اسی قاعدے کے مطابق، زراعت میں اپنی محنت کا معاوضہ تم لے لو، اور حق مالکانہ خدا کو دے دو۔ سورۃ الواقعہ کی آیات نمبر 63 تا 74 میں اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غور سے سنیے فرمایا!

(اس مقصد کے لیے تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ مثلاً) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر، اس میں بیج ڈال دیتے ہو، اب بتائو کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا یہ تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہا!

پھر کھیتی کے اگنے کے بعد، اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جائو اور ایک دوسرے سے کہنے

لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بے کار میں گئے۔

اس کے بعد ہے

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانون ربوبیت ایسا کرتا ہے؟

(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں۔ جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آسکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کرتے؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے، صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشو و نما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے؟

اسی کے آگے ہے

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے، اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا۔ رگ خس میں شعلے کو نہاں کر دینا۔ تمہاری کاری گری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد کہا

(رزق پیدا کرنے کی اس تمام مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کار فرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظام خداوندی کا کس قدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہر حال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو، باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل (سامان زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے

مالک نہیں بن سکتے۔) یہ تمام ذرائع پیداوار از خود موجود رہتے ہیں۔ یہ نہ تمہارے بنائے ہوئے ہیں، نہ خریدے ہوئے۔ یہ تمہیں اس حقیقت کی یاددہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کے لیے سامان زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں، محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے۔ لہذا، تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامان پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور "ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔" سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ کو کس طرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ یہ ان تک پہنچادو جو اپنے لئے سامان پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔" (نظام ربوبیت 289-290)

یہ تھا مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ کا تصور پرویز صاحب کے نزدیک۔ سب سے پہلے ہم سورئہ واقعہ کی ان آیات کو دیکھتے ہیں تاکہ ان الفاظ کا معنی متعین ہو جائے۔

☆ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ٥ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ٥ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ٥ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ٥ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ٥ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ٥ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ٥ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ٥ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ٥ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ٥ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ٥ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ٥ (56/63-74)

"کیا تم دیکھتے ہو جو کچھ تم بوتے ہو۔ اسے تم ہی اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اسے ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور تم حیرت کے ساتھ باتیں بناتے ہی رہ جائو۔ کہ ہم پر تو تاوان ہی پڑ گیا۔ بلکہ ہم بالکل ہی بدنصیب رہ گئے۔ کیا تم دیکھتے ہو کہ جس پانی کو تم پیتے ہو۔ اسے بادلوں سے تم اتارتے ہو یا ہم برساتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ہم اسے کڑوا زہر کر دیں۔ پھر تم ہماری شکر گزاری کیوں نہیں کرتے۔ کیا تم دیکھتے ہو جو آگ تم سلگاتے ہو۔ اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں۔ ہم نے اسے نصیحت کا باعث بنایا ہے۔ اور بھوکوں (مسافروں) کے لیے فائدے کی چیز بنایا ہے۔ پس اپنے بہت بڑے رب کے نام کی تسبیح کیا کرو۔"

یہاں بات واضح ہے کہ کسی کاروبار کے اصول طے نہیں ہو رہے بلکہ اس آگ کی بات کی جا رہی ہے جسے اللہ نے نصیحت اور بھوکوں کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔ ان آیات میں کھیتی کے بارے میں فرمایا۔ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰہُ حُطَامًا۔۔، اور پانی کے بارے میں فرمایا لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰہُ اُجَاجًا۔۔، اور اسی طرح آگ یا آگ کے درخت کے بارے میں فرمایا نَحْنُ جَعَلْنٰھَا تَذْکِرَۃً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ۵ اس میں جَعَلْنٰھَا ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ٹکڑا آگ کی بات کر رہا ہے۔ اور دنیائے انسانیت میں ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ان آیات میں یہ قطعی ذکر نہیں کہ تم "محنت کا معاوضہ اپنے پاس رکھ لو اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔" یہ تو اللہ تعالی اپنی نعمتوں کا تذکرہ کر رہا ہے۔ تاکہ انسان اس کا مطیع اور فرمانبردار بن کر رہے۔ باقی رہی ان نعمتوں کے استعمال کی بات۔ تو یہ انسان ہی کے لیے ہے۔ اسی حقیقت کو مندرجہ ذیل آیات میں بیان کیا ہے۔

☆فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ ۵ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۵ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۵ فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۵ وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا ۵ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۵ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۵ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۵ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۵ (80/24-32)

"انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھ لے۔ کہ ہم نے بارش برسائی۔ پھر زمین کو شق کیا۔ (یعنی پھاڑا) پھر اس میں سے اناج اگائے۔ اور انگور اور ترکاری۔ اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغات اور میوہ اور گھاس چارہ (بھی اگایا) تمہارے استعمال و فائدہ کے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے۔"

پرویز صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں

"قرآن کی رو سے ربوٰ کے معنی ہوئے، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ، محنت (Labour) کا ہے یا سرمایہ (Capital) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53/39) انسان صرف اپنی محنت

کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا، لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے۔ خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ وہ ربوٰ ہے۔ جو قرآن کریم کی رو سے حرام ہے اور ''خدا اور رسول'' کی طرف سے اعلان جنگ کا مستوجب۔''

(ربوبیت410-411)

یہاں بھی پرویز صاحب نے ایک آیت کو بنیاد بنایا ہے ہم اس سے پہلے کچھ آیات پیش کرتے ہیں تاکہ مذکورہ آیت 53/39 کا مفہوم واضح ہو جائے۔

☆ اَمۡ لَمۡ یُنَبَّاۡ بِمَا فِیۡ صُحُفِ مُوۡسٰی ۵ وَ اِبۡرٰہِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ۵ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۵ وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۵ وَ اَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ۵ ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ۵ (53/36-41)

''کیا اسے اس چیز کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰؑ کے اور وفادار ابراہیمؑ کے صحیفوں میں تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی اور یہ کہ بے شک اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔''

آیات اپنے مفہوم میں واضح ہیں یہ تو انسان کے اس دنیا کے اعمال کی بات ہو رہی ہے جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان اعمال کا بدلہ عنقریب دیا جائے گا۔ یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں کہ معاوضہ صرف محنت کا ہے۔

قُلِ الۡعَفۡوَ، یہ ایک اور ٹکڑا ہے قرآنی آیت کا۔ جس سے پرویز صاحب نے کہا کہ فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہنی چاہیے۔ پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد قرآن کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے اور قطعی طور پر طے ہو گیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ۔۔۔، اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے اور دوسروں کا کس قدر۔ کہا گیا قُلِ الۡعَفۡوَ(2/219)، ان سے کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اتنا ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقع آ جائے کہ دوسرے کی ضرورت تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو تم اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دو۔

اس (قل العفو کے) فیصلہ نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے طے کر کے رکھ دیا۔ اس سے کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) نہ رہی۔ اور جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی تو معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں اور تباہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ قرض خواہ اور مقروض۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔ زمیندار اور کاشتکار۔ کارخانہ دار اور مزدور، غریب اور امیر کا تفاوت ختم ہو گیا۔" (نظام ربوبیت 293-294)

آیت کا ٹکڑا یہ ہے یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ط قُلِ الۡعَفۡوَ ۵ اے نبیؐ وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ ان سے کہہ دیجئے جتنا ضرورت سے زائد ہے۔ لیکن پرویز صاحب کا بات کرنے کا انداز مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ " اے رسولؐ یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے۔" دیکھئے بات کچھ کی کچھ ہو گئی۔ حق کی تو بات ہی نہیں ہو رہی۔ لوگ خود سوال کر رہے ہیں اور ان کی رہنمائی کی جا رہی ہے۔ پھر آپ یہ بھی غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ تاکہ وہ خود فیصلہ کریں اور ضرورت کے مطابق استعمال کریں اور پھر باقی اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اور پھر یہاں ایسا کوئی حکم نہیں کہ لوگ زائد از ضرورت مال کو مملکت کے حوالے کر دیں۔ بلکہ دیگر مقامات پر انفاق کے مصارف بیان کر دیئے۔ اب ہر فرد اپنے تقویٰ کے مطابق خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

اس کے بعد انفاق کے متعلق جتنے بھی احکام ہیں ان میں ترغیب کا پہلو ہے۔ اس معاملہ میں اللہ تعالی نے لوگوں پر سخت رویہ نہیں اپنایا۔ جبکہ زکوۃ کے معاملہ میں تادیبی کارروائی کا حکم موجود ہے۔ اس لیے ترغیب اور قانون کا فرق مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

اب اگلی بات پرویز صاحب یہ کہتے ہیں کہ معاشی ناہمواری نہیں ہونی چاہئے۔ اور معاشی مساوات ہونی چاہئے۔ امیر اور غریب کا تفاوت ختم ہونا چاہیے۔ لیکن کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ غریب کے گھر پیدا ہوتا ہے اور دوسرا بچہ امیر کے گھر پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ سارا Phenomenon انسانی کنٹرول سے بالا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ چیز مد نظر رکھنی چاہیے کہ رزق کی تقسیم اللہ تعالی نے اپنے اختیار میں رکھی ہے آپ اس کو زبردستی تو برابر نہیں کر سکتے وہ تو کسی کو زیادہ دیتا ہے اور کسی کو کم۔ تا کہ آزمائے کہ لوگ ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اب ہم کچھ آیات پیش کرتے ہیں جو ہمارے موقف کو مزید واضح کر دیں گی۔

☆زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۵ (212/2)

”کافروں کے لیے دنیا کی زندگی خوب زینت دار کی گئی ہے۔ وہ ایمان والوں سے ہنسی مذاق کرتے ہیں حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن ان سے اعلی ہونگے۔ اور اللہ تعالی جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔“

☆وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ ط اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ز صلے وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۵ (165/6)

"اور وہ ذات جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں۔ یقینا آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے۔ اور یقینا وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا، مہربانی کرنے والا ہے۔"

☆اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ ؕ وَفَرِحُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ ۵ (26/13)

"اللہ تعالی جس کی روزی چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔ اور گھٹاتا ہے۔ یہ تو دنیا کی زندگی میں مست ہو گئے۔ حالانکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں نہایت حقیر پونجی ہے۔"

☆وَجَعَلۡنَا لَکُمۡ فِیۡہَا مَعَایِشَ وَمَنۡ لَّسۡتُمۡ لَہٗ بِرٰزِقِیۡنَ ۵ (20/15)

"اور اسی میں ہم نے تمہاری روزیاں بنادی ہیں۔ اور جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو۔"

☆وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ ۚ فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِہِمۡ عَلٰی مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَہُمۡ فِیۡہِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ ۵ (71/16)

"اللہ تعالی نے ہی تم میں سے ایک کو دوسرے پر روزی میں زیادتی دے رکھی ہے۔ پس جنہیں زیادہ دیا گیا ہے وہ اپنی روزی اپنے ماتحت غلاموں کو نہیں دیتے کہ وہ اور یہ اس میں برابر ہو جائیں۔ تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے منکر ہو رہے ہیں۔"

☆اِنَّ رَبَّکَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ۵ (30/17)

"یقینا تیرا رب جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ۔ یقیناوہ اپنے بندوں سے باخبر اور خوب دیکھنے والا ہے۔"

☆وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّ نَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی ۵ (124/20)

”اور جو میری یاد سے روگردانی کرے گا اس کی زندگی تنگی میں رہے گی اور ہم اسے روز قیامت اندھا کر کے اٹھائیں گے۔“

☆وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۵ لا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۵ ((131/20

”اور اپنی نگاہیں ہرگز ان چیزوں کی طرف نہ دوڑانا جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو آرائش دنیا دے رکھی ہیں تاکہ انھیں اس میں آزمالیں۔ تیرے رب کا دیا ہوا رزق بہت بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔“

☆فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ط قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ لا إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۵ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ج وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ۵ فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ قف فَمَا كَانَ لَهُ مِن فِئَةٍ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ ق وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ ۵ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ ج لَوْلَا أَن مَّنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ط وَيْكَأَنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ ۵ (28/79-82)

”پس قارون پوری آرائش کے ساتھ اپنی قوم کے مجمع میں نکلا، تو دنیا کی زندگی کے متوالے کہنے لگے کاش کہ ہمیں بھی کسی طرح وہ مل جاتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ یہ تو بڑا ہی قسمت کا دھنی ہے۔ ذی علم لوگ انھیں سمجھانے لگے کہ افسوس بہتر چیز تو وہ ہے جو بطور ثواب انھیں ملے گی جو اللہ پر ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ یہ بات انہی کے دل میں ڈالی جاتی ہے جو صبر والے ہوں۔ آخر ہم نے اسے اس کے محل سمیت زمین میں دھنسا دیا اور اللہ کے سوا کوئی جماعت اس کی مدد کے لیے تیار نہ ہوئی۔ نہ وہ خود اپنے بچانے والوں میں سے ہو سکا۔ اور جو لوگ کل اس کے مرتبہ پر پہنچنے کی خواہش کر رہے تھے وہ آج کہنے لگے کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالی ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ بھی، اگر اللہ تعالی ہم پر فضل نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا، کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ناشکروں کو کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔“

☆ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ ط وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ٥(39/34)

”کہہ دیجئے بے شک میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اللہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔“

☆ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ط اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ٥(27/42)

”اگر اللہ تعالی اپنے سب بندوں کی روزی فراخ کر دیتا تو وہ زمین میں فساد برپا کر دیتے۔ لیکن وہ اندازے کے ساتھ جو کچھ چاہتا ہے نازل فرماتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے پورا خبر دار ہے۔ اور خوب دیکھنے والا ہے۔“

☆ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا ط وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ٥(32/43)

”کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں۔ ہم نے ہی ان کی دنیا کی زندگی کی روزی ان میں تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو ماتحت کر لے۔ اور جسے یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں۔ اس سے آپ کے رب کی رحمت بہت ہی بہتر ہے۔“

☆ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ٥ وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ط وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ط قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ٥(3-2/65)

”اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے۔ جس کا اسے گمان بھی نہ ہو۔ اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہو گا۔ اللہ تعالی اپنا کام پورا کر کے ہی رہے گا۔ اللہ تعالی نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔“

☆لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖط وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُط لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَاط سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ﴿۷﴾ (7/65)

”کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے اور جس پر اس کے رزق کی تنگی کی گئی ہو اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ نے اسے دے رکھا ہے اس میں سے حسب حیثیت خرچ کرے۔ کسی شخص کو اللہ اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اور اللہ تنگی کے بعد آسانی بھی دے گا۔“

درج بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رزق کی تقسیم اللہ تعالی نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اور معاشی مساوات اس کا مطمع نظر یا مقصد نہیں ہے بلکہ وہ تو لوگوں کی آزمائش کے لیے کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دے رہا ہے۔ اور اپنی جائز حاجات میں اسی سے ہی رزق مانگنا چاہیے۔ اور کوئی

بھی ایسا نظام جو فطرت کے اصولوں کے خلاف ہو پنپ ہی نہیں سکتا۔

پرویز صاحب بہت سے دیگر مفکرین کی طرح سوشلزم سے متاثر تھے اسی لیے انہوں نے اس کے اصولوں کو درست ثابت کرنے کے لیے قرآنی آیات کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا یہ انداز انتہائی غلط تھا۔ کہ وہ قرآنی آیات کے ٹکڑے سیاق وسباق سے ہٹا کر بطور دلائل پیش کرتے تھے۔

{☆☆☆☆☆}

باب ششم: صلوٰۃ (نماز)

الصلوۃ دین اسلام کی ایک اصطلاح ہے جس میں ایک مسلمان خاص قسم کی حرکات سے عبادت کرتا ہے۔ جسے ہم نماز بھی کہتے ہیں۔ مگر پرویز صاحب نے اس اصطلاح کو اس کے مروج مفہوم سے ہٹا کر عقلی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اوراس انداز سے اس کا مفہوم بیان کیا ہے کہ موجودہ نماز سے عملی طور پر انکار کیا ہے۔ جس کا اظہار آج ہم پرویز صاحب کے متبعین کی اکثریت میں دیکھتے ہیں۔

چونکہ پرویز صاحب دین میں صرف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں جو عقل کے پیمانے پر پورا اترے۔ اور ہر وہ بات جو عقل پر پورا نہیں اترتی تو اس کا مفہوم اس انداز سے بیان کیا جائے کہ وہ عقلی پیمانے پر پورا اتر جائے۔ اس کے لیے انہوں نے زبان کی اصل (سیاق وسباق) کو چھوڑ کر لغت اور دوسرے ذرائع کا سہارا لیا۔

نماز کا موضوع اتنا حساس ہے کہ پرویز صاحب نے کھلے لفظوں میں اس کا انکار نہیں کیا بلکہ دبے لفظوں میں اس کے خلاف ہی بات کی ہے۔ اور اپنے لٹریچر اور تقاریر میں اس انداز سے دلائل دیئے کہ ان کے متبعین نے نماز و دیگر مذہبی مناسک عملی طور پر چھوڑ دیئے۔ بلکہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے لوگوں کو نماز سے روکنا شروع کر دیا۔

پھر ایک موقع ایسا آیا کہ پرویز صاحب کو اس بارے میں وضاحتیں دینا پڑیں کہ "میں موجودہ نماز کا انکار نہیں کرتا۔" یا یہ کہ "موجودہ نماز میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔" یا یہ کہ "میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں۔" اور یہ کہ "صلوۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لیے بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔"

یہ پرویز صاحب کی فکر کا ایک بہت بڑا تضاد تھا حالانکہ جو کام وہ کرنا چاہتے تھے وہ انہوں نے اپنے لٹریچر اور تقاریر کے ذریعے کر دیا تھا۔ متبعینِ پرویز کی اکثریت نے نماز پڑھنا چھوڑ دی۔ اس طرح عملی طور پر پرویز صاحب نے "نماز" کی جڑیں کاٹ دی تھیں۔ جب یہ کہا کہ "موجودہ نماز برائی اور بے حیائی سے نہیں روکتی۔" اور "اس نماز کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔" اور یہ کہ "یہ ایسی پٹڑی ہے جس پر کوئی ٹرین نہیں چلتی۔" اور "قرآن کریم کی رو سے اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ کا وہ مفہوم نہیں جو آجکل لیا جاتا ہے۔ یہ وہ فرائض ہیں جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ادا کئے جاسکتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ

(حوالہ جات کے لیے آنے والے اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔)

نماز کا تعلق دین کی ان اساسات سے ہے جن کو ہم مذہبی مناسک یا شعائر کہہ سکتے ہیں۔ اور ایسے مناسک خالص رضائے الہٰی کے لیے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ جن کا نتیجہ ظاہری طور پر فطری قوانین کی طرح نہیں نکلتا۔ اور پرویز صاحب نے اپنی فکر کی بنیاد اسی چیز پر رکھی ہے کہ 2+2=4 اس کے لیے وہ اکثر مثال دیتے ہیں کہ ایک آدمی روزانہ سیر کرتا ہے تو چند دن بعد اس کی صحت اچھی ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک عمل کیا اور اس کا نتیجہ نکل آیا۔ حالانکہ مذہبی شعائر کے انجام دینے میں اس طرح کا عمل اور ردعمل ناممکن ہے۔ اسی لیے پرویز صاحب نے ہر اس مذہبی شعار کا انکار کیا اور اس کا مفہوم اس انداز سے بیان کیا کہ وہ عقل کی توجیہ پر پورا اترے۔ اس طریق استدلال سے آہستہ آہستہ متبعینِ پرویز نے وہ تمام مذہبی شعائر چھوڑ دیئے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ اور حالانکہ جو قرآن کے واضح احکام تھے جن کا مذہبی شعائر سے بھی تعلق نہ تھا ان کو بھی چھوڑ دیا اور اس کی توجیہ یہ دی کہ چونکہ یہ سسٹم غیر قرآنی ہے اس لیے ان احکام کا ان پر اطلاق نہیں ہوتا۔

سب سے پہلے ہم پرویز صاحب کا صلوۃ (نماز) کے بارے میں نقطۂ نظر تفصیلاً بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد ہم قرآن کریم کی روشنی میں اس کا تجزیہ کریں گے۔

"وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ۔ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔"وہ نماز قائم کرتے ہیں۔" "نماز پڑھتے ہیں۔" کا تو مطلب سمجھ میں آسکتا ہے لیکن "نماز قائم کرتے ہیں۔" سے بات واضح نہیں ہوتی۔یقیمون کا مادہ (ق۔و۔م) ہے۔ قَامَ، قِيَاماً کے معنے ہوتے ہیں کھڑا ہونا، متوازن ہونا، کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا، محکم اور استوار ہونا۔ ثابت اور دائم رہنا۔ اَقَامَ کے معنے ہیں اسے درست اور سیدھا کیا۔ اس کا توازن قائم رکھا۔ ان معانی کو سورۃ فاتحہ میں اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے سلسلہ میں بیان کیا جاچکا ہے۔لہذا اقامت صلوۃ کے معنے ہونگے الصلوۃ کو محکم اور استوار کرنا۔ متمکن کرنا۔(Establish) کرنا۔مارماڈیوک پکتھال نے اپنے انگریزی ترجمہء قرآن مجید میں یقیمون کے یہی معنے لکھے ہیں(اگرچہ اس کے ساتھ الصلوۃ کا ترجمہ روش عامہ کے تتبع میں (Worship) ہی کیا ہے۔)اس سے واضح ہے کہ "الصلوۃ" کوئی ایسی چیز ہے جس کا متمکن کرنا اور مستحکم کیا جانا مطلوب و مقصود ہے۔ نماز کے متعلق آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ دین کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاحات کو علٰی حالہ رکھا جائے۔ان کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ان کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جاسکتا۔ان کی جگہ کسی دوسری زبان کے الفاظ رکھ دینے سے نہ صرف یہ کہ ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ وہ مفہوم مسخ ہو جاتا ہے۔ الصلوۃ کو الصلوۃ ہی کہنا چاہیے اور اس کا مفہوم عربی لغت اور قرآن کریم سے متعین کرنا چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم میں اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ کی اصطلاحات دین کے بنیادی ارکان (عمائد اور ستون) کی حیثیت سے بار بار دھرائی جاتی ہیں۔اس سے ان کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

لغت اور قرآن کریم کی رو سے مفہوم متعین کرنے کے سلسلہ میں اس اہم نقطہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ لغت سے وہ بنیادی تصور (Concept) سامنے آجاتا ہے جو اس لفظ کے مادہ میں مضمر ہوتا ہے اور جس کے لئے اسے عرب استعمال کرتے تھے۔(اسے محاورئہ عرب کہا جاتا ہے) لیکن جب ان الفاظ میں سے کسی لفظ پر

(اَلْ) داخل کر کے، اسے معرفہ بنالیا جائے تو وہ قرآنی اصطلاح ہو جاتا ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم قرآن کریم سے متعین کیا جائے گا۔ اس کا ذریعہ "تصریف آیات" ہے۔ یعنی قرآن کریم جس جس مقام پر اس اصطلاح کو لایا ہے وہاں سے یہ اخذ کرنا کہ اس کا اس باب میں مقصد و مطلب کیا ہے۔ محاورۂ عرب اور تصریف آیات سے (غور و تدبر کے بعد) قرآن مجید کے مفردات و اصطلاحات کا مفہوم واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً لفظ صلوٰۃ کے بنیادی معانی محاورۂ عرب کی رو سے متعین کئے جائیں گے۔ اور جب الصلوۃ کہا جائے گا تو یہ قرآنی اصطلاح ہو گی۔ اس پر دیگر قرآنی اصطلاحات کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہم نے بہر حال یہی طریق اختیار کیا ہے۔)

صلوۃ کے لغوی معنی۔ صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے۔ ویسے اس کا مادہ (ص۔ل۔ی) بھی ہو سکتا ہے۔ (لیکن یہ فنی بحث ہے جسے میں نے "لغات القرآن" میں بیان کیا ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔) بنیادی طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں، کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا۔ چونکہ عرب، نظری اور تجریدی حقائق کا مفہوم محسوسات کے ذریعے واضح کیا کرتے تھے اس لئے ان کے ہاں گھڑ دوڑ میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر اس طرح مسلسل دوڑتا جائے کہ اس کی کنوتیاں پہلے نمبر والے گھوڑے کی سرین سے مل رہی ہوں تو وہ آگے جانے والے گھوڑے کو "سَابِقٌ" کہتے تھے اور اس دوسرے نمبر والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّی۔ اسی بنا پر امام راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (74/43) ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ لغت کی اہم کتاب تاج العروس میں ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں لزوم (وابستگی) یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس جہت سے قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ صلوۃ کے معنے ہونگے نظام خداوندی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا۔ کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ اس بنا پر، صلوۃ کے معنے خدا کی طرف سے متعین کردہ فرائض منصبی کے بھی آتے ہیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ "الصلوۃ" سے مفہوم صرف نماز نہیں۔ اس میں پورے کے پورے قوانین و احکام

خداوندی اور اس کے عائد کردہ فرائض منصبی آجاتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں ہم نے دیکھا ہے کہ مومنین کی دعا ہوتی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (1/5) اور سورۂ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (11/56) میرا رب صراط مستقیم پر ہے۔ نظر بظاہر یوں دکھائی دے گا گویا خدا اصراط مستقیم پر آگے آگے جارہاہے اور مومنین اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی دعامانگ رہے ہیں۔ (صلوۃ میں یہی مفہوم مضمر ہے) لیکن اسطرح کا تشبیہی مفہوم خدا کے تنزیہی تصور کے خلاف ہے اس لیے اس کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ وہ نظام کائنات، جو قوانین خداوندی کا اتباع کرتے ہوئے اپنے ارتقائی منازل طے کر رہاہے۔ یہ مفہوم سورۃ ''النور'' کی اس آیت سے نکھر کر سامنے آجاتا ہے جس میں کہا گیاہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۵ (24/41) ''کیا تونے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ارض و سموت کی ہر شے اور فضائے سماوی میں پرفشاں پرندے خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوۃ کو جانتاہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب خدا کے علم میں ہے۔'' لفظ تسبیح کی تشریح تو آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گی یہاں مجملاً اتنا بتادینا کافی ہو گا کہ اس کے معنے ہوتے ہی مقصد پیش نظر کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور اس کے لئے اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر دینا۔ اس آیت میں کہا یہ گیاہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تسبیح اور صلوۃ کو جانتی ہے۔ بات واضح ہے کہ کائنات کی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیاہیں۔ اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کا طریقہ کیاہے جس کے لئے انہیں مصروف جدوجہد رہناہے۔ یہاں سے صلوۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتاہے۔

دوسرے مقام پر قرآن کریم نے خود انسانوں کے متعلق وضاحت کر دی ہے کہ الصلوۃ کا مفہوم کیاہے اور اس کا نتیجہ کیا۔ اس کے قیام سے کیاحاصل ہوتاہے اور اس کے ضائع کر دینے سے کیاتباہی آتی ہے۔ سورۃ مریم میں پہلے مختلف انبیائے کرامؑ کا تذکرہ آیاہے اور کہا گیاہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں خدانے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (19/59) ان کے بعد، ان کی امتوں میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے

جنہوں نے الصلوۃ کو ضائع کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ انہوں نے کیا کیا جس سے الصلوۃ کا ضیاع ہو گیا۔ کہا وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ (19/59) وہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقامت صلوۃ اور اتباع جذبات دو متضاد چیزیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے انسانی جذبات کی تسکین بری چیز نہیں بشر طیکہ ان کا اتباع حدود خداوندی کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے۔ یہ تباہیاں اس وقت لاتے ہیں جب یہ سرکش اور بیباک ہو جائیں۔ لہذا الصلوۃ کے معنے ہوئے انسانی خواہشات و جذبات کی، قوانین خداوندی کے مطابق تسکین وبرومندی، ان سے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کام لینا۔ انہیں قوانین الہیہ کے پیچھے پیچھے چلانا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اجتماعی نظام کے تابع ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ نظام جس میں مختلف افراد اپنے اپنے مفادات کے پیچھے بھاگنے کی بجائے خدا کے متعین کردہ نصب العین کی طرف بڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اقامت صلوۃ کو ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے یہ بھی بتایا کہ الصلوۃ کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے جب جماعت مومنین کو تمکن فی الارض حاصل ہو۔ ان کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (22/41) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہو گا، ان کی اپنی مملکت قائم ہو گی (24/55) تو یہ اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ نماز پڑھنے اور مروجہ (اڑھائی فیصد) زکوۃ دینے کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت لاحق نہیں ہو سکتی۔ مروجہ طریق پر یہ فرائض ہر حکومت میں ادا کئے جاسکتے ہیں۔ ہمیں انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں بھی نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے کا حق حاصل تھا۔ اور آج ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ کا وہ مفہوم نہیں جو آج کل لیا جاتا ہے۔ یہ وہ فرائض ہیں جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ادا کئے جاسکتے ہیں۔ (زکوۃ کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر آئے گی یہاں ہم صرف صلوۃ تک محدود رہنا چاہتے ہیں۔)

اسلامی مملکت کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے۔ کہ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ (42/38) مومنین وہ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ یعنی اقامت صلوۃ کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ اور جو رزق خدا نے انہیں دیا ہوتا ہے اسے نوع انسانی کی عالمگیر ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ (یہی ایتائے زکوۃ کا مفہوم ہے) یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوۃ وہ نظام مملکت ہے جس میں تمام امور جماعت مومنین کے باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔ اور جس کا بنیادی فریضہ نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔ چونکہ اسلامی نظام کتاب اللہ کے قوانین و اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے اس لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (7/170)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور اس طرح اقامت صلوۃ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ الصلوۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے، اسے قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں واضح کر دیا ہے۔ سورہ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کے سامنے دعوت خداوندی کو پیش کیا تو حسب معمول انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ شدید کشمکش کے بعد قوم نے حضرت شعیبؑ سے پوچھا کہ یہ بتایئے کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں صلوٰۃ کی آزادی چاہتا ہوں (کہ اس میں آپ لوگ مخل نہ ہوں) اس مذہب پرست قوم نے اپنے خیال کے مطابق سمجھا کہ یہ اپنے طریق پر خدا کی پرستش کی اجازت چاہتے ہیں۔ اس میں کونسی حرج کی بات ہے۔ یہ جس طرح جی چاہے پوجا پاٹ کر لیا کریں۔ چنانچہ وہ اس پر رضا مند ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ صلوۃ سے حضرت شعیبؑ کا مطلب وہ نہیں تھا جسے وہ سمجھے بیٹھے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11/87) اے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔ اس صلوۃ کی تو ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

آپ اس آیۃ جلیلہ کے آخری حصہ پر غور کیجئے، جس سے واضح ہے کہ صلوۃ صرف نماز کا نام نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہوتا ہے۔

ہم نے سورۃ حج کی آیت (41/22) میں دیکھا ہے کہ کہا یہ گیا ہے کہ جب جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگی تو وہ اقامت صلوۃ، ایتائے زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (45/29) یہ حقیقت ہے کہ الصلوۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ فحشاء کی تفصیلی بحث تو آگے چل کر سامنے آئے گی۔ یہاں ہم اپنے آپ کو منکر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے، نہی عن المنکر، مملکت کا فریضہ بتایا گیا اور یہاں یہ کہا گیا کہ یہ کام الصلوۃ کرے گی۔ یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوۃ اس نظام ہی کا نام ہے جس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ جہاں تک ہماری نمازوں کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ ان سے فحشاء اور منکرات نہیں رکتے۔ بے نمازوں کو تو چھوڑیئے، کتنے نمازی ہیں جو بڑی باقاعدگی سے نمازیں پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود منکرات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لہذا منکرات، نظام صلوۃ (اسلامی نظام مملکت) ہی سے رک سکتے ہیں۔

نماز۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اگرچہ قرآن کریم کی رو سے اقامت صلوۃ کا مفہوم وہ نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (صلوۃ) اس شکل کے لئے بھی آیا ہے جسے نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ نماز قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا لفظ ہے۔ ایران کے مجوس (جنہیں ہمارے ہاں پارسی کہا جاتا ہے) اپنے طریق پرستش کو نماز کہا کرتے تھے۔ انہی کے ہاں سے یہ لفظ ہمارے ہاں (ہندوپاک میں) آیا اور ایسا عام ہوا کہ اب صلوۃ کی جگہ یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ بایں ہمہ، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، الصلوۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں اب نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

خیالات اور جسمانی حرکات کا تعلق۔ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جب اس کے دل میں کوئی جذبہ ابھرتا ہے تو اس کا اظہار زبان کے ذریعے بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے دیگر اعضائے بدن سے خود بخود ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ جو اس جذبہ یا خیال کا مظہر بن جاتی ہیں۔(مثلاً) جب آپ کے دل میں جذبات مسرت موجزن ہوتے ہیں تو اس کی لہریں مسکراہٹ کی شکل میں آپ کے چہرے پر پھیل جاتی ہیں۔ جب آپ کسی کو سلام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ خود بخود ماتھے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ جب آپ کسی کی تعظیم کرتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے، اور خود سپردگی کے عالم میں یہ جھکاؤ انتہائی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جسے سر بسجود ہونا کہتے ہیں۔ اصطلاح میں خیالات اور اعضاء کی اس یکبارگی ہم آہنگی کو متوازیت یا(Parallelism) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اعضاء کی ان حرکات کا تقاضا ایسا غیر شعوری اور بلا ساختہ ہوتا ہے کہ آپ اسے روک نہیں سکتے۔ اگر آپ کسی مقرر پر پابندی لگا دیں کہ وہ تقریر تو جیسی چاہے کرے لیکن دوران تقریر وہ ساکن کھڑا رہے۔ اس سے نہ کسی قسم کی حرکت ظہور میں آئے نہ چہرے پر خاص علامات کی نمود ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اول تو وہ تقریر ہی نہیں کر سکے گا اور اگر بندھے رندھے الفاظ بولے گا بھی تو اسکی تقریر بالکل غیر موثر اور بے نتیجہ رہ جائے گی۔ اعضائے جسمانی کی ان محسوس اور مرئی حرکات کو(Formalism) شعائر و مناسک۔ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انسان کے اس داخلی تقاضہ کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ اس کے ظہور و نمود کی اجازت دی ہے۔ صلوۃ(نماز) میں قیام و رکوع و سجود، اور مناسک حج میں طواف وغیرہ انسان کے اسی تقاضہ کی تسکین کی شکلیں ہیں۔

اگر ان مرئی شکلوں کو ترک کر دیا جائے تو باقی یا تو فلسفیانہ تخیلات رہ جاتے ہیں۔ یا خانقاہیت کی کیفیات جن کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی

یہ فلسفہ کے تصورات ہوں یا تصوف کی کیفیات، بہر حال انفرادی ہوتی ہیں۔ اجتماعیت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ لہذا اس میں یہ محسوسات بھی باقی رہتی ہیں اور ان میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کی ہم آہنگی امت میں وحدت عمل کا مظہر ہوتی ہے۔

دوسری طرف، جب ان محسوسات سے غرض و غایت مفقود ہو جائے اور ظواہر کی ادائیگی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو اسے پرستش کہا جاتا ہے۔ جو ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ملتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی چونکہ اسلام "مذہب" بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اس میں بھی الصلوۃ کو نماز کے محسوس ارکان تک محدود سمجھ لیا گیا اور عبادت کا مفہوم پرستش قرار دیا گیا ہے۔ اور انہی ظواہر کو اسلام کی غایت سمجھ لیا گیا ہے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد آیئے قرآن کریم کی روشنی میں صلوۃ کے اجتماعات کی طرف۔ اسلامی نظام کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۵ (38/42) یہ وہ لوگ ہیں جو احکام خداوندی کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ اقامت صلوۃ کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ فریضہ انفاق کی ادائیگی کے لئے کس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ صدر اول کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب مملکت کے کسی اہم معاملہ کے لئے مشاورت کی ضرورت لاحق ہوتی تو حکومت کی طرف سے ان الفاظ میں منادی کرائی جاتی کہ اَلصَّلٰوةُ الْجَامِعَة اس پر لوگ اس اجتماع میں شرکت کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔

چونکہ مشاورت کی غایت، قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا تھا اس لئے اس کی ابتدا نماز کی شکل میں ہوتی۔ (جس طرح اب ہمارے ہاں رسمی طور پر جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے) اس سے ظاہر ہے کہ اجتماعات وقتِ مقررہ پر ہوتے تھے اسی لئے کہا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۵ (103/4)۔ یاد رکھو! صلوۃ مومنین کے لئے ایک موقت فریضہ ہے یعنی ایسا فریضہ جس کی وقت معین

پر ادائیگی کی جائے گی۔ بالفاظ دیگر جو وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو اس وقت اس اجتماع میں شرکت لازمی ہو گی۔

اگر ان اوقات کو خود خدا نے مقرر کر دیا ہے تو ان میں ردو بدل نہیں ہو سکے گا۔ البتہ ہنگامی ضرورت کے وقت (مقررہ اجتماعات کے علاوہ) ہنگامی اجتماع منعقد کئے جا سکیں گے۔ اگر ان کے اوقات خدا نے مقرر نہیں کئے۔ تو انہیں باہمی مشاورت سے مقرر کر لیا جائے گا۔ ان میں (باہمی مشاورت سے) ردو بدل ممکن ہو گا۔ (کیا ان اجتماعات کے لئے اوقات کا تعین خدا نے کر دیا ہوا ہے؟ اس کی بحث ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

ان اجتماعات کے لئے یہی بلاوا ہے جسے قرآن نے ندائے صلوۃ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ جمعہ میں ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (62/9) اے افراد جماعت مومنین! جب تمہیں یوم الجمعۃ کو صلوۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر مقام اجتماع کی طرف لپک کر آجایا کرو کیونکہ وہاں "اللہ کی باتیں" ہونگی (ان آیات کا پورا مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔) دوسری جگہ ہے وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا (5/58) مخالفین کی حالت یہ ہے کہ جب تم الصلوۃ جیسے اجتماع کے لئے منادی کرتے ہو تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ صلوۃ کے بعد مسجد میں جملہ معاملات طے پاتے تھے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب وصیت کے معاملہ میں کوئی متنازعہ فیہ امر فیصلہ طلب ہو تو صلوۃ کے بعد متعلقہ پارٹیوں کو وہاں روک لیا کرو تاکہ اس معاملہ کا قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے (5/106) ان اجتماعات میں شرکت کے لئے صفائی کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر غسل، وضو، اور تیمم وغیرہ کے احکامات دیئے ہیں۔ (4/43, 5/6) یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم ان اجتماعات میں پورے ہوش و حواس کے عالم میں شریک ہوا کرو کیونکہ وہاں بڑے اہم امور زیر بحث آئیں گے۔ جب تم اتنا بھی نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو تو ان اجتماعات میں شرکت فائدے کے بجائے الٹا نقصان کا موجب ہو گی (4/43)۔

جس شکل میں، ہم نماز ادا کرتے ہیں اس کی جملہ جزئیات اور تفاصیل کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔ ان میں سے صرف چند ایک کا اجمالی طور پر ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ بالفاظ دیگر، ان جزئیات کا تعین قرآن کریم میں نہیں کیا گیا۔

صلوۃ کے اوقات۔ (1) اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴿۷۸﴾ (17/78) اس آیت کا رواں ترجمہ یہ ہے کہ صلوۃ قائم کرو "دلوک شمس" سے لے کر "غسق لیل" تک اور قرآن الفجر۔ یاد رکھو قرآن الفجر بڑا مشہود ہوتا ہے۔ اس میں "دلوک شمس" اور "غسق لیل" کے الفاظ غور طلب ہیں۔ دلک کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔ اس کے بنیادی معنے حرکت کرنے کے ہیں۔ جب آفتاب بلندی کی طرف حرکت کرے تو اس کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے اور جب وہ روبہ انحطاط ہو کر غروب ہو جائے تو اس کے لئے بھی۔ اور غسقِ لیل، ابتدائے شب کی تاریکی کو کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب بلکہ غروب کے کچھ عرصہ بعد (غسق) تک کا سارا وقت اس میں آجاتا ہے۔ کتب تفاسیر میں، اس آیت کی تشریح میں اس قدر طول طویل لیکن باہمد گر متضاد باتیں کہی گئی ہیں کہ انہیں اختصاراً پیش کرنے کی بھی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم نے آیت پیش کر دی ہے اور ان الفاظ کے لغوی معانی بھی۔ آیت سے کم از کم اتنا تو واضح ہے کہ اس میں اوقات کا تعین نہیں کیا گیا۔ حالانکہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب اسے کسی بات کو متعین طور پر پیش کرنا مطلوب ہوتا ہے تو وہ اشارات اور کنایات سے کام نہیں لیتا اسے واضح، غیر مبہم، متعین (Specific) انداز سے بیان کرتا ہے لیکن اس آیت میں وہ متعین انداز اختیار نہیں کیا گیا۔

(2) سورئہ ہود میں ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ (11/114) اس کے عام معانی یہ ہیں کہ تم صلوۃ قائم کرو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے پہلے حصے میں۔ اسی طرح سورئہ طٰہٰ میں ہے وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِہَا ۚ وَ مِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ وَ اَطۡرَافَ النَّہَارِ (20/130) اس میں صلوۃ کا لفظ تو نہیں آیا تسبیح کا لفظ آیا ہے۔ لیکن عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی صلوۃ ہی مقصود ہے۔ اس میں، طلوع آفتاب اور غروب

آفتاب سے پہلے، دن کے دونوں اطراف اور رات کی گھڑیوں کا ذکر ہے۔ بات یہاں بھی متعین طور پر نہیں کہی گئی۔

یہ اور اس قسم کی چند ایک اور آیات سے عام طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ نماز کے مروجہ پانچ اوقات خود قرآن نے متعین کئے ہیں، لیکن عام دعوی یہی ہے کہ یہ اوقات رسول اللہ نے مقرر فرمائے تھے۔

(3) سورۃ النور میں مجلسی آداب کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھروں میں کام کرنے والے بچے، بے محابا گھر میں گھوم پھر سکتے ہیں، بجز ان تین اوقات کے یعنی مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوةِ الۡفَجۡرِ وَ حِيۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِيَابَكُمۡ مِّنَ الظَّهِيۡرَةِ وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوةِ الۡعِشَآءِ ط ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّـكُمۡ (24/58) صلوۃ الفجر سے پہلے اور صلوۃ العشاء کے بعد اور دوپہر کے وقت، کیونکہ ان اوقات میں تم بے تکلف کپڑے وغیرہ اتار کر بیٹھے یا لیٹے ہوتے ہو۔ اس آیت میں فجر اور عشاء کی نمازوں کا ذکر بالتصریح آیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں دو نمازیں اسی طرح متعارف تھیں۔ اگرچہ قرآن کریم میں حکم کے طور پر ان کا بھی ذکر نہیں آیا۔

(4) سورۃ بقرہ میں، پہلے طلاق وغیرہ کے مسائل کا ذکر ہے اور اس کے بعد ہے حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى وَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِيۡنَ ۵ (2/238) تم اپنی صلوۃ (بصیغہ جمع) کی حفاظت کرو اور "صلوۃ الوسطی" کی۔ اس میں "صلوۃ الوسطی" کے معنی درمیانی نماز کئے جاتے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ وہ ایک طرف فجر اور ظہر اور دوسری طرف مغرب اور عشاء کے درمیان آتی ہے۔ (میرے نزدیک اس آیت کا کیا مفہوم ہے، اسے اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔)

رکعات۔ جہاں تک رکعات کا تعلق ہے انہیں بھی قرآن کریم نے متعین طور پر بیان نہیں کیا۔ سورۃ النساء میں اتنا بتایا گیا ہے کہ جنگ کی حالت میں، جب تمہیں دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو تو نماز کو اس طرح ادا کرلینا

چاہیئے کہ مجاہدین کا ایک گروہ امام (یعنی رسولؐ اللہ) کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار سنبھالے رکھے۔ جب یہ سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہٹ جائیں اور دوسرا گروہ جس نے ابھی تک صلوۃ ادا نہیں کی ۔ امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ یہ بھی اسی طرح اپنے ہتھیار سنبھالے رکھیں۔(4/101-102) سورۃ بقرہ میں کہا گیا ہے فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَا اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۵ (2/239) یعنی جب تم حالت خوف میں ہو تو پھر پاپیادہ یا گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے ذکر کر لیا کرو۔ اور جب تم حالت امن میں ہو تو پھر جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے اس طرح کرو۔

رکعتوں کے متعلق قرآن کریم کی انہی آیات میں اشارات ملتے ہیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ ان کے متعلق مختلف فرقوں میں اختلاف ہے۔ یعنی ہر نماز میں اتنی رکعتیں فرض، اتنی سنت، اتنی نفل وغیرہ میں ان اختلافات کو بھی بڑا دخل حاصل ہے [میں ان آیات کی تشریح (اپنی بصیرت کے مطابق) متعلقہ مقامات پر کروں گا]

اذکار صلوٰۃ۔ جہاں تک نماز میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کی بھی صراحت نہیں کی ۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت (17/110) میں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا تم اپنی صلوۃ میں نہ تو بلند آواز اختیار کرو اور نہ بالکل خاموشی۔ بلکہ ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کرو۔ بعض لوگ یہاں صلوۃ سے مراد نماز لیتے ہیں اور بعض دعا۔ (کیونکہ صلوۃ کے معنے دعا بھی ہیں۔)

سورۃ التوبہ میں منافقین کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (9/84) تم ان میں سے کسی کی میت پر بھی دعا نہ کرو اور نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہو۔ اس آیت سے نماز جنازہ مراد لی جاتی ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمِنَ الَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ (17/79) اے رسولؐ! تم رات میں بھی کچھ وقت کے لئے جاگا کرو لیکن یہ حکم صرف تمہارے لئے ہے۔ اس سے تہجد کی نماز مراد لی جاتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ رسولؐ کے لئے مخصوص تھی، اور وہ بھی فریضہ کے طور پر نہیں بلکہ نفل کے طور پر۔

میری بصیرت کے مطابق، قرآن کریم میں نماز کی تفاصیل کے متعلق یہی کچھ آیا ہے۔ میں نے تعین جزئیات کے جس اصول کا پہلے ذکر کیا ہے اس کی رو سے میرے لئے اس باب میں مزید کاوش کی ضرورت نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ صلوٰۃ کا اصولی حکم وحی کی رو سے حضورؐ کو دیا گیا تو آپؐ نے قرآنی اصول کے مطابق باہمی مشاورت سے اس کے لئے مکمل پروگرام متعین فرمایا ہو گا۔ قرآن کریم کے یہ ارشادات اسی پروگرام کے تضمنات نظر آتے ہیں۔ جس حکم کی جزئیات قرآن کریم خود متعین کرتا ہے اس میں اس کا انداز کیا ہوتا ہے اس کی کچھ مثالیں پہلے پیش کی جاچکی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے سورۃ بقرہ کی آیات (2/282-283) ہیں (اور آیت نمبر 282 تو غالباً قرآن کریم کی سب سے لمبی آیت ہے) اس میں کہا گیا ہے کہ جب تم باہمی قرض کا معاملہ کرو تو اس کے لئے کیا طریق اختیار کرو۔ آپ دیکھئے قرآن کریم نے اس پروگرام کو کس وضاحت اور تصریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب لین دین کے معاملات کی جزئیات میں اس کا یہ انداز ہے تو صلوٰۃ جیسے بنیادی فریضہ کے سلسلہ میں جزئیات کے تعین کے لئے اس نے ایسا ہی انداز کیوں نہ اختیار کیا؟ تعجب ہے کہ اس نے وضو کے متعلق تو ایسا تفصیلی حکم دیا کہ منہ دھوؤ۔ کہنیوں تک ہاتھ دھوؤ۔ سر کا مسح کرو، پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ۔ جنبی حالت میں یوں کرو۔ مسافر اور مریض ہونے کی صورت میں ایسا کرو۔ پانی نہ ملے تو کیا کرو۔ (5/6) تمہید صلوٰۃ کے متعلق تو اس قدر تفصیلی احکام آئے لیکن خود صلوٰۃ کے سلسلہ میں اس طرح متعین طور پر کوئی حکم نہیں دیا۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ۔۔۔ان جزئیات کو (دانستہ) غیر متعین رکھنا چاہتے تھے۔

موجودہ نماز تفرقہ کا مظہر ہے۔ متقدمین میں سے جن فرقوں نے نماز کی جزئیات کا تعین کیا، انہوں نے ان کی بنیاد احادیث یا فقہ پر رکھی۔ لیکن ان جزئیات میں جس قدر اختلاف ہے وہ مختلف فرقوں کی نماز سے ظاہر ہے۔ اس

مقام پر ایک اور حقیقت بھی قابل غور ہے۔ قرآن کریم نے الصلوۃ کو امت میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اس نے سورۃ روم میں کہا کہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۵ لا مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَھُمۡ وَکَانُوۡا شِیَعًا ط کُلُّ حِزۡبٍ مبِمَا لَدَیۡھِمۡ فَرِحُوۡنَ ۵ (30/31-32) تم صلوۃ قائم کرنا اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا۔ فرقوں میں بٹ گئے اور پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ یہ سمجھنے لگ گیا کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ گویا قرآن کریم نے صلوۃ کو امت میں۔۔۔ وحدت پیدا کرنے اور وحدت بر قرار رکھنے کا ذریعہ بتایا تھا لیکن وائے بد نصیبی کہ اب وہی صلوۃ (نماز کی شکل میں) امت کے تفرقہ کا مظہر قرار پا گئی ہے۔ کسی جلسہ میں دس ہزار مسلمان بیٹھے ہوں۔ ان میں فرقہ بندی کی کوئی محسوس علامت سامنے نہیں آئے گی۔ سب ایک امت کے افراد دکھائی دیں گے لیکن اس دوران میں اگر نماز کی اذان سنائی دے تو ان میں سے ایک ٹولی ایک مسجد کا رخ کرے گی۔ دوسری ٹولی دوسری مسجد کا۔ اور اس طرح ان کے گروہ مندانہ اختلافات ابھر کر سامنے آجائیں گے اور ان اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہو گا کہ ایک فرقہ سے متعلق مسلمان کو دوسرے فرقہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر وہ بھولے بھٹکے دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے گا تو دہائی مچ جائے گی کہ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

لیکن چونکہ یہ فرقے اس امر کے مدعی ہیں کہ نمازوں کی یہ باہمد گر مختلف جزئیات احادیث یا فقہ کی رو سے متعین ہوئی ہیں۔ اس لئے اس اختلاف کی زد قرآن کریم پر نہیں پڑتی، لیکن ہمارے دور میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا ہے جس نے براہ راست قرآن کریم کو اس طرح اپنا ہدف بنایا ہے کہ اس کا یہ دعوی، کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے (معاذاللہ) باطل ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن کریم کا دعوی ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ وَلَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا (4/82) کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کئی اختلافی باتیں پاتے۔ بالفاظ دیگر، قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے دعوی کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

فرقہ اہل قرآن۔اس فرقہ، جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جو (برعکس نہند نام زنگی کافور، اپنے آپ کو اہل قرآن کہہ کر پکارتا ہے) دعوی یہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام احکام کی جملہ تفصیلات و جزئیات خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے نماز کی جزئیات کو لیا ہے۔میں کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑے بغیر صرف اتنا بتادینا کافی سمجھتا ہوں کہ ان کی اس سعی نامشکور کا نتیجہ کیا نکلا۔اس فرقہ کے بانی تھے (مولانا) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم)۔اور ان کے متبعین کا ایک گروہ لاہور میں مقیم ہے۔ان دونوں نے نماز کی جزئیات (اپنے دعوی کے مطابق) قرآن کریم سے متعین کی ہیں۔اور ان کی دریافت کردہ جزئیات کی کیفیت یہ ہے:۔

مولانا چکڑالوی	لاہوری فرقہ
۱۔پانچ وقت کی نماز	۱۔تین وقت کی نماز
۲۔نماز میں دو، تین۔چار رکعتیں	۲۔نماز کی صرف دو رکعتیں
۳۔ہر رکعت میں دو سجدے	۳۔ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ

جہاں تک اذکار صلوۃ کا تعلق ہے وہ بھی بالکل نرالے ہیں۔اگرچہ وہ مشتمل ہیں قرآنی آیات ہی پر۔

اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جس قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں نماز کی جزئیات تک میں اس قدر اختلاف ہے تو اسے منزل من اللہ کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ تو سوچئے کہ اس کا کیا جواب دیا جاسکتا ہے؟ اور اگر یہ دونوں گروہ (مقتدیٰ اور مقتدی) آپس میں جھگڑنے لگ جائیں اور ایک دوسرے پر الزام دھریں کہ اس نے قرآن کو صحیح نہیں سمجھا تو اس سے ایک اور اعتراض وارد ہو گا جو پہلے اعتراض سے زیادہ نہیں تو کم سنگین بھی نہیں ہو گا، معترض کہے گا کہ قرآن کا دعوی یہ ہے کہ وہ کتاب مبین (روشن کتاب) ہے اور اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔لیکن عملاً اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنے حکم میں تعداد تک کو بھی غیر مبہم انداز سے بیان نہیں کر سکتا۔وہ جس انداز سے تعداد بتاتا ہے اس سے ایک شخص پانچ وقت سمجھتا ہے تو دوسرا

تین وقت، کوئی دو۔ تین۔ چار رکعتیں سمجھتا ہے، کوئی صرف دو رکعت۔ کوئی دو سجدے سمجھتا ہے کوئی ایک۔ بسیط حقائق (Abstract Realities) کے متعلق تو انسانوں کا فکری اختلاف قابل فہم ہوتا ہے کیونکہ انہیں تشبیہی انداز میں بیان کیا جاتا ہے، لیکن جس کتاب کے متعین احکام و قوانین کے متعلق یہ انداز ہو، اسے خدا کی کتاب سمجھنا تو درکنار (معاذاللہ) انسانی تصانیف میں بھی قابل قدر مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے قرآن کریم پر کتنی بڑی زد پڑتی ہے۔ انتہائی صدمہ اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں نے قرآن کا نام لے کر قرآن کے ساتھ کس قدر دشمنی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے خصوصیت سے ان کے نظریہ اور مسلک کی تردید کرنی پڑی۔

لیکن یہ سب کچھ کہہ سن چکنے کے بعد عملی زندگی کی طرف آیئے۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز کی جزئیات میں اختلاف ہے اور یہی اختلاف ان کی فرقہ بندی کا آئینہ دار ہے۔ دوسری طرف قرآن کریم نے وحدت امت کو دین کی اساس قرار دیا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں؟ اور کیا اس امت میں پھر سے وحدت پیدا ہو سکتی ہے؟

پس چہ باید کرد۔ ان اختلافات کی سند یا تائید میں ہر فرقہ اپنے اپنے ہاں کی روایات یا فقہی فیصلے پیش کرتا ہے۔ یہ روایات یا فقہی اجتہادات اس اختلاف کی سند تو قرار پاسکتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اس نظام کا موجود نہ رہنا ہے۔ جس سے دین کا قیام اور امت کی وحدت وابستہ تھی۔ جب ان اختلافات کی بنیادی وجہ یہ ہے تو پھر ان کے رفع ہونے کی بھی اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہو سکتی کہ اس نظام کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ اس مقام پر اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ محض خوابوں کی دنیا میں بسنا ہے۔ وہ نظام دوبارہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کہنا، یا تو خود فریبی ہے اور یا فریب دہی۔ خود فریبی ہو یا فریب دہی۔ قرآن کریم نے بہر حال اس کے متعلق پہلے ہی وارننگ دیدی تھی کہ اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ یہ نظام رسولؐ اللہ کی زندگی تک قائم رہ سکتا ہے اس کے بعد نہیں تو اس کا مطلب دین سے ارتداد ہو گا۔ اس نظام کا دوبارہ قائم کیا جانا ممکن بھی ہے اور آسان بھی۔ جو مملکت ایمان

کی بنیادوں پر، یہ فیصلہ کرلے کہ اس کے جملہ امور (جن میں مذہبی اور غیر مذہبی کی کوئی تمیز و تفریق نہ ہو گی) قرآن مجید کے مطابق سرانجام پائیں گے اور اس کے بعد وہ اس پر عمل کرنا بھی شروع کر دے، تو وہ مملکت علی منہاج رسالت کہلائے گی۔ اس کے لئے شرط اولین یہ ہے کہ جن ذمہ دار افراد کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہو وہ خود اقدار خداوندی کے پابند ہوں۔ اس مملکت کا فریضہ یہ ہو گا کہ جو کچھ اس وقت اسلام کے نام سے مروج ہے، وہ اسے قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھے۔ جو اس پر پورا اترے اسے اختیار کرلے۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی راہنمائی ایسی واضح ہے کہ اس قسم کی پرکھ ناممکن تو ایک طرف، چنداں مشکل بھی نہیں۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ارباب مذہب کے پاس اس وقت بھی قرآن موجود ہے تو اس کے باوجود ان میں وحدت پیدا کیوں نہیں ہوتی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان امور کی پرکھ کے لئے قرآن کریم کو کسوٹی نہیں بنایا جاتا۔ بہت کچھ خارج از قرآن ہے جسے سند اور معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور یہی ان اختلافات کی وجہ ہے۔ جب قرآن کریم کا دعوی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں تو اسے معیار قرار دینے سے اختلافات کس طرح باقی رہ سکتے ہیں۔

جہاں تک قرآنی اصول و احکام کی جزئیات کا تعلق ہے، وہ نظام، ان کی بھی جانچ پڑتال کرے گا۔ جو جزئیات ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں گی انہیں علی حالہ رہنے دے گا، جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو گی، انہیں تبدیل کر دیگا۔ اور عند الضرورت ان میں نئی نئی جزئیات کا اضافہ بھی کرتا جائے گا۔ اس طرح ثبات و تغیر کے امتزاج کا قرآنی پروگرام پھر سے بروئے کار آجائے گا۔

جب تک یہ نظام قائم نہیں ہو جاتا، میرا مسلک ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس انداز سے ان پر کاربند ہیں وہ ان پر اسی انداز سے کاربند رہیں۔ لیکن ان میں ایسی شدت نہ برتی جائے کہ وہ باہمی نفرت اور عداوت کا موجب بن جائیں۔ نیز کسی فرد یا فرقہ کو اس کا حق نہیں ہونا چاہئے کہ وہ مروجہ ارکان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے۔ اس سے امت میں مزید تفرقہ اور انتشار پیدا ہو گا۔ ان جزئیات میں

حک و اضافہ یا تغیر و تبدل کا حق صرف اسلامی نظام کو حاصل ہوتا ہے۔ ختم نبوت کے بعد کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ امت سے آکر کہے کہ خدا نے مجھ سے یوں کہا ہے اس لئے تم اب ایسا ہی کرو۔ ایسے شخص کا یہ دعوی ہی باطل ہے کہ "خدا نے اس سے یوں کہا ہے۔" خدا نے انسانوں سے جو کچھ کہنا تھا اسے اس نے آخری بار قرآن کریم میں کہہ دیا اور بس۔"

(مطالب الفرقان، جلد اول، صفحہ 98-101, 122-137)

"ہمارے مذہبی اجتماعات۔ سلیم! تم سمجھتے ہو کہ ایسے انقلاب در آغوش افراد کی یہ جماعت دنیا میں کیا کچھ نہ کر سکتی ہو گی۔ لیکن اس کے بعد ذرا ایک مرتبہ اس "ہجوم مومنین" کی نماز پر پھر نگاہ ڈالو۔ ساری نماز پر نہیں۔ نماز کے صرف ایک ٹکڑے پر۔ ذرا سوچو کہ پچاس ساٹھ ہزار انسانوں کا گروہ، اللہ کے سامنے، روبہ قبلہ، مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اقرار کر رہا ہو کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ اے اللہ! ہم صرف تیری محکومیت کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے سوا ہر قسم کی غلامی کا طوق ہم پر حرام ہے۔ لیکن زبان سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہو اور دماغ سینکڑوں خداؤں کا بتکدہ بن رہا ہو۔ تو اس دعوی کو تم خدا فریبی اور خود فریبی نہ کہو گے تو اور کیا سمجھو گے؟ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ان لوگوں نے نماز نہیں پڑھی بلکہ اپنے آپ سے غداری اور خدا سے دھوکہ کیا ہے تو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کے "حاملان دین متین" لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ اس میں ان بیچاروں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ اس لیے کہ انہیں بتایا ہی یہ گیا ہے کہ اگر ہاتھ فلاں مقام پر باندھ لئے جائیں۔ پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا جائے۔ انگلیوں کا رخ فلاں سمت کو ہو۔ سجدے میں فلاں فلاں حصے پہلے زمین بوس ہوں۔ الفاظ اپنے صحیح مخرج سے نکلیں، تو نماز ہو جاتی ہے۔ اور جب پوچھو کہ اس بات کی کیا سند ہے کہ اس سے نماز واقعی ہو جاتی ہے۔ اور اس سے وہ مقصد پورا ہو گیا ہے جس کے لیے صلوۃ کو فرض قرار دیا گیا تھا۔ تو جواب مل جاتا ہے کہ اس کا علم تو قیامت ہی کو ہو سکے گا۔ کیونکہ دنیا دارالعمل ہے۔ نتیجہ یہاں برآمد نہیں ہو سکتا۔ اور جب ان سے کہو کہ بھائی۔ اللہ تو ایمان و عمل کی جزاء استخلاف فی الارض اور وراثت زمین فرماتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اس ارض سے

مراد جنت کی زمین ہے۔ لیکن سلیم! ان باتوں کو تم کسی سے نہ پوچھو۔ قرآن تمہارے سامنے ہے۔ انسانیت کے معراج کبری کے دور ہمایوں کی تاریخ اس کے اندر ہے۔"

(سلیم کے نام خطوط، جلد اول صفحہ 10)

آگے روزوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اے ایمان والو! جب تم کسی جماعت کے مقابلہ میں جائو تو ثابت قدم رہو۔ اور قانون خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھو۔ تا کہ تم کامیاب ہو جائو۔ اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور آپس میں مت جھگڑو۔ ورنہ تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو استقامت کا ثبوت دیں۔(8/45-46)

سلیم! سنتے ہو کہ یہ ہدایات کیا ہیں؟ یہ زندگی کا پیغام ہیں۔ یہ اسلام کی روح ہیں۔ یہ ایک عبد مومن کے اظہار عبودیت کا حقیقی مفہوم ہیں۔ یہ صرف بدر کے موقع کے وقتی احکام نہیں۔ بلکہ جب تک حق وباطل میں آویزش کا امکان ہے۔ جب تک خیر و شر کا مقابلہ ہے۔ جب تک شرار بولہبی، چراغ مصطفویؐ سے ستیزہ کار ہے۔ اس وقت تک کے لئے تمام مسلمانان عالم کے واسطے ایک دستور اساسی ہیں۔ ایک لائحہ عمل ہیں۔ یہی ہدایات ہیں۔ جن کے لئے رمضان کے روزے اور ان روزوں کا جمعۃ الوداع ہے۔

سلیم! اب تم خود فیصلہ کرو کہ صحیح نتائج پیدا کرنے والے روزے اور نمازیں ان تین سو مسلمانوں کی تھیں یا اس ساٹھ ستر ہزار کے رسمی اجتماع کی جس میں مقصد اور روح کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ سو بھائی نادان کیوں بنتے ہو؟ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ سحری اور افطاری کے گولے قلعہ کی دیواریں نہیں ڈھاسکتے۔ ہر چندان کا دھماکہ اور دھواں اصلی گولوں کا سا ہو۔"

(سلیم کے نام خطوط، جلد اول، صفحہ 12-13)

''سلیم! اب تمہاری آخری بات کا جواب رہ گیا کہ جب ہمارے ان اجتماعات میں آج وہ روح اور مقصد نہیں رہا تو پھر ان کے باقی رکھنے سے فائدہ کیا؟ تمہارے دل میں اس سوال کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اچھا ہوا تم نے اسے ابھی پوچھ لیا۔ عزیزم! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ چیزیں (اپنی روح اور مقصد کو کھو دینے کے بعد) ہمارے قومی شعائر سی بن چکی ہیں۔ اگر قومی شعائر نقصان رساں نہ ہوں (اور نہ ہی وہ قرآن کریم کی تعلیم سے ٹکرائیں) تو ان کا باقی رکھنا اچھا ہوتا ہے۔ ان سے بھی ایک حد تک اجتماعیت کی شکل باقی رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کبھی ہماری قسمت نے پلٹا کھایا اور ہم میں اس انقلاب کا احساس بیدار ہوا جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے تو ان ہی بے جان پیکروں میں پھر سے روح آ جائے گی۔ اور یہ مناسک و شعائر جس نظام کی یادگار ہیں اسکے از سر نو قیام میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہیں جمعۃ الوداع کے خطبہ میں باتیں کرنے سے منع کیا تھا۔ اگرچہ خطیب کا ایک لفظ بھی تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور اگر پہنچتا بھی تو تمہیں اس سے کچھ فائدہ نہ تھا کہ وہ عربی زبان میں تھا اور تم عربی جانتے نہ تھے۔ اور اگر جانتے بھی ہوتے تو بھی اس میں تمہیں کوئی بات مسائل حاضرہ کے متعلق نہ مل سکتی، کہ ان کے نزدیک خطبہ ایک حکم شرعی ہے جس کی ادائیگی سے محض ''ثواب'' ہوتا ہے۔ مفہوم اور معانی سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ (سلیم کے نام خطوط، جلد اول، صفحہ 15-16)

تمسک بالکتاب یعنی قانون خداوندی کا عملاً اتباع ناممکن ہے۔ جب تک دین کا نظام عملاً جاری و ساری نہ ہو۔ اور چونکہ اقامت صلوۃ بھی اسی نظام سے وابستہ ہے۔ اس لئے اقامت صلوۃ بغیر تمکن فی الارض (یعنی کسی خطہ زمین میں قرآنی حکومت قائم کئے بغیر) ناممکن ہے۔ سورۂ حج میں دیکھو، کس قدر واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جب ہم ان لوگوں کو جو قرآنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ الصلوٰۃ قائم کریں گے اور الزکوۃ کا انتظام کریں گے (22/41) استخلاف فی الارض اور تمکن دین کو ''اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ'' سے مشروط ٹھہرایا گیا ہے۔ (24/55-56)

ذرا آگے چل کر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں۔

غور کرو سلیم! اگر قیام صلوۃ سے مقصود محض ہماری رسمی نمازیں ہوں تو ان کے لئے تمکن فی الارض، یعنی ملک میں قرآنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ نمازیں تو ہم انگریزوں کی غلامی میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ اور آج بھی ہندوستان کے مسلمان اسی طرح پڑھ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ قرآن نے اقامت صلوۃ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے۔ ہماری ان نمازوں سے ہمیں کب استخلاف ملا؟ سورۃ بقرہ میں دیکھو۔ اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ کا لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۵(2/271) ان لوگوں پر جو نظام صلوۃ و زکوۃ کو قائم کریں گے ''کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہو گا۔'' ذرا غور کرو کہ کیا ہماری نمازیں اور اڑھائی فی صد والی زکوۃ یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہے۔ کہ ہمیں کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو۔ صلوۃ کے متعلق سورئہ عنکبوت میں بیّن الفاظ میں ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآئِ وَالْمُنْکَرِ(29/45) یقیناً صلوۃ فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ سلیم! اس حتم اور یقین کو سامنے رکھو جس کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ صلوۃ فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے اور پھر اس کے بعد دیکھو کہ کیا ہماری موجودہ نمازیں یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہیں۔۔۔۔

یہاں پہنچ کر سلیم! تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ نماز کے نام سے جو کچھ آج مسجدوں میں کیا جاتا ہے کیا اس کی بھی کچھ اصلیت ہے؟ اس کا جواب ''ہاں'' میں بھی ہے اور ''نہیں'' میں بھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ فوج کے سپاہی کی ساری زندگی سپاہیانہ ہوتی ہے۔ لیکن بایں ہمہ کچھ وقت کے لیے ہر روز ہر سپاہی کو ان فرائض کی یاددہانی اور مشق کے لئے ایک میدان میں بلالیا جاتا ہے جو انہیں میدان جنگ میں ادا کرنے ہوتے ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ایک نفسیاتی کیفیت (Psychology) افراد کی ہوتی ہے اور ایک اجتماع کی، جسے (Mass Psychology) کہا جاتا ہے۔ اجتماع اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ لیکن اجتماعی نفسیات افراد کی نفسیات سے الگ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اجتماعی نفسیاتی کیفیت افراد کی نفسیاتی کیفیتوں کا حاصل جمع (Sum total) نہیں ہوتی۔ اس سے کہیں زیادہ اور منفرد نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اسلام نے دین کے نظام کی یاددہانی کے

لیے صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات کو تجویز کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اجتماعات اس نظام کے لاینفک پرزے ہیں۔ لیکن اگر نظام مفقود ہو اور ہم رسمی طور پر الگ الگ یا مساجد میں جمع ہو کر رکوع اور سجود کر لیا کریں تو اس کی مثال اسی سگنل کے کھمبے یا ریل کی پٹڑی کے ٹکڑے کی سی ہو گی۔ جو ریل بند ہو جانے کے بعد اسی بستی میں پڑے ہوئے تھے۔ ذرا سوچو سلیم! ایک سپاہی کے لئے وردی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی سپاہی فوج سے برطرف ہو جانے کے بعد اپنے گائوں میں ہر روز صبح اٹھ کر نہایت احتیاط اور التزام سے اپنے بوٹ کے تسموں سے لے کر سر کی ٹوپی تک ہر شے نہایت باقاعدگی سے پہنے اور بندوق کی جگہ ڈنڈا اٹھا کر چپ راست بھی کرتا رہے تو اس کا یہ عمل فی ذاتہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرے گا۔ حالانکہ فوج کے اندر ان میں سے ہر شے مجموعی نتائج مرتب کرنے کے لئے لاینفک تھی۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی بنا پر میں نے کہا کہ نماز کی یہ ظاہری شکل و صورت اپنی اہمیت رکھتی بھی ہے اور نہیں بھی۔ جب یہ نظامِ دین کا جزو بنتی ہے تو اس کی ہر حرکت خاص اہمیت رکھتی ہے اور جب اسے نظام سے الگ نکال لیا جاتا ہے تو ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔

یہ ہے فرق سلیم! "مذہب" کی نماز اور دین کی صلوٰۃ میں "مذہب" کی نماز محض ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے اور دین کی صلوٰۃ انسانیت کے ارتقاء کا موجب ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو پھر سن لو کہ اقامت صلوٰۃ کے معنی ہیں اپنی ساری زندگی کو قوانین خداوندی کے اتباع میں گزار دینا۔ لیکن صلوٰۃ کے اجتماعات دین کے نظام کا ایک اہم جزو ہیں۔ اس لئے ان کا قیام بھی نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اجتماعات اسی صورت میں صحیح نتائج مرتب کرتے ہیں۔ جب وہ دین کے نظام کا جزو بن جائیں۔ (سلیم کے نام خطوط، جلد اول، صفحہ 152-155)

صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ چنانچہ صَلَّی الْفَرَسُ تَصْلِیَۃً اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں دوسرے نمبر کا گھوڑا، پہلے نمبر کے گھوڑے کے عین پیچھے مسلسل دوڑ رہا ہو۔ پہلے نمبر والے گھوڑے کو سَابِقٌ کہتے ہیں۔ اور اس کے پیچھے چلنے والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّیْ۔ اس سے صَلّٰی کے بنیادی معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی کسی کے پیچھے چلنے والا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی روایت میں ہے۔ سَبَقَ رَسُوْلُ

اللّٰہِ۔ وَصَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ وَثَلَّثَ عُمَرُ (بحوالہ تاج العروس) "رسول اللہ پہلے تشریف لے گئے۔ ان کے پیچھے حضرت ابو بکرؓ اور پر تیسرے نمبر پر حضرت عمرؓ۔

امام راغب نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں جو ہے لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (43/74) ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ان تصریحات سے صلوۃ کا بنیادی اور جامع مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کا پورا پورا اتباع۔ خدا کی راہنمائی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ یہ اتباع زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود نہیں۔ بلکہ انسان کی پوری کی پوری زندگی اس کے اندر آجائے گی۔ اس لئے اس کے معنی ہونگے زندگی کے ہر شعبے میں قوانین خداوندی کا اتباع۔ ان فرائض منصبی کی تکمیل جو انسان پر ان قوانین کی رو سے عائد ہوتے ہیں۔ وہ نظام جس کے اندر رہتے ہوئے انسان ان فرائض کی تکمیل کر سکتا ہے۔ دین کہلاتا ہے۔ لہٰذا صلوۃ کا نظام، دین کا پورا نظام ہو گا۔ صلوۃ کے اجتماعات (جنہیں نماز کہا جاتا ہے) اسی نظام کا ایک حصہ ہیں۔ یہ درحقیقت عملی مظاہرہ ہے اس ایمان کا کہ ہم نے اپنی پوری زندگی قوانین خداوندی کے تابع بسر کرنی ہے۔ اور ان کے سوا کسی قانون اور فیصلے کے سامنے نہیں جھکنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ صلوۃ کا تصور صرف اجتماعات نماز تک محدود نہیں بلکہ انسان کی ساری زندگی کو محیط ہے۔ یعنی جب ہم نماز ادا کر لیں تو ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم فریضہء صلوۃ سے بالکلیہ فارغ ہو چکے ہیں۔ ہمیں سمجھنا یہ چاہیئے کہ ہم نے فریضہء صلوۃ کے ایک حصہ کو ادا کیا ہے۔ اس کی تکمیل اس وقت ہو گی جب ہم اپنی پوری زندگی نظام خداوندی کے تابع بسر کریں اور اسی طرح بسر کرتے جائیں تا آنکہ ہماری دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہو جائے فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ٥ (2/132) یہ بات کہ صلّٰی کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں۔ قرآن کریم نے خود واضح کر دیئے ہیں۔ چنانچہ سورۂ القیٰمۃ میں ہے۔ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (75/31-32) یہاں دیکھو صَدَّقَ کے مقابلے میں کَذَّبَ آیا ہے۔ (صَدَّقَ کے معنی ہیں تصدیق کرنا۔ سچ کر دکھانا۔ اور کَذَّبَ کے معنی ہیں تکذیب کرنا۔ جھٹلانا) اور صلّٰی کے مقابلے میں تولّٰی آیا ہے۔ تولّٰی کے معنی ہیں گریز کی راہیں نکالنا۔ پھر جانا۔ لوٹ جانا۔ اس سے

ظاہر ہے کہ صلّٰی اس روش کی ضد ہے۔ جس میں انسان سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے اس سے پھر جاتا ہے۔ یا گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ یہاں واضح ہے کہ صلّٰی کے معنی (خود قرآن کی رو سے بھی) کسی کے پیچھے سیدھے راستے پر چلنا ہے۔ دوسرے مقام پر خود صلوۃ کا لفظ بھی انہی معنوں میں آیا ہے۔ سورۂ نور میں کائنات کی مختلف اشیاء کے اجمالی اور پرندوں کے خصوصی ذکر کے بعد کہا ہے۔ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ (24/41) ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی صلوۃ اور تسبیح کو جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلوۃ کے معنی وہ نماز نہیں جو مساجد میں ادا کی جاتی ہے بلکہ اس کے معنی وہ فرائض منصبی جو ان اشیائے کائنات کے ذمے لگائے گئے ہیں۔ یعنی اس قانون کا اتباع جس کے مطابق چلنے کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ (تسبیح کے معنی ہیں فرائض کی تکمیل میں پوری پوری جدوجہد کرنا)۔ یہ وجہ ہے کہ میں اقامت صلوۃ کا ترجمہ نظام صلوۃ کا قیام کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہر جگہ "اقیمو الصلوۃ" کا حکم دیا ہے تو اس سے مراد نظام صلوۃ قائم کرنا ہے۔ نظام خداوندی کا قیام۔ نماز کے اجتماعات اس نظام کے اندر آجاتے ہیں۔ لیکن صلوۃ کا فریضہ ان اجتماعات تک محدود نہیں۔ ان سے باہر بھی ہے بالفاظ دیگر خدا کی عبادت مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔ انسان جب اجتماع صلوۃ میں شریک ہوتا ہے تو اس وقت بھی اقامت صلوۃ کر رہا ہوتا ہے۔ اور اس سے فارغ ہو کر جب زندگی کے دوسرے معاملات میں قانون خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ تو اس وقت بھی اقامت صلوۃ ہی کرتا ہے۔ یہ چیز کہ صلوۃ کا دائرہ زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے۔ خود قرآن سے واضح ہے۔ سورۂ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم نے آپ سے کہا کہ یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (11/87) اے شعیبؑ! کیا تیری صلوۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں جن کی محکومیت (عبودیت) ہمارے آباء اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مال و دولت کا قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا بھی صلوۃ کے اندر داخل ہے۔ امید ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ صلوۃ سے مطلب نماز کے اجتماعات نہیں (لفظ نماز عربی زبان کا نہیں قدیم فارسی زبان کا ہے۔) میں یہ کہتا ہوں کہ یہ اجتماعات بھی فریضہء صلوۃ کے اندر داخل

ہیں۔ لیکن یہ فریضہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی پوری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ جو انسان نماز کے اجتماعات میں شریک نہیں ہوتا۔ وہ بھی تارکِ صلوۃ ہے اور جو کسی معاملہ میں قانون خداوندی کی اطاعت نہیں کرتا وہ بھی تارکِ صلوۃ ہے۔ میں اس نقطہ پر زور اس لیے دیتا چلا آتا ہوں کہ جب ہم نماز پڑھ لیتے ہیں۔ تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ہم اقامت صلوۃ کے فریضہ سے کلیۃً فارغ ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اقامت صلوۃ کے صرف ایک گوشے سے فارغ ہوئے ہیں۔ یہ فریضہ مکمل طور پر اس وقت ادا ہوگا جب ہم اپنی ساری زندگی خدا کے قانون کے تابع بسر کریں گے۔ فقط نماز پڑھ لینا اور باقی زندگی خدا کے احکام کے خلاف گزارنا ہمیں مصلّی نہیں بنا سکتا۔ مصلّی وہی ہے جو ساری زندگی خدا کے قانون کے پیچھے چلے۔

(سلیم کے نام خطوط، جلد اول، صفحہ 154-161)

یہ تھا پرویز صاحب کا موقف صلوۃ (نماز) کے متعلق، ہم سب سے پہلے ان چند موضوعات پر بات کریں گے جن کا تعلق بالواسطہ مذہبی مناسک سے ہے۔ صلوۃ عبادت کا نقطہ ء معراج ہے۔ عبادت کے لیے اردو میں پرستش اور پوجا پاٹ کے الفاظ ہیں جو اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک معنی دے رہے ہیں۔ مگر پرویز صاحب نے ان الفاظ (پرستش۔ پوجا) کو منفی پیرائے میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ پرستش اور پوجا تو بتوں کی کی جاتی ہے جبکہ خدا کی عبادت کچھ علیحدہ چیز ہے۔ سب سے پہلے ہم ان موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں اور اس کے بعد صلوۃ (نماز) پر تفصیلاً بات کریں گے۔

عبادت

سب سے پہلے عبادت کے بارے میں پرویز صاحب کا نقطہ ء نظر دیکھتے ہیں۔

''اس کا مادہ (ع۔ب۔د) ہے جس سے لفظ ''عبد'' آتا ہے اور جیسا کہ معلوم ہے عبد کے معنے غلام اور محکوم کے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ٹھیک غلامی اور محکومی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ ''الشعراء'' میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دے تو اس نے ان سے کہا کہ ''موسیٰؑ! ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم ہمیں ان احسانات کا بدلہ یوں دے رہے ہو۔'' اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ تمہارے احسانات یہی ہیں ناں کہ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (26/22) تم نے میری قوم کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ (یہاں ''عَبَّدۡتَّ'' کے معنی واضح ہیں) دوسری جگہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون اور اس کے اکابرین کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُہُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ۵ (23/47) کیا ہم ان کی بات مان لیں، جو ہمارے ہی جیسے دو آدمی ہیں اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان مقامات اور انہی جیسے دیگر مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ''عبدیت'' کے معنے خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔

(مطالب الفرقان، جلد اول، صفحہ 35)

مزید لکھتے ہیں۔

''لہٰذا قرآن کریم میں

۱۔ جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا اس کے معنی ہونگے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت۔

۲۔ جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔

۳۔ جہاں بتوں یا دیوی دیوتائوں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔'' (لغات القرآن 1125-1126)

"چونکہ جذبات اطاعت و فرماں پذیری کے اظہار کے لئے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا، (مثلاً جھکنا) انسان کے لاشعور میں چلا آرہا ہے اس لئے قرآن کریم نے بھی اظہار جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی حیثیت دے دی ہے۔ یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع و سجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں۔" (لغات القرآن 1125-1126)

"اجتماعات صلوۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت و فرماں پذیری کا محسوس مظہر ہے۔ لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں۔ اس کی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔" (لغات القرآن 1125-1126)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ مناسک صرف محسوس مظاہر ہیں اور اصل مقصد کچھ اور ہے تو اس کے لیے قرآن کریم کی کوئی سند میسر نہیں ہے۔ قرآن کریم تو دو طرح کی بات بیان نہیں کرتا۔ وہ جو حکم دیتا ہے اس سے مقصود اور غایت وہی ہوتا ہے۔ جس شدّ و مد سے قرآن کریم نے یہ احکامات دیئے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ صرف محسوس مظاہر ہیں قطعاً غلط ہے۔ بلکہ قوانین خداوندی پر عمل کے لیے تو کسی محسوس عمل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دیکھیئے تعزیرات میں یا عائلی قوانین میں یا اخلاقی نصائح میں۔ قانون پر تو "عمل" ہی اس کی عملی شکل ہے۔ اس لیے ان دو باتوں (قوانین پر عمل اور محسوس مظاہر یا حرکات و سکنات) کو خلط ملط نہیں کیا جاسکتا۔

اب آتے ہیں "عبادت" کے معنوں کی طرف "عبد" کی معنی کے لحاظ سے پرویز صاحب نے جو تخصیص کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ ایک ہے۔ بتوں کے لیے استعمال ہو تو اور معنی اور اللہ کے لیے استعمال ہو تو

دوسرا معنی۔ حالانکہ یہ تو زبان کا عام قاعدہ ہے کہ کوئی بھی لفظ اپنے معنی کے لیے سیاق و سباق کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ اس لحاظ سے عبد اور عبادت کے ایسے معانی موجود ہیں جن سے ایک خاص نہج کی حرکات و سکنات ظاہر ہوتی ہیں۔ اور وہاں ان کا کوئی اور معنی نہیں کیا جاسکتا۔ ذیل میں ہم ان آیات قرآنی پر غور کرتے ہیں۔

☆اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۵ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ ۵(21/52-53)

"جب (حضرت ابراہیمؑ) نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم لگے بیٹھے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی پرستش کرتے پایا۔"

اس آیت میں لفظ عاکفون استعمال ہوا ہے جس کے معنی تعظیماً کسی شے کی طرف بڑھنے اور اس سے مستقل طور پر وابستہ ہونے کے ہیں۔ اور یہی لفظ مومنین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ (2/187) اور جب تم مساجد میں حالت اعتکاف میں ہو۔

☆قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَضُرُّكُمْ ۵ اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۵(21/66-67)

"(حضرت ابراہیمؑ) نے کہا کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہو جو تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکیں اور نہ کوئی نقصان (تکلیف)۔ تف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے۔"

☆وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ۵ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۵ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ۵ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۵ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ۵ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۵ قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۵(26/69-75)

"ان کو ابراہیمؑ کی داستان سنائو۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کس کی پرستش کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں۔ یا تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آبائو اجداد کو ان کی پرستش کرتے پایا۔ اس نے کہا کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا جس کی تم پرستش کرتے ہو۔"

☆فَرَاغَ اِلٰٓی اٰلِھَتِہِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْکُلُوْنَ ٥ مَا لَکُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ٥ (37/91-92)

"وہ جا گھسا ان کے بتوں میں اور کہا کہ تم کھاتے کیوں نہیں ہو۔ تمہیں کیا ہے کہ تم بولتے نہیں ہو۔"

☆قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ٥(37/95)

"اس نے کہا کہ تم ان کی پرستش کیوں کرتے ہو۔ جو تم اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو۔"

☆اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ یٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا ٥(19/42)

"جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ تو نے ایک ایسی چیز کی پرستش کیوں اختیار کر رکھی ہے جو نہ سن سکتی ہے نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی تیرے کسی کام آ سکتی ہے۔"

☆وَاِذْ قَالَ اِبْرٰہِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ٥ (14/35) "اور جب ابراہیمؑ نے کہا اے رب! اس شہر کو امن والا بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا۔"

☆ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ط وَاللّٰہُ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ٥(5/76)"کہہ دو کہ کیا تم اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہو جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ اور اللہ تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔"

☆اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ ط اَنْتُمْ لَھَا وٰرِدُوْنَ ٥ (21/98)

''تم، اور اللہ کے سوا جن جن کی تم عبادت کرتے ہو، سب دوزخ کا ایندھن بنو گے۔ تم سب دوزخ میں جانے والے ہو۔''

☆وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ط وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا٥ (25/55)

''اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو کوئی نفع اور نقصان نہیں دے سکتے اور کافر اپنے رب کی طرف سے پیٹھ پھیر دیتے ہیں۔''

☆لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ٥ (41/37) ''شمس و قمر کو سجدہ نہ کرو اور اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں بنایا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

☆وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ٥ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ط اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ط اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ٥ (29/16-17)

''اور جب ابراہیمؑ نے کہا اپنی قوم سے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اسی سے ڈرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ تم تو اللہ کے سوا جن بتوں کی پرستش کرتے ہو اور جھوٹ بناتے ہو۔ بے شک وہ لوگ جو اللہ کے سوا جن کی پرستش کرتے ہیں وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں پس تم رزق تلاش کرو اللہ کے ہاں اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر کرو۔ اسی کی طرف پھر جائو گے۔''

ان آیات قرآنیہ سے درج ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں۔

1۔ لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کی تعظیم میں بیٹھے رہتے تھے۔

2۔ یہ بت ان کے اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے ہوتے تھے۔

3۔بتوں کو جب پکارا جاتا تو وہ سنتے نہیں تھے۔ اور نہ ہی دیکھتے تھے اور نہ ہی بولتے تھے اور نہ ہی کھانا کھاتے تھے۔

4۔ یہ بت لوگوں کو کسی قسم کا نفع اور نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ اور نہ ہی کسی کے کام آتے تھے۔

5۔لوگ اللہ کو چھوڑ کر اوروں کی پرستش کرتے تھے۔

6۔ان کو حکم دیا گیا کہ بتوں کی پرستش نہ کریں بلکہ اللہ تعالی کی پرستش کریں۔

ان آیات میں ''مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ'' کا جملہ ''عبادت'' کے معنی کو واضح کر دیتا ہے۔یعنی کام ایک ہی ہے ''عبادت''۔ اور حکم دیا جارہا ہے کہ کیا تم بتوں کی عبادت کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر۔یعنی مفعول کو بدلا جارہا ہے کہ ''عبادت'' بتوں کی نہ کرو، اللہ کی کرو۔ تو اس میں کسی بھی طرح معنی کا فرق نہیں ڈالا جاسکتا کہ یہ لفظ بتوں کے لیے استعمال ہو تو ''پرستش''بن جائے اور اللہ کے لیے استعمال ہو تو ''اطاعت و محکومی'' بن جائے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ ''فلاں ڈاکٹر سے علاج نہ کرائو بلکہ اِس ڈاکٹر سے علاج کرائو۔'' تو کام تو ایک ہی ہے۔ اس سے لفظ علاج کی ہیت یا معانی پر تو اثر نہیں پڑ سکتا۔ اَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ ان مقامات پر ''عبد'' اور عبادت کے معانی غلامی، محکومی اور قوانین کی اطاعت نہیں کئے جاسکتے۔ کیونکہ بتوں کی صرف پرستش ہی ممکن ہے اور غلامی، محکومی اور اطاعت کے لیے کسی ایسی شخصیت کا ہونا ضروری ہے جو دیکھنے، سننے، نفع اور نقصان پہنچانے والی ہو۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بتوں کی پرستش ہوتی تھی اور یہی الفاظ اللہ نے اپنے لیے استعمال کیے کہ تم بتوں کی پرستش نہ کرو بلکہ اللہ تعالی کی پرستش کرو۔

اب ہم ایک ایسی سورۃ دیکھتے ہیں جس میں ''عبادت'' کا لفظ مسلمانوں اور مشرکوں کے مقابل لا کر مفہوم کو اور واضح کیا گیا ہے۔

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۝ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۝ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۝ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۝ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۝ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ۝ (109/ 1-6)

''کہہ دو! اے کافرو، نہیں میں پرستش کرتا جس کی تم پرستش کرتے ہو۔ اور نہیں تم پرستش کرتے جس کی میں پرستش کرتا ہوں۔ اور نہیں میں نے پرستش کی جن کی تم نے پرستش کی۔ اور نہیں تم پرستش کرنے والے جن کی میں پرستش کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

پرویز صاحب اس سورۃ کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں۔

(اے رسولؐ! تم نے ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کافی وقت صرف کر دیا۔ تم نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی کہ یہ تباہی سے بچ جائیں۔ لیکن اب کوئی امید باقی نہیں کہ یہ اس طرح صحیح راستہ اختیار کر لیں گے۔ یہ ابھی تک اپنے دل میں یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ یا تو تم ہار تھک کر اپنی دعوت کو ختم کر دو گے یا ان سے مفاہمت کر لو گے۔ اس لئے یہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ لہذا، اب وقت آ گیا ہے کہ ان سے دو ٹوک بات کر لی جائے۔) تو ان لوگوں سے جو تمہاری دعوت کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں، بر ملا کہہ دے کہ:

تمہاری اور میری منزل بھی الگ الگ ہے اور راستے بھی جدا جدا۔ مقصود بھی الگ ہے اور اسے حاصل کرنے کے ذرائع بھی الگ۔ تمہارے معبود الگ ہیں، میرا معبود الگ۔ تم ''عبادت'' سے کچھ اور مفہوم لیتے ہو، میں کچھ اور۔ تمہارے معبود، تمہارے ذہن کے تراشیدہ ہیں۔ میرا معبود خالق کائنات ہے۔ تم اپنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو، میں اپنے معبود کے احکام و قوانین کی اطاعت کو اس کی عبادت سمجھتا ہوں۔ لہذا، ہم دونوں ایک نقطہ پر جمع ہو ہی نہیں سکتے۔ اس میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ بھی مت خیال کرو کہ ہمارا اور تمہارا اختلاف کوئی ہنگامی اور وقتی اختلاف ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ خود بخود مٹ جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ یہ اختلاف بنیادی اور اصولی ہے۔ یہ نہ اس وقت مٹ سکتا ہے نہ اس کے بعد

کبھی مٹے گا۔ تمہارے معبود الگ رہیں گے۔ میرا معبود الگ۔ تمہاری عبادت، ان معبودوں کی پرستش ہو گی، میری عبادت خدا کے قوانین کی اطاعت اور محکومیت۔۔۔لہذا، یہ اختلاف انمٹ ہے۔

اس لئے تمہارا پروگرام الگ ہے، میرا پروگرام الگ۔ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو، مجھے اپنے پروگرام پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتادیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔(مفہوم القران ۔جلد سوم)

خط کشیدہ سطور میں پرویز صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے جیسے عرب ''عبادت'' کا مفہوم غلط لیتے تھے۔ جبکہ ان آیات میں ''عبادت'' کے مفہوم کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی گئی۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تم جس کی عبادت کرتے ہو، میں اس کی عبادت نہیں کرتا۔ فعل ایک ہی ہے ''عبادت''۔ صرف مفعول کی تبدیلی کی بات کی گئی ہے۔یعنی بتوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کی تلقین کی گئی ہے۔

اس سورۃ میں کافروں کو مخاطب کر کے عبادت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے۔اس سے مراد بتوں کی پرستش ہے، کیونکہ عرب بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ اور عربوں کے اوپر کوئی حاکم بھی نہیں تھا جس کی وہ محکومی کر رہے تھے۔اس سلسلہ میں پرویز صاحب رقمطراز ہیں۔

''خاص خانہ کعبہ میں عدنانی قبیلہ کا سب سے بڑا بت ہبل نصب تھا۔ طائف میں لات کا ہیکل تھا۔ دوسری طرف مکہ سے تھوڑی دور عزیٰ دیوی کا معبد تھا۔ یہ تو بڑے بڑے بت تھے۔ چھوٹے چھوٹے بت ہر قبیلہ کے الگ الگ موجود تھے۔ صابئیت کے اثر سے قبیلہ قیس ستارہ شعری کا پرستار تھا۔ قبیلہ کنانہ چاند کی پرستش کرتا تھا۔ اسد کا قبیلہ عطارد کو پوجتا تھا۔ ان کے علاوہ ارواح خبیثہ بھوت، پریت پر بھی ان کا اعتقاد تھا جنہیں خدا کا مقرب سمجھ کر پوجتے تھے۔ جنوں اور فرشتوں کی بھی پرستش ہوتی تھی۔'' (معراج انسانیت صفحہ 30)

اور محکومیت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں

"خطہء حجاز کا عرب نہ کسی کا محکوم تھا اور نہ ہی اس میں ہوس ملک گیری پیدا ہوئی تھی۔ اس سرزمین کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ اس پر جب سے زندگی کی نمود ہوئی کسی غیر نے ان پر حکومت نہیں کی۔ (غیر تو ایک طرف خود اپنے ہاں بھی کوئی خاص منظم حکومت نہیں ہوئی)۔۔۔۔

گبن اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

"عربوں کی آبادی یونان اور روم کی نفیس لیکن مصنوعی جمہوریتوں سے بالکل مختلف چیز تھی۔ اس آزادی میں ہر فرد اپنی قوم کے ملکی و سیاسی حقوق میں برابر کا حصہ دار تھا۔ ان کے ہاں قوم اس لیے آزاد تھی کہ فرزندان قوم کسی آقا کے سامنے ذلت آمیز اطاعت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے سینے، حوصلے، استقامت اور متانت کے جوہروں سے لبریز تھے۔ (Decline & Fall vol.vi, P-267) بحوالہ معراج انسانیت صفحہ 41-42)
۔"

اس سے ظاہر ہے کہ عربوں میں محکومی کا تصور نہ تھا۔ بلکہ عبادت سے مراد خاص طریقہ کار کی پرستش ہی تھی۔

قیام

صلوۃ کا ایک جزو "قیام" ہے۔ جس کے معنی ہیں کھڑا ہونا۔ اس لفظ کے مادہ میں دیگر معانی بھی موجود ہیں۔ لیکن ہم اس لفظ کے سیاق وسباق کی مناسبت سے صرف ان مقامات کا جائزہ لیں گے جہاں یہ خالصتاً "عبادت" کے لیے کھڑے ہونے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ خصوصاًیہ لفظ نماز کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یعنی نماز کھڑی کرو۔ یا نماز قائم کرو یا نماز پڑھو۔ بات ایک ہی ہے کسی بھی فرد کے ذہن میں کوئی دوسرا تصور نہیں آتا۔ پرویز صاحب نے اس کا مطلب (Establish) کرنا کئے ہیں۔ آیئے ان کا نقطۂ نظر جانتے ہیں۔

" یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔"وہ نماز قائم کرتے ہیں۔" "نماز پڑھتے ہیں۔" کا تو مطلب سمجھ میں آسکتا ہے لیکن "نماز قائم کرتے ہیں۔" سے بات واضح نہیں ہوتی۔یقیمون کا مادہ (ق۔و۔م) ہے۔قَامَ، قِیَاماً کے معنی ہوتے ہیں کھڑا ہونا، متوازن ہونا، کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا، محکم اور استوار ہونا۔ثابت اور دائم رہنا۔ اَقَامَ کے معنی ہیں اسے درست اور سیدھا کیا۔ اس کا توازن قائم رکھا۔ان معانی کو سورۃ فاتحہ میں اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔لہذا اقامت صلوۃ کے معنی ہونگے الصلوۃ کو محکم اور استوار کرنا۔ متمکن کرنا۔(Establish) کرنا۔مارماڈیوک پکتھال نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن مجید میں یقیمون کے یہی معنے لکھے ہیں۔]اگرچہ اس کے ساتھ الصلوۃ کا ترجمہ روش عامہ کے تتبع میں (Worship) ہی کیا ہے۔[اس سے واضح ہے کہ 'اَلصَّلٰوۃَ' کوئی ایسی چیز ہے جس کا متمکن اور مستحکم کیا جانا مطلوب و مقصود ہے۔" (مطالب الفرقان ۔جلد اول صفحہ 97)

اس مفہوم کو بنیاد بنا کر قرآن کریم میں جہاں بھی صلوۃ کے ساتھ قیام کا ذکر آیا۔پرویز صاحب نے اس کا مطلب "نظام صلوۃ کا قیام" کر دیا اور "عبادت کے لیے کھڑے ہونے" کا معنی بالکل ہی غائب کر دیا۔زیر نظر آیات میں ہم دیکھتے ہیں جہاں قیام کا لفظ عبادت کے لیے کھڑے ہونے میں بھی استعمال ہوا ہے۔

☆ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ۵ (238/2)

"نمازوں کی حفاظت کرو اور بالخصوص درمیان والی نماز کی اور اللہ کے لیے باادب کھڑے رہا کرو۔"

☆ فَنَادَتْہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ (39/3)

"پس فرشتوں نے اسے آواز دی جب کہ وہ (حضرت زکریاؑ) حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

☆ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۵ (191/3)

"جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا۔ تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔"

☆ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (103/4)

"پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے اللہ کا ذکر کرتے رہو۔"

☆ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ج (12/10)

"اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے۔ لیٹے بھی، بیٹھے بھی اور کھڑے بھی۔

☆ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۵ (48/52)

"اور اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کر، پس بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور تسبیح کر اپنے رب کی حمد کی، جب تو کھڑا ہو۔"

☆ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۵ (26/22)

"اور جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کو کعبہ کی جگہ مقرر کر دی۔ یہ کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف، قیام، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھنا۔"

☆ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۵ (64/25)

"اور جو اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام کرتے ہوئے راتیں گزار دیتے ہیں۔"

☆ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۵ (2/73)

"رات کو قیام کر، مگر تھوڑا۔"

☆وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ (72/19)

"اور جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کے لیے کھڑا ہوا تو قریب تھا کہ وہ بھیڑ کی بھیڑ بن کر اس پر پل پڑیں۔"

ان آیات سے واضح ہے کہ یہاں کسی نظام کی بات نہیں ہو رہی جس کا قائم کرنا مقصود ہے بلکہ یہاں قیام سے مراد صرف خدائے بزرگ و برتر کے حضور کھڑا ہونے کے ہیں۔ اور جس کا مقصد عبادت یا پرستش ہی ہے۔

رکوع

اس کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

"رَکَعَ کے معنی ہوتے ہیں منہ کے بل جھکنا یا گر جانا۔ خواہ اس میں گھٹنے زمین پر لگیں یا نہ لگیں۔ البتہ سر ضرور جھک جائے۔ راغب نے کہا ہے کہ رُکُوۡعٌ کے معنی جھکنے کے ہیں۔ یہ لفظ کبھی بالخصوص جسمانی شکل میں جھکنے کے لئے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے لیے بولا جاتا ہے۔ خواہ عبادتاً ہو یا بغیر عبادت کے۔ یعنی کسی کے حکم کے آگے سر جھکا دینے کے۔"

" رُکُوۡعٌ وَسُجُوۡدٌ درحقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ سجدہ میں رکوع کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے یعنی کامل اطاعت۔ سورۃ بقرۃ میں یہودیوں سے کہا گیا ہے۔ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۵﴾ (2/43) یعنی جو جماعت مومنین، قوانین خداوندی کے سامنے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے۔ تم بھی ان میں شامل ہو کر اسی طرح ان قوانین کی اطاعت کرو۔" (لغات القرآن صفحہ 778)

قوانین خداوندی کے سامنے جھکنا تو ایک مبہم سی بات ہے۔ قانون پر تو صرف عمل کرنا ہوتا ہے۔ یہاں لغت میں بھی رکوع کا معنی جھکنا ہی ہے۔ لیکن "قوانین" کا لفظ پرویز صاحب کا اپنی طرف سے اضافہ ہے ورنہ

لغت اور زبان میں اس قسم کا قرینہ نہیں ملتا کہ قوانین کے سامنے جھکا جائے۔ اب ہم چند قرآنی آیات کا ذکر کرتے ہیں۔ جن سے "رکوع" کا مفہوم مزید نکھر کر سامنے آئے گا۔

☆ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (2/43)

"اور نماز قائم کرو، اور زکوۃ دیا کرو، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔"

☆ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (2/125)

"اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے ٹھہرنے اور امن کی جگہ بنایا۔ تم مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو۔ اور ہم نے یہ عہد لیا ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ سے کہ تم میرے گھر کو صاف رکھو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔"

☆ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ (3/43)

"اے مریمؑ! تو اپنے رب کی اطاعت کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔"

☆ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (9/112)

"وہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا حکم اور بری باتوں سے منع کرنے والے اور حدود اللہ کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور ایسے مومنین کو خوشخبری سنا دیجئے۔"

☆وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝(22/26)

"اور جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کو کعبہ کے مکان کی جگہ مقرر کر دی یہ کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے صاف رکھنا۔"

☆يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝(22/77)

"اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیک کام کرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جائو۔"

☆وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ۝(38/24)

"اور دائودؑ کو گمان ہوا کہ ہم نے انھیں آزمایا ہے۔ پھر اپنے رب سے استغفار کرتے ہوئے عاجزی کے ساتھ جھکتے ہوئے گر پڑے۔"

☆مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (48/29)

"محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں۔ آپس میں رحمدل ہیں۔ تو انھیں دیکھے گا رکوع کرتے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے۔ اللہ کا فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں۔

☆وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ۝ (77/48)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو نہیں کرتے۔"

درج بالا آیات سے واضح ہے کہ رکوع کی اپنی الگ حیثیت ہے جس کا مطلب صرف اور صرف عباداتاً جھکنا ہے۔ عاجزی وانکساری کے ساتھ۔ نہ کہ "قانون کی اطاعت۔"

سجدہ

پوری اسلامی دنیا میں اور تاریخ میں بھی ان اصطلاحات کے مطالب و معانی پر کبھی کوئی دوسری رائے نہیں ہوئی۔ جس طرح کے نکات پرویز صاحب نے اٹھائے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم موضوع "سجدہ" بھی ہے۔ معاشرے میں کسی فرد کے سامنے ان اصطلاحات کا ذکر کیجئے تو ہر ایک ذہن اسی مفہوم کی طرف جائے گا جو معاشرے میں رائج ہے۔ اب پرویز صاحب نے اس سے کیا مفہوم لیا ہے۔ پہلے اسے دیکھتے ہیں۔

"السجود کے معنی ہیں سر کو جھکا دینا، ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی، پست ہونا اور جھک جانا لکھے ہیں۔ نَخْلَۃٌ سَاجِدَۃٌ جھکا ہوا کھجور کا درخت، بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے۔ سَجَدَ الْبَعِیْرُ اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تاکہ سوار اس پر بیٹھ جائے۔ لہٰذا اسادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔"

"قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (عربی) میں بات کرتا ہے۔ اس لئے اس کے ہاں بھی اظہار مطالب کا یہی انداز ہے۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ، اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۵(16/49) اور جو جاندار کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ، سب خدا کے سامنے سربسجود ہیں اور وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے۔"

"اس لیے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س۔ج۔د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرماں پذیری کے) معنوں میں۔"
(لغات القرآن صفحہ 844-845)

”یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود، بعض مقامات میں اسے باقی بھی رکھا ہے۔ صلوۃ (نماز) میں قیام ور کوع و سجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کا مظہر ہیں۔ مثلاً (سورۃ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلوۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے وہاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسولؐ اللہ کی اقتدا میں کھڑا ہو جائے۔ فَاِذَا سَجَدُوْا (4/102) پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ”سجدہ“ سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے، اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین میں رائج تھی۔“

”لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اسی طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہو گا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے پر خلوص جذبہ کا بے ساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے، تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔“

(لغات القرآن 846-847)

”سورۃ الفتح میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے متعلق ہے تَرٰاھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا (48/29) تو انہیں رکوع کرتے ہوئے۔ سجدے کرتے ہوئے دیکھے گا۔ یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لئے جائیں تو مطلب اجتماع صلوۃ کے رکوع و سجود ہونگے۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو، ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سر تسلیم خم کئے ہونگے۔“ (لغات القرآن 850)

درج بالا تصریحات سے واضح ہے کہ پرویز صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ سجدہ کا معنی خدا کے سامنے جھک کر پیشانی رکھ دینا ہے۔ مگر جس طرح کی انہوں نے تمہید باندھی ہے اس سے انہوں نے عملی طور پر اس مفہوم

سے انکار کیا ہے۔(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے لغات القرآن 844-851 جلد دوم) اور جہاں اپنا بس نہیں چلتا وہاں آجاتا ہے "مجازی معنی"۔ اس کے بارے میں ہم "مجازی مفہوم" کے عنوان کے تحت بات کر چکے ہیں۔

آخری پیرا میں جس انداز سے انہوں نے کہا کہ "یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لئے جائیں تو مطلب اجتماع صلوۃ کے رکوع و سجود ہونگے۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سر تسلیم خم کئے ہونگے۔

حالانکہ پرویز صاحب قرآن کریم کا مفہوم بیان کر رہے ہیں۔ تو یہاں پر ذمہ دارانہ بات کرنی چاہیے کہ یہاں اس کا مطلب یا تو حقیقی ہے یا مجازی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کچھ لوگ اس کا حقیقی مطلب لے لیں اور کچھ اس کو مجازی معنوں میں لے لیں۔ آخر مجازی معنی کے لیے کچھ تو اصول و ضوابط مقرر ہونے چاہئیں۔ پھر آپ "لغات القرآن" لکھ رہے ہیں اور آپ نے کوئی ایسا حوالہ نہیں دیا کہ کسی "امام" یا "مفسر" یا "ماہر لسانیات" نے اس کے مجازی معنی لئے ہیں۔

آیئے اب قرآنی آیات دیکھتے ہیں سجدہ کے بارے میں۔

☆وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ط وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (58/2)

"اور جب ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں جاؤ اور جو کچھ جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو اور دروازے میں سے سجدے کرتے ہوئے گزرو اور زبان سے حِطَّۃٌ کہو۔ ہم تمہاری خطائیں معاف فرمادیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے۔"

☆وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (125/2)

"اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے ٹھہرنے اور امن کی جگہ بنادیا۔ اور تم مقام ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ بنالو۔ ہم نے ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے صاف رکھو۔"

☆ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ۵ (3/43)

"اے مریمؑ! تو اپنے رب کی اطاعت کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔"

☆ لَیْسُوْا سَوَآءً ط مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ ۵ (3/113)

"یہ سارے کے سارے یکساں نہیں۔ بلکہ ان اہل کتاب میں ایک جماعت (حق پر) قائم رہنے والی بھی ہے۔ جو راتوں کے وقت بھی کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بھی کرتے ہیں۔"

☆ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ق صلے اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ط اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۵ وَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْھُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْآ اَسْلِحَتَھُمْ قف فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِکُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَکَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَھُمْ وَاَسْلِحَتَھُمْ وَدَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِکُمْ وَاَمْتِعَتِکُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْکُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً ط وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ کَانَ بِکُمْ اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَکُمْ وَخُذُوْا حِذْرَکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۵ فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ج اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۵ (4/101-103)

"اور جب تم سفر میں جارہے ہو تو تم پر نماز کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں، اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ یقیناً کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں اور جب تم ان میں ہو تو ان کے لیے نماز کھڑی کرو تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت تمہارے ساتھ اپنے ہتھیار لیے کھڑی ہو، پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمہارے پیچھے آجائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آجائے اور تیرے ساتھ نماز ادا کرے۔ اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار

لیے رہیں۔ کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے بے خبر ہو جاؤ تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں۔ ہاں اپنے ہتھیار اتار رکھنے میں اس وقت تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تمہیں تکلیف ہو یا بوجہ بارش کے یا بسبب بیمار ہو جانے کے اور اپنے بچاؤ کی چیزیں ساتھ لیے رہو۔ یقیناً اللہ تعالی نے منکروں کے لیے ذلت کی مار تیار کر رکھی ہے۔ پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے اللہ کا ذکر کرتے رہو، اور جب اطمینان پاؤ تو نماز قائم کرو۔ یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔"

☆اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یُسَبِّحُوۡنَہٗ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ ۵(7/206)

"بے شک جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں۔"

☆اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ السَّآئِحُوۡنَ الرّٰکِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ النَّاہُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ الۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۵(9/112)

"وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیک باتوں کی تعلیم دینے والے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۔"

☆اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡہِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ۵(12/4)

"جب یوسفؑ نے کہا اپنے باپ سے! اے ابا جان میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج چاند کو دیکھا کہ وہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔"

☆وَ رَفَعَ اَبَوَیۡہِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَ خَرُّوۡا لَہٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ ہٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَہَا رَبِّیۡ حَقًّا ؕ(12/100)

”اور اپنے تخت پر اپنے ماں باپ کو اونچا بٹھایا اور سب اسی کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ تب کہا کہ ابا جی! یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے۔ میرے رب نے اسے سچا کر دکھایا۔“

☆وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ٥ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ ٥ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ ٥ اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ٥ قَالَ لَمْ اَکُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَہٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ٥(15/28-33)

”اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں ایک انسان کو خمیر کی ہوئی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے، سب کے سب نے سجدہ کر لیا۔ مگر ابلیس، کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شمولیت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا تجھے کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ وہ بولا کہ میں ایسا نہیں کہ اس انسان کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیری اور کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔“

☆یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥(22/77)

”اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیک کام کرو۔ تاکہ تم فلاح پا جائو۔“

☆اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَھُمْ دٰخِرُوْنَ ٥ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ٥(16/48-49)

”کیا انہوں نے اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا؟ کہ اس کے سائے دائیں بائیں جھک جھک کر اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ یقیناً آسمان و زمین کے کل جاندار اور تمام فرشتے اللہ کے سامنے سجدے کرتے ہیں اور ذرا بھی تکبر نہیں کرتے۔“

☆وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَمَا الرَّحۡمٰنُ ق اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا وَزَادَہُمۡ نُفُوۡرًا ۵ (25/60)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو جواب دیتے ہیں رحمن ہے کیا؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کا تو حکم دے دے اور ان کا توبدکنا ہی بڑھتا ہے۔"

☆وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا ۵ (25/64)

"اور جو اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام کرتے ہوئے راتیں گزار دیتے ہیں۔"

☆وَجَدۡتُّہَا وَقَوۡمَہَا یَسۡجُدُوۡنَ لِلشَّمۡسِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَزَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ فَہُمۡ لَا یَہۡتَدُوۡنَ ۵ اَلَّا یَسۡجُدُوۡا لِلّٰہِ الَّذِیۡ یُخۡرِجُ الۡخَبۡءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَیَعۡلَمُ مَا تُخۡفُوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ۵ (27/24-25)

"میں نے اسے اور اس کی قوم کو اللہ تعالی کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہوئے پایا اور شیطان نے ان کے کام انہیں بھلے کر کے دکھلا کر صحیح راہ سے روک دیا ہے۔ وہ ہدایت پر نہیں آتے کہ اسی اللہ کے لیے سجدے کریں جو آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو باہر نکالتا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو وہ سب جانتا ہے۔"

☆اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَیَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖط قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ط اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۵ (39/9)

"بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں عبادت میں گزارتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو، اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہو۔ بتلائو تو علم والے اور بے علم کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل مند ہوں۔"

☆وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ط لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۵ (37/41)

"اور دن اور رات اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تم سورج کو اور چاند کو سجدہ نہ کرو اور سجدہ اس اللہ کو کرو جو ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔"

☆وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا ۵ (26/76)

"اور رات کے وقت اس کے سامنے سجدے کرو اور بہت رات تک اس کی تسبیح کرو۔"

☆مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ج صلے وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ج قف (29/48)

"محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں تو انھیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں۔ ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے۔ ان کی یہی صفت تورات میں ہے اور ان کی صفت انجیل میں ہے۔"

☆فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۵ (62/53)

"پس اللہ کو سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔"

☆كَلَّا ط لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۵ (19/96)

"خبردار! ہر گز اس کا کہنا نہ ماننا اور سجدے میں اور قرب الٰہی کی طلب میں لگے رہنا۔"

☆وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ۵ (120/7)

"اور جو ساحر تھے سجدہ میں گر گئے۔"

☆وَلِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّکَرۡھًا وَّ ظِلٰلُھُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ٥(15/13)

"اللہ ہی کے لیے زمین و آسمان کی سب مخلوق خوشی اور ناخوشی سے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔"

☆ قُلۡ اٰمِنُوۡا بِہٖۤ اَوۡلَا تُؤۡمِنُوۡا ط اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِہٖۤ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡھِمۡ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا٥ (17/107)

"کہہ دیجئے تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان کے پاس تو جب بھی اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔"

☆اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡھِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنۡ ذُرِّیَّۃِ اٰدَمَ ق وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ وَّمِنۡ ذُرِّیَّۃِ اِبۡرٰھِیۡمَ وَاِسۡرَآءِیۡلَ زوَمِمَّنۡ ھَدَیۡنَا وَاجۡتَبَیۡنَا ط اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّبُکِیًّا٥(19/58)

"یہی وہ انبیاء ہیں جن پر اللہ تعالی نے فضل و کرم کیا جو اولاد آدم میں سے ہیں۔ اور ان لوگوں کی نسل سے ہیں جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں چڑھالیا تھا اور اولاد ابراہیمؑ ویعقوبؑ سے اور ہماری طرف سے راہ یافتہ اور ہمارے پسندیدہ لوگوں میں سے۔ ان کے سامنے جب اللہ رحمان کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی تھی یہ سجدہ کرتے اور روتے گڑگڑاتے گر پڑتے تھے۔"

☆فَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ ھٰرُوۡنَ وَمُوۡسٰی٥(20/70)

"اب تو تمام جادوگر سجدے میں گر پڑے اور پکار اٹھے کہ ہم تو ہارونؑ اور موسیؑ کے پروردگار پر ایمان لائے۔"

درج بالا آیات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سجدہ کا لفظ صرف اور صرف انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں معاشرے میں رائج ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معنی یا مطلب اخذ نہیں کیا

جا سکتا۔ پرویز صاحب کا کہنا کہ "اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۵ (16/ 49)۔" تو اس سے بھی مراد وہی سجدہ ہے جو نماز میں کیا جاتا ہے نہ کہ اس سے کوئی "اطاعت" یا "فرماں پذیری" کا مطلب نکلتا ہے۔ اور اگر ہم اس آیت سے پہلے والی آیت کو بھی ساتھ ملا لیں یعنی (16/ 48) تو مطلب مزید واضح ہو جاتا ہے۔ "کیا انہوں نے اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ اس کے سائے دائیں بائیں جھک کر اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ یقیناً آسمان و زمین کے کل جاندار اور تمام فرشتے اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ اور ذرا بھی تکبر نہیں کرتے۔"

"اطاعت اور فرماں پذیری" کے الفاظ کو بنیاد بنا کر پورے قرآن کریم میں جہاں بھی سجدہ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کا مفہوم یہی کر دیا۔ اور اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہوا تو وہاں مجازی معنی کا استعمال کر دیا۔ حالانکہ "اطاعت اور فرماں پذیری" کے لیے "اَطِیْعُوا اللّٰہ" کا لفظ قرآن کریم میں موجود ہے۔ مگر پرویز صاحب نے "رکوع۔ سجدہ۔ عبادت۔ ذکر۔ تقویٰ۔ تسبیح۔" و دیگر اصطلاحات کے لیے "قوانین کی اطاعت" کا مفہوم ہی کیا ہے۔ مگر قرآن کریم میں یہ تمام اصطلاحات اپنی الگ شناخت اور حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ایک کی جگہ پر دوسری استعمال نہیں ہو سکتی۔ یعنی پیشانی پر نشان تو سجدے سے ہی پڑ سکتا ہے نہ تو رکوع سے نہ تسبیح و ذکر سے۔ وگرنہ اللہ کے لیے کیا مشکل تھی کہ یہاں کہہ دیتے کہ، "اطاعت کے اثر سے ان کی پیشانی پر نشان ہے۔" مگر دیکھئے اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہر چیز کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۵ (9/ 112) اور طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۵ (2/ 125)۔

اس کے علاوہ سجدہ کا یہی لفظ شمس و قمر کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ "وَجَدْتُّھَا وَقَوْمَھَا یَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (27/ 24) میں نے اسے اور اس کی قوم کو اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہوئے پایا۔" اب یہ چیز

بہت واضح ہے کہ سورج اور چاند کے قوانین کی اطاعت تو نہیں کی جاسکتی۔ یا ان کے قوانین کے آگے تو سر تسلیم خم نہیں کیا جاسکتا۔ سورج کو تو سجدہ پیشانی زمین پر رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور مِنْ دُوْنِ اللّٰہ کے الفاظ بتارہے ہیں کہ سورج چاند ہو یا اللہ تعالی کی ذات، لفظ سجدہ کی ہیت، مفہوم اور معانی ایک جیسے ہی رہیں گے۔ اسی چیز کو ایک اور جگہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ (41/37) سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اللہ کو سجدہ کرو۔

اس کے علاوہ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ "قوانین کی اطاعت" کو وقت کی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا۔یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "کسی خاص وقت قوانین کے آگے جھک جائو یا سر تسلیم خم کردو۔" مگر سجدہ کے لیے قرآن کریم نے ایسے احکامات دیئے ہیں وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَہٗ (76/26)، اور رات کو اس کے سامنے سجدے کرو۔ اَمَّنْ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا (39/9) بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں گزارتا ہو۔"

اس کے بعد قرآن کریم نے بڑی اہم حقیقت بیان کی جب کہا سِیْمَا ھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48/29) ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدے کے اثر سے ہے۔ ایسا نشان تو صرف نماز کے سجدے سے ہی پڑ سکتا ہے اس کے علاوہ اور کسی بھی قسم کے قانون کی اطاعت یا کسی بھی قسم کی عبادت سے ایسا نشان نہیں پڑ سکتا۔

تصریحات بالا سے ہم نے دیکھا کہ "سجدہ" کا مفہوم وہی ہے جو اس وقت معاشرے میں رائج ہے۔ یعنی پیشانی کو زمین پر رکھ دینا۔ اس کے علاوہ کسی بھی طرح کا کوئی اور مفہوم نہیں لیا جاسکتا۔ نہ تو قرآن کریم کا سیاق و سباق اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ لغت اور گرامر کے قواعد و ضوابط۔

ذکر

ذکر عبادت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ نماز اذکار ہی کا مجموعہ ہے اور قرآن کریم نے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، لیٹے ہر وقت ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن اس اصطلاح کے بارے میں پرویز صاحب کیا کہتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں

''سورۂ بقرہ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ (2/152) اسکے یہ معنی ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کرونگا اور تمہیں عظمت و سطوت عطا کرونگا۔ تم ان قوانین کا اتباع کرو تو ان کے خوشگوار نتائج یقینا تمہارے سامنے آجائیں گے۔(یہاں، علاوہ دیگر امور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا اس کا جواب دیتا ہے۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسی قسم کا رد عمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔لہذا ذِكْرُ اللّٰهِ کے معنی قوانین خداوندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ گنتے رہنا)۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف و عظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ و تسلط ہے۔ جیسا کہ سابقہ حوالوں میں بتایا جا چکا ہے۔ صاحب ضرب کلیمی کا فرعون کے مقابلہ کے لیے جانا، ذکر اور تسبیح ہے۔ میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذکر ہے۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت و موعظت حاصل کرنا ذکر ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک ایک قدم پر قانون خداوندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے۔ اسی کو آجکل کی اصطلاح میں نشر و اشاعت کرنا کہتے ہیں۔ یہی وہ ''ذکر اللہ'' ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔''

(لغات القرآن 699-700)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے ذکر کو کس طرح استعمال کیا ہے۔

☆ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ط فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ص وَاذۡکُرُوۡہُ کَمَا ہَدٰىکُمۡ ج وَاِنۡ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ ۵ (2/198)

”تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس ذکر الٰہی کرو اور اس کا ذکر کرو جیسے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی۔ حالانکہ تم اس سے پہلے راہ بھولے ہوئے تھے۔“

☆ فَاِذَا قَضَیۡتُمۡ مَّنَاسِکَکُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَذِکۡرِکُمۡ اٰبَآءَکُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِکۡرًا ط (2/200)

”پھر جب تم ارکان حج ادا کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے باپ دادا کا ذکر کیا کرتے ہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“

☆ وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ ط فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ج وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ لا لِمَنِ اتَّقٰی ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ۵ (2/203)

”اور اللہ کا ذکر کرو گنتی کے چند دنوں میں، دو دن کی جلدی کرنے والے پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو پیچھے رہ جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ پرہیز گار کے لیے ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم سب اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے۔“

☆ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الۡبَیۡعَ ط ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۵ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانۡتَشِرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۵ (62/9-10)

”اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف جلدی آیا کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو۔ پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔“

☆وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ۵(7/205)

"اور اپنے رب کا ذکر کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ، صبح اور شام کو اور اہل غفلت میں شمار مت ہونا۔"

☆اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ لا وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۵(20/14)

"بے شک میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا عبادت کے لائق اور کوئی نہیں۔ تو میری ہی عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔"

☆وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ط وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ط اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۵(22/40)

"اگر اللہ تعالی لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے، اور گرجے اور مسجدیں اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ویران کر دی جاتیں جہاں اللہ کا نام بہ کثرت لیا جاتا ہے۔ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ تعالی بڑی قوتوں والا، بڑے غلبے والا ہے۔"

☆وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا ۵ (73/8)

"اور ذکر کرو اپنے رب کے نام کا اور تمام طرف سے کٹ کر اس کی طرف متوجہ ہو جا۔"

☆وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا ۵(76/25)

"اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو صبح اور شام کو۔"

ان آیات سے چند نکات سامنے آتے ہیں۔

ا۔ مسجد الحرام کے نزدیک ذکر۔

۲۔ آبائو اجداد کی طرح کا ذکر بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

۳۔ گنتی کے دنوں میں ذکر۔

۴۔ جمعہ کی نماز کے لیے ذکر۔

۵۔ دل میں ذکر عاجزی اور خوف سے۔

۶۔ درمیان کی آواز سے ذکر۔

۷۔ صبح اور شام کو ذکر۔

۸۔ ذکر کے لیے نماز قائم کرنا۔

۹۔ مسجد میں اللہ کے نام کا ذکر۔

جو معانی ذکر کے پرویز صاحب نے بیان کئے ہیں وہ ان آیات پر توفٹ نہیں بیٹھتے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ قانون کو زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ مسجد میں قانون کی اطاعت کرو۔ یا کسی خاص وقت میں یا دل میں اور بین بین آواز سے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ آیات کریمہ سے ظاہر ہے کہ ذکر کا معنی وہی ہے جس طرح کا ذکر امت مسلمہ اور پہلے کی امتیں کرتی آرہی ہیں۔ اللہ کے قانون کی پابندی سمجھ میں آنے والی بات ہے مگر یہاں بات ہو رہی ہے وَاذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ۔ اللہ کے نام کا ذکر کرو۔ تو وہ ایسے ہی ہو سکتا ہے جیسے تسبیح پر ہوتا ہے۔ یا لوگ انگلیوں پر کرتے ہیں یا ویسے ہی زبان سے کرتے ہیں۔ ذکر اللہ کی یاد ہوتا ہے تبتل الیہ تبتیلا، سب سے کٹ کر یعنی یکسوئی سے اللہ کو یاد کیا جائے۔ یاد رکھا جائے۔ بکرۃ و اصیلا، صبح و شام سے مراد محض صبح و شام نہیں بلکہ جس طرح ہم بولتے ہیں کہ میں رات دن آپ کو یاد کرتا ہوں۔ مراد ہر وقت ہوتی

ہے۔ اس قسم کی آیات میں تعلیم دی جارہی ہے کہ ہر وقت ہر کام میں اللہ کو یاد رکھا جائے۔ اور ظاہر ہے جب یہ کیفیت حاصل ہو جائے گی تو خود بخود انسان برائی سے بچے گا۔ اور بھلائی کے کام کرے گا۔ پرویز صاحب نے چونکہ عقلی طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ ہر وہ چیز جو خلاف از عقل ہے وہ نہیں مانی جاسکتی۔ یہ آیات اپنے مقام پر اٹل ہیں ان کا کوئی اور مطلب نکالنے کی کوشش کرنا۔ بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ آپ نے اگر کسی نظریے کا ابطال کرنا ہے تو گرامر، لغت، سیاق وسباق کے دلائل کے بغیر ناممکن ہے۔

تسبیح

تسبیح کا مطلب ہے اللہ تعالی کی حمد وثنا بیان کرنا۔ عبادت کے اندر بھی تسبیح کی جاتی ہے اور عبادت کی حالت میں نہ ہوتے ہوئے بھی تسبیح کی جاتی ہے۔ آیئے پہلے دیکھتے ہیں کہ پرویز صاحب نے اس کا کیا مفہوم لیا ہے۔

''لسان العرب میں ہے کہ تَسْبِیْحٌ کے معنی تنزیہ کے ہیں۔ نیز یہ لفظ ''سبحان اللہ'' کہنے، یا صلوۃ اور ذکر اللہ، حمد ومجد وثنا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں شدت کا پہلو غالب ہوتا ہے اس لیے تنزیہ کے معنی ہونگے، خدا کو بڑی شدت اور قوت کے ساتھ تمام نقائص سے دور سمجھنا۔

اس مادہ میں تیزی، مضبوطی، شدت کا پہلو ہوتا ہے اسی لیے لِسَائٌ مُسَبَّحٌ کے معنی ہیں بہت مضبوط اور سخت بنا ہوا کمبل۔ اس اعتبار سے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ الْعَظِیْم کے معنی ہونگے صفات خداوندی کو نہایت تیزی، شدت اور مضبوطی کے ساتھ اپنانا اور عام کرنا۔ مطلب وہی ہے جو پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

سورئہ صٰفّٰت میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے کہ انہیں بڑی مچھلی نے لقمہ بنایا۔ فَلَوْلَا اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ٥(37/143) اگر یہ لفظ (مسبحین) سَبْحٌ سے ہوتا تو اس کے معنی تیراک ہوتے۔ لیکن سَبَّحَ کے اعتبار

سے اس کے معنی ہونگے پوری قوت اور شدت سے جدوجہد کرنے والا۔ اس میں مچھلی کے منہ سے نکلنے کے لیے پوری جدوجہد کرنے کے بعد ساحل تک پہنچ جانے میں تیرنے کا مفہوم خود بخود آجاتا ہے۔ ان مقامات سے بھی تسبیح کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ شدت، مضبوطی، تیزی کے ساتھ خدا کے پروگرام کی تکمیل میں مصروف جدوجہد رہنا۔

(لغات القرآن صفحہ 836)

حالانکہ یہ بات ناممکن العمل ہے کہ مچھلی کے منہ سے نکل کر اور پھر تیر کر دریا یا سمندر کے کنارے پہنچ جانا۔ جبکہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ۔ مچھلی نے انہیں لقمہ بنالیا تھا یعنی نگل لیا تھا اور دوسرے مقام پر قرآن کریم نے اس تسبیح کا بھی ذکر کردیا جو یونسؑ نے پڑھی تھی۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِباً فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ صلے اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۵ (87/21) مچھلی والے (حضرت یونسؑ) کو یاد کرو! جب وہ غصہ سے چل دیا اور خیال کیا کہ ہم اسے نہ پکڑ سکیں گے۔ بالآخر وہ تاریکیوں کے اندر سے پکار اٹھا کہ الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ بے شک میں ظالموں میں سے ہوگیا۔

اب ہم قرآن کی کچھ آیات دیکھتے ہیں۔ جن سے تسبیح کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔

☆قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَۃً ط قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ط وَاذْکُرْ رَّبَّکَ کَثِیْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ ۵(41/3)

"انہوں نے کہا (حضرت زکریاؑ) اے میرے پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر کردے، فرمایا نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تو لوگوں سے بات نہ کر، مگر صرف اشارے سے، اور اپنے رب کا کثرت سے ذکر کر اور صبح وشام اسی کی تسبیح بیان کر۔"

☆ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ج (13/13)

"اور گرج اس کی حمد کی تسبیح کرتی ہے اور فرشتے بھی اس کے خوف سے۔

☆ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۵ (98/15)

"پس اپنے رب کی حمد کی تسبیح بیان کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے رہ۔"

☆ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۵ (44/17)

"ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اسی کی تسبیح کر رہے ہیں اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اس کی حمد کی تسبیح بیان نہ کرتی ہو۔ مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔"

☆ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ج وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۵ (130/20)

"پس ان کی باتوں پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے وقتوں میں اور دن کے حصوں میں بھی اس کی تسبیح بیان کر تاکہ تو راضی ہو جائے۔"

☆ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ج وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ز وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ط وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۵ (79/21)

"ہم نے اس کا صحیح فیصلہ سلیمنؑ کو سمجھا دیا۔ اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم دے رکھا تھا۔ اور داؤدؑ کے تابع ہم نے پہاڑ کر دیے تھے اور پرندے بھی جو تسبیح کرتے تھے۔ اور ایسا ہم ہی کرنے والے تھے۔"

☆ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ لا يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۵ (36/24)

"ان گھروں میں جن کے ادب و احترام کا اور اللہ کا نام وہاں لیے جانے کا حکم ہے۔ وہاں صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔"

☆ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ۵(17/30)

"پس اللہ کی تسبیح پڑھو جب تم شام کرو، اور جب صبح کرو۔"

☆ اِنَّمَا یُؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِہَا خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوۡا بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ۵(15/32)

"ہماری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جنہیں جب کبھی ان سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔"

☆ وَّ سَبِّحُوۡہُ بُکۡرَۃً وَّ اَصِیۡلًا ۵(42/33)

"اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرو۔"

☆ اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ۵(18/38)

"ہم نے پہاڑوں کو اس کے (حضرت داوٗدؑ کے) تابع کر رکھا تھا اس کے ساتھ صبح اور شام کو تسبیح کریں۔"

☆ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ اسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِکَ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِبۡکَارِ ۵(55/40)

"پس (اے نبیؐ) تو صبر کر، اللہ کا وعدہ بلا شک و شبہ سچا ہے۔ اور تو اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہ۔ اور صبح اور شام کو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح بیان کر۔"

☆ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ ۵(48/52)

"صبح کو جب تو اٹھے تو اپنے رب کی پاکی بیان کر۔"

☆ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ ۵ (74/56)

"پس اپنے عظیم رب کے نام کی تسبیح کیا کرو۔"

☆وَمِنَ الَّیۡلِ فَاسۡجُدۡ لَہٗ وَسَبِّحۡہُ لَیۡلًا طَوِیۡلًا ۵(26/76)

"اور رات کے وقت اس کے سامنے سجدے کر اور بہت رات تک اس کی تسبیح کیا کر۔"

ان آیات سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

ا۔ مخصوص اوقات کی تسبیح

۲۔ حمد کی تسبیح

۳۔ اللہ کے نام کی تسبیح

۴۔ پرندوں اور پہاڑوں کی تسبیح

۵۔ ہر شے کی تسبیح مگر انسان کی سمجھ سے بالا

۶۔ سجدے میں گر کر تسبیح

یہ تمام نکات تسبیح کے بارے میں پرویز صاحب کے مفہوم کی نفی کرتے ہیں۔ جدوجہد تو ایک مسلسل عمل ہے اسے اوقات میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رات کو جدوجہد کرو یا دوپہر کو کرو۔ پھر اللہ کے نام اور حمد کی تسبیح تو ویسے ہی ہو سکتی ہے جیسے اس وقت ہمارے معاشرے میں ہو رہی ہے۔ اس کے لیے کوئی اور طریقہ کار اختیار ہی نہیں کا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی کہا کہ ایمان والے تو سجدے میں گر کر تسبیح کرتے

ہیں۔ اس سے زیادہ اور کونسی آیت واضح ہو گی؟ اس کے بعد اللہ نے فرمایا کہ کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح کرتی ہے مگر تم اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اب یہاں اگر یہ مطلب لیا جائے کہ ہر چیز فطری قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے تو ان قوانین کا تو انسان نے علم حاصل کر لیا۔ اب انسان تو یہ بتا سکتا ہے کہ اگلی صدی میں سورج گرہن اور چاند گرہن کس وقت لگے گا۔ اس لیے ان اشیاء کا فطری قوانین کے تحت سرگرم عمل ہونا تسبیح نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ اس کے بارے تو یہی اللہ نے فرمایا کہ ان کی تسبیح کو تم نہیں سمجھ سکتے۔

اس پر مستزاد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تسبیح اور پاکی بیان کرنے کا طریقہ خود ہی سکھایا ہے۔ آیئے اس بارے قرآن کریم سے چند آیات دیکھتے ہیں۔

☆ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ط وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ط قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۵ (17/93)

”یا آپ کے اپنے لیے کوئی سونے کا گھر ہو جائے۔ یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم تو آپ کے چڑھ جانے کا بھی اس وقت تک یقین نہیں کریں گے۔ جب تک آپ ہم پر کوئی کتاب نہ اتار لایئے جسے ہم خود پڑھ لیں۔ آپ (اے نبیؐ) جواب دیجئے! میرا پروردگار پاک ہے۔ میں تو صرف ایک انسان ہوں جو رسول بنایا گیا ہوں۔“

☆ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ط اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۵۱ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۵ (17/107-108)

”کہہ دیجئے! تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ ایمان لاؤ۔ جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان کے پاس تو جب بھی اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے۔ ہمارے رب کا وعدہ بلاشک وشبہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔“

☆لِتَسۡتَوٗا عَلٰی ظُهُوۡرِهٖ ثُمَّ تَذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ رَبِّكُمۡ اِذَا اسۡتَوَيۡتُمۡ عَلَيۡهِ وَتَقُوۡلُوۡا سُبۡحٰنَ الَّذِىۡ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقۡرِنِيۡنَ ۙ (13/43)

”تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر سوار ہوا کرو پھر اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو۔ جب اس پر ٹھیک ٹھاک بیٹھ جائو اور کہو پاک ذات ہے اس کی جس نے اسے ہمارے بس میں کر دیا۔ باوجودیکہ ہمیں اسے قابو کرنے کی طاقت نہ تھی۔“

☆قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّـكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ ۙ قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۙ (68/28-29)

”ان سب میں جو بہتر تھا اس نے کہا کہ میں تم سے نہ کہتا تھا کہ تم تسبیح (اللہ کی پاکیزگی) کیوں نہیں کرتے۔ تو وہ کہنے لگے، ہمارا رب پاک ہے۔ بے شک ہم ہی ظالم تھے۔“

سبحان اللہ! یہاں بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی۔ سوال بھی ساتھ ہی اور جواب بھی ساتھ ہی۔ نہ کسی قسم کی جدوجہد ہے اور نہ ہی قوانین کے مطابق مصروف کار رہنا ہے بلکہ قَالُوۡا سُبۡحٰنَ رَبِّنَا۔ بس اللہ کی پاکیزگی اور حمد بیان کرنا ہی تسبیح ہے۔

صلوۃ

ان تمام موضوعات میں ایک بات واضح ہے کہ یہ تمام ارکان عبادت کی ایک ہی شکل میں مربوط طریقے سے سرانجام دیئے جاسکتے ہیں اور وہ ہے صلوۃ یا نماز۔ اس کے بارے میں پرویز صاحب کا نقطۂ نظر ہم ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اب ہم قرآن کریم کی چند آیات پر غور کریں گے۔ جن سے صلوۃ (نماز) کا مفہوم مزید واضح ہو جائے گا۔

☆وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ۵ (2/43)

''اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر رکوع کرو۔''

}پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ ''نماز پڑھنا'' تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن ''نماز قائم کرنا'' سے بات واضح نہیں ہوتی۔ وہ ''اقیموا'' کا مطلب Establish کرنا کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ قَامَ قِیَاماً کے معنی ہوتے ہیں کھڑا ہونا۔ اگر ترجمہ ''نماز کھڑی کرنا'' ہو تو پھر شاید ان کا اعتراض ختم ہو جائے۔ جبکہ ''نماز پڑھنا''، ''نماز قائم کرنا'' اور ''نماز کھڑی کرنا'' کوئی سا بھی جملہ ہو۔ قرآنی تراجم ہوں یا معمول کی بول چال۔ کسی بھی فرد کا تصور اس جملے سے مسجد میں نماز کے موجود اجتماع کے علاوہ کسی اور طرف نہیں جاتا۔ اور یہ معاملہ وجہ ءنزاع بھی نہیں ہے۔ کم از کم کسی ایک فرقے نے دوسرے پر اعتراض نہیں کیا کہ تم نے ''نماز قائم کرنا'' کیوں کہا اور '' نماز پڑھو'' کیوں نہیں کہا۔ اصل مفہوم تو سب کے ذہن میں یہی ہے جو ہم ''نماز پڑھنا'' سے سمجھتے ہیں۔

☆وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰھٖمَ مُصَلًّی ؕ (2/125)

''اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے ٹھہرنے اور امن کی جگہ بنا دیا۔ تم مقام ابراہیمؑ کو جائے نماز مقرر کر لو۔''

}یعنی جس مقام پر کھڑے ہو کر ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کی وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک ہر عمرہ اور حج کرنے والا اس مقام پر کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے۔ اور یہ حکم نہ تو کسی حکومتی نظام کے قائم کرنے سے متعلق ہے اور نہ قوانین کی اطاعت کے بارے میں۔ کیونکہ ان دونوں کے لیے تو مقام ابراہیمؑ کو ''مصلّی'' بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ ''بیت اللہ امت مسلمہ کا ایک محسوس مرکز ہے۔ جس میں تمام امت کے معاملات کے فیصلے ہونگے۔ جبکہ مقام حیرت ہے کہ حضورؐ نے سیاسی نظام کا مرکز مدینہ منوّرہ کو بنایا اور خلفائے راشدین اور بعد میں آنے والے حکمرانوں نے اس کو تبدیل نہ کیا۔

☆ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ۵ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْرُکْبَانًا ج فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۵(2/238-239)

”نمازوں کی حفاظت کرو۔ بالخصوص درمیان والی نماز کی۔ اور اللہ کے لیے باادب کھڑے رہو۔ اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل ہی سہی یا سوار ہی سہی۔ پس جب امن کی حالت میں ہو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح کہ اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔“

}پہلے صلوۃ کے بارے میں ایک عمومی حکم ہے اور اس کے بعد کہا کہ خاص طور پر درمیان والی نماز کی حفاظت۔ اگر کسی ”نظام صلوۃ“ یا ”قوانین کے پیچھے چلنے“ کا ذکر ہوتا تو پھر یہ تقسیم تو غیر ضروری تھی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ باادب کھڑے رہو۔ اس کے بعد حالت خوف اور حالت امن کی صلوۃ، اور خوف کی حالت میں سوار یا پیدل ہی نماز ادا کر لینے کا حکم؟ وہ کونسا ”نظام صلوۃ“ ہے یا ”قوانین کی اطاعت“ ہے جس کی یہ خصوصیات ہیں۔ بلکہ یہ سب خصوصیات تو اسی نماز کی ہیں جسے مسلمان پانچ وقت میں ادا کرتے ہیں۔

☆ فَنَادَتْہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ(3/39)

”پس فرشتوں نے اسے آواز دی جبکہ وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔“

}اس آیت سے تو ”صلوۃ“ کے ساتھ یُقِیْمُوْنَ کا استعمال واضح طور پر بتا رہا ہے کہ نماز میں کھڑا ہونے کو ہی اصطلاحاً نماز قائم کرنا کہا جاتا ہے۔ اگر مقصد نظام کی اطاعت ہوتا تو یہاں 'یصلّی' کے ساتھ 'قائم' کا لفظ نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہاں سے بھی واضح ہے کہ حضرت زکریاؑ کھڑے ہو کر نماز ہی پڑھ رہے تھے۔

☆ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ط وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَاَیْدِیْکُمْ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۵۱(4/43)

"اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جائو۔ جب تک کہ تم سمجھنے نہ لگو جو تم کہتے ہو۔ اور نہ جنابت کی حالت میں جب تک کہ غسل نہ کرلو۔ ہاں اگر راہ چلتے گزر جانے والے ہو تو اور بات ہے۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو۔ اور اپنے منہ اور ہاتھ مل لو۔ بے شک اللہ تعالی معاف کرنے والا، بخشنے والا ہے۔"

}اس آیت کو بنیاد بنا کر پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ چونکہ لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس لیے ایسی صلوۃ بلا مقصد ہے۔ دیکھئے پرویز صاحب کے الفاظ۔

"اس آیت میں حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے حکم کی علت سامنے آجاتی ہے۔ یعنی صلوۃ اسی صورت میں صلوۃ ہے جب صلوۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پر نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اس کا علم نہ رکھے۔ یا جہالت کی بنا پر ایسا ہو۔ تو حکم دونوں کا ایک ہی ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نقطہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے ان کے دہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔"

(قرآنی فیصلے جلد اول صفحہ 46)

اس حالت میں صرف نشہ کی حالت کا ذکر ہے۔ جو کہ ایک الگ کیفیت ہے۔ ہوش کی حالت میں عربی متن اور اس کے فہم کی بات نہیں کی جارہی۔ کیونکہ قرآن کریم عربوں پر ان کی زبان میں ہی نازل ہوا۔ اور ان کو اس کا سمجھ میں نہ آنا خارج از امکان ہے۔ باقی رہی عجمی لوگوں کی بات تو ان کو بھی سمجھ آرہی ہوتی ہے کہ اب امام صاحب سورئہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں اور اب "اللہ اکبر" کہا ہے۔ اب "سمع اللہ لمن حمدہ" کہا ہے۔ اور تمام لوگ اس کے مطابق نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ جہاں تک صلوۃ کے مندرجات میں عربی متن کا تعلق ہے۔ تو اس کو

بھی بفضل اللہ کافی تعداد جانتی ہے۔ اور اگر کوئی نہیں جانتا تو یہ تو اس کا انفرادی عمل ہے۔ اور تھوڑی سی کوشش سے اس کمی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ مگر آیت کے اس ٹکڑے کو بنیاد بنا کر صلوۃ کو بلا مقصد قرار دینا درست نہیں۔

پھر آیت کے باقی مندرجات میں ایک ہنگامی مسئلے کی بابت حکم دیا جارہا ہے۔ جس میں پانی کی عدم دستیابی کا ذکر ہے۔ اور اس کا حل بتایا جارہا ہے۔ جو کہ مروجہ نماز کے بارے میں ہی ہے۔ نہ کہ کسی "نظام صلوۃ" یا مشورے کی بابت "اجتماع صلوۃ" کے لیے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں نہ وضو کی کوئی ضرورت ہے اور نہ تیمم کی۔

☆وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ ق صلے اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ط اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۵ وَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَھُمْ قف فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِکُمْص وَلْتَاْتِ طَآئِفَۃٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا فَلْیُصَلُّوْا مَعَکَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَھُمْ وَاَسْلِحَتَھُمْج وَدَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِکُمْ وَاَمْتِعَتِکُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْکُمْ مَّیْلَۃً وَّاحِدَۃً ط وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ کَانَ بِکُمْ اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَکُمْج وَخُذُوْا حِذْرَکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۵ فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْج فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ج اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۵(4/101-103)

"اور جب تم سفر میں جارہے ہو تو تم پر نمازوں کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں، اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔ یقیناً کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ جب تم ان میں ہو پس ان کے لیے نماز کھڑی کرو۔ پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو یہ ہٹ کر تمہارے پیچھے آجائیں اور وہ دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آجائے اور تیرے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔ کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے بے خبر ہو جاؤ تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں۔ ہاں اپنے ہتھیار اتار رکھنے میں اس وقت تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تمہیں تکلیف ہو۔ یا بوجہ بارش کے یا بسبب بیمار ہو جانے کے اور اپنے بچاؤ کی چیزیں ساتھ لیے رہو۔ یقیناً اللہ تعالی نے منکروں کے لیے ذلت کی مار تیار کر رکھی ہے۔ پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اٹھتے بیٹھتے

اور لیٹے اللہ تعالی کا ذکر کرتے رہو۔ اور جب اطمینان پاؤ تو نماز قائم کرو۔ یقینا نماز مومنوں پر مقررہ وقتوں پر فرض ہے۔"

}ان آیات میں نماز کا مفہوم بہت واضح ہو کر سامنے آیا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہنگامی حالت میں عبادت کے ایک اہم رکن نماز کی کیا صورت ہو گی۔ ان آیات سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

ا۔ نماز کا مختصر ہونا

۲۔ اسلحہ اٹھا کر نماز کی ادائیگی

۳۔ پہلے ایک گروہ کا نماز پڑھنا اور پھر دوسرے کا

۴۔ حالت امن میں مروجہ طریقہ کار کے مطابق نماز کی ادائیگی

۵۔ نماز کے لیے مقررہ اوقات

یہ تمام خصوصیات اسی نماز کی ہیں جو امت مسلمہ تواتر کے ساتھ ادا کرتی چلی آرہی ہے اور جو اس وقت معاشرے میں رائج ہے۔ 'صلوۃ' یا 'سجدے' کا لغت سے ماورا کوئی بھی مفہوم مذکورہ بالا خصوصیات پر پورا نہیں اترتا۔ پرویز صاحب نے بھی اس مقام پر آکر یہ کہا کہ اس مراد وہی نماز تھی جو حضورؐ کے دور میں رائج تھی۔ مگر متبعینِ پرویز نے یہاں آکر پرویز صاحب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور کہا کہ یہ "دوران جنگ مشورہ" کا حکم ہے۔ جبکہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ میدان جنگ میں ساری فوج سے کبھی مشورہ نہیں کیا جاتا۔

☆ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ ج وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی لا یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا ۵ (142/4)

”بے شک منافقین اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اللہ بھی انکو دھوکہ دینے والا ہے۔ اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ صرف لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔“

}یہ منافقین کی کیفیت ہے جو صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں جبکہ ان کے دل اس کے لیے راضی نہیں ہیں۔ اور اسی طرح صرف دکھاوے کے لیے ہی ذکر کرتے ہیں۔ اور اس آیت میں الفاظ ” قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى“ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ صرف اسی نماز کی بات کی جارہی ہے جو اس وقت مروج ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ”صلوۃ“ کے ساتھ ”یقیموا“ کا لفظ کیوں لگایا گیا ہے؟ مقصد نماز کی حالت میں کھڑا ہونا ہے۔ نہ کہ کسی چیز کا قائم یا Establish کرنا۔

☆يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ط وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ط وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ط مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۵ (6/5)

”اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو۔ اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پائوں کو ٹخنوں سمیت دھولو۔ اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر لو۔ ہاں اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی حاجت ضروری سے فارغ ہو کر آیا ہو۔ یا تم عورتوں سے ملے ہو۔ اور تمہیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کر لو۔ اسے اپنے چہروں پر اور ہاتھوں پر مل لو۔ اللہ تعالی تم پر کسی قسم کی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا ارادہ تمہیں پاک کرنے کا اور تمہیں اپنی بھرپور نعمت دینے کا ہے۔ تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔“

}اس آیت میں نماز سے پہلے اپنے آپ کو مطہر کرنے کا ذکر ہے۔ اور ایمر جنسی کی صورت میں، اگر پانی دستیاب نہ ہو تو پھر یہ بتایا گیا ہے کہ تم تیمم کر سکتے ہو۔ اور ایمر جنسی کی جو صورتیں اوپر آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ وہ مروجہ نماز پر ہی صادق آتی ہیں۔

☆قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ۵ (87/11)

"انہوں نے کہا اے شعیبؑ! کیا تیری نماز تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اور ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں اس کا کرنا بھی چھوڑ دیں۔ تو تو بڑا ہی باوقار اور نیک چلن آدمی ہے۔"

}اس ایک آیت کی بنیاد پر پرویز صاحب نے صلوۃ کا تعلق معاشیات سے اس طرح جوڑا ہے کہ دونوں کو ایک ہی چیز ظاہر کر دیا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی جہاں قرآن کریم میں صلوۃ اور زکوۃ کا ذکر ہے۔ وہاں ان دونوں کو بھی ایک چیز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی "نظام صلوۃ" جس کا دائرہ معاشیات سمیت تمام امور کو محیط ہو۔

مذکورہ آیت کا ایک ٹکڑا "اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا" کا ترجمہ پرویز صاحب یہ کرتے ہیں کہ "اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔" (مطالب الفرقان۔ جلد اول صفحہ 101)

حالانکہ یہاں مال خرچ کرنے کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس ٹکڑے کا "صلوۃ" والے جملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس چیز کو واضح کرنے کے لیے اس آیت سے پہلے کی چند آیات پیش کرتے ہیں

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط وَلَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْٓ اَرٰکُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ۵ وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۵ بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۵ ج وَمَآ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ ۵ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ۵ (11/84-87)

”اور ہم نے مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ انہوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اور تم ناپ تول میں بھی کمی نہ کرو۔ میں تو تمہیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں۔ اور مجھے تم پر گھیر لانے والے دن کے عذاب کا خوب بھی ہے۔ اے میری قوم، ناپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ اور زمین میں فساد اور خرابی نہ پھیلاؤ۔ اللہ کا حلال کیا ہوا نفع تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔ اگر تم ایماندار ہو۔ میں تم پر کچھ نگہبان اور داروغہ نہیں ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیبؑ! کیا تیری صلوۃ (نماز) تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اور ہم اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں اس کا کرنا بھی چھوڑ دیں۔ تو تو بڑا ہی باوقار اور نیک چلن آدمی ہے۔“

” اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا“ اس پہلی بات کا جواب ہے جس میں ان سے کہا گیا ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ اس لیے اسمیں مال کے خرچ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صلوۃ کا جواب تو اس قوم نے یہ دیا ”اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ“۔

اس لیے پرویز صاحب کا یہ طرز استدلال بالکل غلط ہے صلوۃ اور معاشیات دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ صرف ایک ٹکڑے کو غلط مفہوم پہنا کر دونوں چیزوں کو ایک ہی نہیں کہا جا سکتا۔

☆وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۵ (11/114)

”دن کے دونوں اطراف میں نماز قائم کرو۔ اور رات کی ساعتوں میں بھی۔ یقینا نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔“

} ہم جیسا کہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ مروجہ نماز کے علاوہ صلوۃ کے کسی بھی اور مفہوم کو اوقات کی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے وہ مفہوم ”مشورہ“ ہو یا ”صلوۃ کا اجتماع“ یا ”نظام صلوۃ“، کیونکہ ان تمام چیزوں پر اوقات کی پابندی اور وہ بھی روزانہ کی بنیاد پر نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی وضاحت کر دی کہ نماز کا عمل

نیکی کا ہے جو برائی کو ختم کرتا ہے۔ اس کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ ہر فرد اپنی اپنی توفیق کے مطابق نیکی کو حاصل کرے۔ جبکہ مروجہ نماز کے عمل سے ہٹ کر ایسا کرنا ناممکن ہے۔

☆اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ط اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا ۵۱(17/78)

''اور نماز قائم کرو آفتاب کے ڈھلنے سے رات کی تاریکی تک اور فجر کا قرآن پڑھنا بھی۔ یقیناً فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔''

}اس آیت کریمہ میں صلوۃ کے پانچ اوقات کا ذکر ہے۔ جس میں دُلُوۡکِ الشَّمۡسِ (ظہر، عصر اور مغرب) کو ظاہر کرتا ہے اور غسق الیل (عشاء) اور فجر کے لیے فَجۡرِ۔ لفظ دُلُوۡکِ کے بارے میں پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

''ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا دوسری چیز سے ہٹ جانا (زوال) بتائے ہیں۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ دُلُوۡکٌ میں کسی چیز کا نرمی اور آسانی سے ہٹ جانا پایا جاتا ہے۔ ملنے، رگڑنے کے لیے بھی یہ لفظ اسی جہت سے استعمال ہوتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں ہاتھ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے ہیں۔ اس لیے زوال بھی دلوک ہے۔ اور غروب بھی دلوک ہے۔ جب آفتاب نصف النہار میں زوال کر جاتا (ڈھل جاتا) ہے تو اسے دَالِکَۃ کہتے ہیں۔ ایسے ہی جب وہ غروب ہو جائے تب بھی اسے دَالِکَۃ کہتے ہیں۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں اسے زوال ہوتا ہے۔ لیکن نوادرالاعراب میں ہے کہ اس کے معنی آفتاب کے بلند اور اونچا ہونے کے آتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دال (د) جہاں بھی لام (ل) کے ساتھ آئے گا تو وہ حرکت کرنے، آنے جانے، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ زوال پذیر ہونے پر دلالت کرے گا۔''

''ان تمام معانی سے واضح ہے کہ اصل معنے اس مادہ کے حرکت کرنے ہی کے ہیں۔ لہذا جب آفتاب طلوع صبح سے دوپہر تک بلند ہوتا جاتا ہے تو اسے بھی دُلوکٌ کہیں گے۔ (جیسا کہ نوادرالاعراب کے حوالہ سے اوپر

لکھا گیا ہے) اور جب وہ نصف النہار تک پہنچ کر نیچے کی طرف حرکت کرے گا (یعنی ڈھلنا شروع ہو گا) تو اسے بھی دُلوکؐ کہیں گے۔"

"قرآن کریم میں ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِط (17/78) اس کا عام ترجمہ یہ ہو گا "صلوۃ قائم کرو دلوک شمس سے غسق لیل تک۔ اور فجر کا قرآن۔" یہاں اگر دُلوکؐ کے معنی عام حرکت کے لئے جائیں تو اس میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا سارا وقت آ جاتا ہے۔ اور قران الفجر طلوع آفتاب سے پہلے، اور غسق لیل غروب آفتاب کے بعد۔ یعنی اس طرح اس آیت میں سونے کا وقت نکال کر باقی دن رات کا سارا وقت آ جاتا ہے۔ مفہوم ظاہر ہے کہ صلوۃ کے لیے یہ سارا وقت تمہارے لیے کھلا رکھا ہے۔"

"سورۃ نور میں صَلٰوۃُ الْفَجْرِ اور صَلٰوۃُ الْعِشَاۗءِ (24/58) کا خصوصیت سے نام لیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن کریم (رسول اللہؐ) کے زمانہ میں ان دونوں اوقات میں اجتماعات صلوۃ ہوتے تھے۔ یہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اور غَسَقَ الَّیْلِ کے اوقات تھے۔ باقی وقت دُلُوْکِ الشَّمْسِ سے غَسَقَ الَّیْلِ تک کا ہے۔ اسے صبح سے شام کہہ لیجئے یا سورج ڈھلنے سے شام تک کا وقت۔ دُلُوکؐ کے عام مفہوم کے اعتبار سے پہلے معانی (صبح سے شام تک کا وقت) لغوی اعتبار سے زیادہ موزوں ہونگے۔"

ان تصریحات کے بعد پرویز صاحب صلوۃ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

"صلوۃ سے متعلق عنوان (ص۔ل۔و) میں آپ دیکھیں گے کہ صلوۃ سے مراد صرف وقتی اجتماعات نماز ہی نہیں۔ اس سے مراد قرآنی نظام یا قرآن کریم کے مطابق متعین کردہ فرائض زندگی بھی ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس آیت (17/78) میں بھی اقامت صلوۃ کے معنی فرائض زندگی کی سرانجام دہی یا قرآنی نظام کے قیام کے لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آغاز کار سے پہلے (ہر روز صبح دم) یہ دیکھو کہ زیر نظر پروگرام کے لئے

قرآن کریم کی طرف سے کیا راہنمائی ملتی ہے۔ (یہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ہو گا) اور پھر صبح سے شام تک اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف کار رہو۔ یہ اقامت صلوۃ دلوک شمس سے غسق لیل تک ہو گا۔"

یہ پرویز صاحب کا طریق کار ہے کہ الفاظ کی لغوی تشریحات تو آئمہ لغت کی بیان کرتے ہیں اور مفہوم ان کا اپنا ہوتا ہے۔ صلوۃ کے متعلق درج کردہ دیگر آیات کو مد نظر رکھیں اور پھر دیکھیں کہ کیا پرویز صاحب کا یہ مفہوم اس سے ملتا ہے یا نہیں۔ حالانکہ دلوک الشمس سے مراد سورج کی مخصوص حرکات ہیں۔ لیکن انہوں نے کمال ہنر مندی سے اسے "صبح سے شام تک" کے معانی پہنا دیئے۔

☆ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۵(110/17)

"کہہ دیجئے! کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔ نہ تو تو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ بالکل پوشیدہ۔ بلکہ اس کے درمیان کا راستہ تلاش کر۔"

}اب کونسے فرائض زندگی ہیں جن میں آواز کی میانہ روی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ تو صرف عبادت کا خاص طریقہ "نماز" ہی ہے جس پر یہ حکم لاگو ہوتا ہے۔"

☆ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۵(130/20)

"پس ان کی باتوں پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور تعریف بیان کر تارہ سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، رات کے مختلف وقتوں میں بھی اور دن کے دونوں حصوں میں بھی تسبیح کر۔ بہت ممکن ہے کہ تو راضی ہو جائے۔"

}اسی آیت میں واضح طور پر پانچ اوقات کا ذکر کر دیا گیا ہے اور صلوۃ کے لیے بھی تسبیح کا لفظ لگایا گیا ہے۔ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ "نماز" کے علاوہ کسی بھی اور مفہوم کو وقت کی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

☆اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۵(22/41)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پائوں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نماز ادا کریں اور زکوۃ دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔"

}اس آیت کو بنیاد بنا کر پرویز صاحب نے ایک نظریہ یہ بنایا کہ صلوۃ کا قیام صرف اپنی آزاد مملکت میں ہی ممکن ہے اور اس آیت کا ترجمہ وہ اس طرح کرتے ہیں۔ "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہو گا، ان کی اپنی مملکت قائم ہو گی تو یہ اقامت صلوۃ اور ایتائے زکوۃ کا فریضہ سر انجام دیں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور منکر سے روکیں گے"

ضروری ہے کہ اس آیت سے پہلے والی آیت بھی سامنے آجائے تا کہ مفہوم واضح ہو جائے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ۵ نِالَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ط وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ط وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہَ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ط اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۵ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۵(22/39-41)

"جن مسلمانوں سے کافر جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ ہیں جنہیں بلا وجہ اپنے گھروں سے نکالا گیا صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالی لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت خانے اور گرجے

اور مسجدیں اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ویران کر دی جاتیں جہاں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ بھی ضرور اس کی مدد کریگا۔ بے شک اللہ تعالی بڑی قوتوں والا، بڑے غلبے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پائوں جمادیں تو یہ پوری پابندی سے نماز ادا کریں اور زکوۃ دیں۔ اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔ تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔"

یہاں سے واضح ہے کہ بات ہو رہی ہے ان لوگوں کی جن کو نکالا گیا ان کے گھروں سے کہ اگر ان کو زمین میں جمادیا جائے تو احکام خداوندی پر عمل کریں گے۔ یہاں کسی قسم کی حکومت حاصل کرنے کی بات نہیں کی جارہی۔ جبکہ حکومت کے لئے "استخلاف" کا لفظ قرآن کریم نے (24/55) میں استعمال کیا ہے۔ اور دوسرے مقامات پر خلیفہ کا لفظ بھی آیا ہے۔ جبکہ (24/55) میں ہی "وَلَيُمَكِّنَنَّ" کا لفظ استعمال کر کے بتادیا کہ یہ کسی چیز کو محکم کرنا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں دو آیات جن سے واضح ہو گا کہ صلوۃ کا قیام بغیر حکومت کے بھی چلتا رہا ہے

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۵ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّىْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۵ فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِىَ يٰمُوْسٰى ۵ اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۵ ط وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۵ اِنَّنِىْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِىْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ۵ (20/9-14)

"تجھے موسیٰؑ کا قصہ بھی معلوم ہے جبکہ اس نے آگ دیکھ کر اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ذرا سی دیر ٹھہر جائو۔ مجھے آگ دکھائی دی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میں اس کا کوئی انگارا تمہارے پاس لائوں یا آگ کے پاس راستے کی اطلاع پائوں، جب وہ وہاں پہنچے تو آواز دی گئی کہ اے موسیٰؑ یقیناً میں ہی تیرا پروردگار ہوں۔ تو اپنی جوتیاں اتار دے کیونکہ تو پاک میدان طوٰی میں ہے۔ اور میں نے تجھے منتخب کر لیا ہے۔ اب جو وحی کی جائے اسے کان لگا کر سن۔

بے شک میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا عبادت کے لائق اور کوئی نہیں۔ پس تو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ط وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ج وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۵ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۵ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ج رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۵ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۵ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۵ (10/83-87)

"پس موسیٰؑ پر ان کی قوم میں سے صرف تھوڑے آدمی ایمان لائے وہ بھی فرعون سے اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں ان کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ اور واقعی فرعون اس ملک میں زور رکھتا تھا۔ اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد سے باہر ہو جاتا تھا۔ اور موسیٰؑ نے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو۔ اگر تم اطاعت کرنے والے ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو ان ظالموں کا تختہء مشق نہ بنا۔ اور ہم کو اپنی رحمت سے ان کافر لوگوں سے نجات دے۔ اور ہم نے موسیٰؑ اور ان کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے ان لوگوں کے لیے مصر میں گھر برقرار رکھو اور تم سب اپنے انہی گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔ اور مومنوں کو بشارت دے دیجئے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان لانے کے ساتھ ہی نماز پڑھنے کا حکم ہے نہ کہ اس کے لیے کسی آزاد مملکت کی ضرورت ہونا۔ اس لیے پرویز صاحب کا یہ نظریہ غلط ہے کہ صلوۃ کے لیے آزاد مملکت کی ضرورت ہے۔ اور اس کے بغیر یہ فرائض ادا نہیں ہو سکتے۔

☆یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِیَسۡتَاۡذِنۡکُمُ الَّذِیۡنَ مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ مِنۡکُمۡ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ وَ حِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَکُمۡ مِّنَ الظَّہِیۡرَۃِ وَ مِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ ۟ؕ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّکُمۡ ؕ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ وَ لَا عَلَیۡہِمۡ جُنَاحٌۢ بَعۡدَہُنَّ ؕ طَوّٰفُوۡنَ عَلَیۡکُمۡ بَعۡضُکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ۵(24/58)

”اے ایمان والو! تم سے تمہاری ملکیت کے غلاموں کو اور انھیں بھی جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں اپنے آنے کی تین وقتوں میں اجازت حاصل کرنی ضروری ہے۔ نماز فجر سے پہلے اور ظہر کے وقت جب کہ تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تینوں وقت تمہاری خلوت اور پردہ کے ہیں۔ ان وقتوں کے ماسوا نہ تم پر گناہ ہے اور نہ ان پر تم سب آپس میں ایک دوسرے کے پاس بکثرت آنے جانے والے ہو۔ اللہ اسی طرح کھول کھول کر اپنے احکام تم سے بیان فرمارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمت والا ہے۔“

} یہاں نماز کے تین اوقات کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ اوقات شروع سے متعین چلے آرہے ہیں۔ اس لیے عربوں کو ان میں کسی قسم کا کوئی تردد نہیں ہوا۔ اور آج تک ان احکامات پر اسی انداز میں عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ کسی عربی نے ان اصطلاحات کے مفاہیم پر اعتراضات نہیں اٹھائے۔

☆وَ قَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی وَ اَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتِیۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ اَطِعۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ۵(33/33)

”اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو۔ اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو۔ اور نماز ادا کرتی رہو۔ اور زکوۃ دیتی رہو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو۔ اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ ہر قسم کی لغویات کو دور کرے اور تمہیں خوب پاک کردے۔“

}لیجئے وہ سارے احکامات جن کے لیے پرویز صاحب آزاد مملکت کا حصول لازم قرار دیتے ہیں۔ ان کو گھر کے اندر پورا کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ اس کا تعلق خواتین سے ہے۔ اب پرویز صاحب سے پوچھا جائے کہ گھر کے اندر کونسا "اجتماع صلوۃ" ہے یا وہ کونسے فرائض منصبی ہیں جن کو صلوۃ کہا جارہا ہے؟

☆ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۵ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۵ (62/9-10)

"اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف جلدی آیا کرو۔ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے حق میں بہت ہی بہتر ہے۔ پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور بکثرت اللہ کا ذکر کیا کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔"

}اس آیت میں جمعہ کی نماز کے لیے جلدی کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور اس کے لیے دنیاوی معاملات چھوڑنے کا حکم ہے۔ اور پھر نماز کے بعد دوبارہ سے دنیاوی معاملات شروع کرنے کا ذکر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرویز صاحب تو دن بھر کے معاملات کو ہی صلوۃ قرار دیتے ہیں۔ اب اس آیت میں جس تجارت کے چھوڑنے کا حکم دیا جارہا ہے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے مطابق ہی ہو رہی ہوتی ہے۔ مگر اس کو چھوڑ کر نماز کی تاکید ظاہر کرتی ہے کہ صلوۃ کا تعلق خرید و فروخت اور تجارت اور دن بھر کے معاملات سے ہر گز نہیں ہے۔ یہ تو صرف اللہ کی عبادت کا ایک جزو ہے۔

اس آیت کی تفسیر کے لیے پرویز صاحب کا ویڈیو درس دیکھئے تو سب سے پہلے پرویز صاحب کو نماز پڑھتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ اور اب تک نماز کے حق میں جتنے بھی پرویز صاحب کے بیانات ہم نے درج کئے ہیں ان کے علی الرغم درس کے اندر ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے صریحاً نماز کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ ان کے الفاظ اس طرح ہیں

"نماز پڑھنے والے مصلّین کی تعداد تو کم نہیں ہے۔ کم ہو بھی تو کوششیں یہ ہو رہی ہیں کہ ان میں اور اضافہ ہو جائے۔ وہ جتنا کچھ کر رہے ہو۔ اس نے کیا کر کے دکھا دیا کہ جو اور ان میں اضافہ کر دو گے تم۔ اضافہ کرنے والے جو ہیں وہ اسلام کے احیاء کے لیے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ کیا اور پڑھنے والے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ تباہیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔"

(ویڈیو درس سورۃ جمعہ آیت 9 کیسٹ نمبر 3)

اس کے علاوہ بھی اس درس میں بہت سی باتیں ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ پرویز صاحب کی شعوری کوشش تھی کہ لوگوں کو نماز پڑھنے سے روکا جائے۔ مگر یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس میں بہت زیادہ معاشرتی دبائو کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لیے پرویز صاحب کو اس کے حق میں بھی بیانات دینے پڑے۔ اور یہ کہنا پڑا کہ میں حنفی طریقہ کار کے مطابق نماز پڑھتا ہوں۔ مگر مجموعی طور پر پرویز صاحب کی کیفیت دوغلی رہی۔ وہ کبھی بھی یک طرفہ رائے کا اظہار نہ کر سکے۔ ایک طرف تو انہوں نے اپنے دروس میں بارہا کہا کہ میں موجودہ نماز کا انکار نہیں کرتا۔ مگر دوسری طرف ایسے ایسے نکات اٹھائے جو لوگوں کو نماز سے دور کرنے کا باعث بنے۔

صلوۃ اور فحشاء و منکرات۔

قرآن کریم کی آیت ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (29/45) بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ اس کے بارے میں پرویز صاحب کا کہنا ہے "جہاں تک ہماری نمازوں کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ ان سے فحشاء اور منکرات نہیں رکتے۔ بے نمازوں کو تو چھوڑیئے کتنے ہی نمازی ہیں جو بڑی باقاعدگی سے نمازیں پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود منکرات کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔"

یہاں بات آتی ہے منافقت کی۔ اور منافق تو نبی کریمؐ کے دور میں بھی موجود تھے جو ظاہری طور پر مسلمان بنے ہوئے تھے مگر ان کے دل کفر کے ساتھ تھے۔ اب کوئی یہ دلیل دے کہ چونکہ اسلام میں منافق

ہوتے ہیں اس لیے اسلام سچا دین نہیں ہے اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔ تو یہ بڑی عجیب منطق ہوتی۔ ان کا عمل ان کے ساتھ ہے جس کے وہ جوابدہ ہونگے۔ لیکن ان کی آڑ میں جو پکے سچے مومن ہیں ان کا بھی بیڑہ غرق کر دیا جائے۔ اب اگر کوئی نمازی برائی کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس کی وجہ سے جو نیک، پرہیز گار لوگ ہیں ان کو بھی نماز پڑھنے سے روک دیا جائے؟ اس میں قصور اس نمازی کا ہے یا نماز کا؟ یہ تو ایسی ہی دلیل ہے کہ آجکل دنیا میں جتنے اسلامی ملک ہیں وہ انسانوں کے حقوق کماحقہ پورا کرنے سے عاری ہیں یا اسلامی معاشرے مادی ترقی کی معراج کو نہیں پہنچے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اسلام کو چھوڑ دیا جائے؟ یا عیسائیت کو قبول کر لیا جائے؟ معاذ اللہ! اس میں تو اسلام کا کوئی قصور نہیں ہے۔

پرویز صاحب اکثر ایک دلیل دیتے ہیں "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ اور اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔" اس کی توضیح میں پرویز صاحب اور ان کے متبعین یہی کہتے ہیں کہ "ہم صحیح مومن نہیں ہیں اور قرآن کی بات سچ ہے۔" مگر نماز کے مسئلہ پر اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ "لوگ صحیح نماز پڑھتے ہیں مگر یہ نماز غلط ہے۔" یہ کیسا تضاد ہے۔ لوگوں کو اپنی نماز کی طرف توجہ دینی چاہئے نہ کہ اس کے کسی اصول کو ہی جھٹلا دیا جائے۔

موجودہ نماز تفرقہ کا مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ہی پرویز صاحب کا یہ کہنا ہے کہ "قرآن کریم نے صلوۃ کو امت میں ۔۔۔ وحدت پیدا کرنے اور رحمت بر قرار رکھنے کا ذریعہ بتایا تھا۔ لیکن وائے بد نصیبی کہ اب وہی صلوۃ (نماز کی شکل میں) امت کے تفرقہ کا مظہر قرار پا گئی۔"

بات پھر وہی ہے کہ اس میں نہ تو اسلام کا کوئی قصور ہے نہ ہی نماز کا۔ لوگوں نے خود ہی اس میں تفرقے پیدا کر لیے ہیں۔ اور مختلف حکمرانوں نے اپنے مفادات کی خاطر ان کو پروان چڑھایا ہے۔ اور پھر فرقہ بندی کا یہ سلسلہ اسلام کے بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اور نماز کے بارے میں فرقوں کے جو اختلافات ہیں ان کا اساسات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی فرد ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھ رہا ہے کوئی ہاتھ باندھ کر پڑھ رہا ہے۔ کوئی رفع یدین کر رہا ہے

تو کوئی نہیں کر رہا۔ اس سے نماز کی ہیئت پر فرق نہیں پڑتا۔ بنیادی باتیں رکوع، سجود، قیام اور تسبیح میں تمام فرقے ایک ہی جیسا عمل کر رہے ہیں۔ اور یہ عمل عبادت کی شکل (نماز) میں بہ احسن و خوبی سرانجام پا رہا ہے۔ خدا کرے کوئی ایسی حکومت آئے جو ان کو ایک جگہ بٹھا کر پوری قوم میں ایک ہی طریقہء کار پر راضی کر لے۔ مگر اس چیز کو بنیاد بنا کر نماز کو ہی رد نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس بارے میں تو پرویز صاحب نے خود کہا ہے۔

"جب تک یہ نظام قائم نہیں ہوتا، میرا مسلک یہ ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس انداز سے ان پر کاربند ہیں وہ ان پر اسی طرح کاربند رہیں۔"

جزئیات۔ بہت سے لوگ اس لیے نماز نہیں پڑھتے کہ وہ کہتے ہیں قرآن کریم نے اس کی جزئیات کا تعین نہیں کیا۔ یعنی کتنی رکعتیں ہوں، اور ان کے اندر کیا کچھ پڑھا جائے۔ تو ان لوگوں سے عرض ہے کہ قرآن کریم کو وحی کی پہلی کتاب نہ سمجھیں۔ بلکہ قرآن کریم تو وحی کی آخری کتاب ہے۔ اس میں اگر جزئیات بیان نہیں ہوئیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ جزئیات مقصود بالذات نہیں ہیں۔ پھر پہلی تمام امتیں نماز اور عبادت کے دیگر فرائض سرانجام دیتی آ رہی ہیں اور خود عربوں میں بھی یہ مسئلہ (حضورؐ کے زمانے میں) کبھی نہیں اٹھا کہ نماز کیسے پڑھنی ہے۔ قرآن کریم میں کل تیرہ سوال ہوئے ہیں جیسے "یَسۡئَلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ" وغیرہ۔ مگر نماز کے بارے میں کسی نے نہیں پوچھا۔ اس لیے کہ ان کے باپ دادا ایسا عمل کرتے چلے آ رہے تھے۔ اور قرآن کریم سے پہلی کتابوں میں یہ تمام احکامات درج تھے۔ پھر ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ نے جو دعا مانگی "وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا" تو اس کے بعد تواتر کے ساتھ ہی وہ سارے احکامات بعد میں آنے والی امتوں میں منتقل ہو گئے۔

یہ تو ایک آرڈر ہے جس کا Obey کرنا ضروری ہے۔ اگر اس میں ایسے سوالات پیدا کر دیں جیسے موسیٰؑ کی قوم نے بچھڑے کے بارے میں کئے تھے تو پھر تو معاملہ سلجھ ہی نہیں سکتا۔ آپ order کو Obey کریں۔ چاہے کسی بھی رنگ میں کیوں نہ ہو۔ مگر ایسے سوالات پیدا کر کے اپنے آپ کو فریضہء نماز سے بری الذمہ قرار نہ دیں۔ نماز نہ پڑھنے کے تو آپ سینکڑوں عقلی دلائل دے سکتے ہیں۔ مگر کیا آپ کے دلائل کو قرآن کریم کی

support میسر ہے یا نہیں؟ اگر آپ کو طریقہء کار میں کوئی ابہام نظر آتا ہے تو جس طرح جمہور اہل امہ یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں اس کے مطابق ادا کریں۔

{☆☆☆☆☆}

باب ہفتم: ہنر ش نیز بگو

اب تک ہم نے پرویز صاحب کی قرآنی بصیرت سے متعلق چند اساسات کا تجزیہ قرآنی آیات کی روشنی میں کیا ہے۔ لیکن یہ سارے وہ موضوعات تھے جن پر میری سمجھ کے مطابق پرویز صاحب کا نقطۂ نظر درست نہ تھا۔ لیکن میری پرویز صاحب سے کوئی ذاتی خلش نہیں ہے۔ اور میرے خیال میں یہ بد دیانتی ہو گی اگر میں ان کی خوبیوں اور ان کے اچھے کام کو سامنے نہ لائوں۔ اس لیے اب میں چند ایسے موضوعات پر قلم اٹھائوں گا جن کے بارے میں پرویز صاحب کا نقطۂ نظر ازروئے قرآن کریم بالکل درست ہے۔ گو معاشرہ کے کچھ طبقات نے ان کو غلط سمجھا۔ وہ موضوعات اس طرح ہیں۔

تصوف

تصوف ہمارے معاشرے میں جیسے رچ بس گیا ہے۔ کوئی شہر اور قصبہ ایسا نہیں جہاں کوئی مزار نہ ہو اور مردوں اور عورتوں کا ہجوم نہ لگا ہو۔ ابنیاء علیہم السلام نے تمام عمر توحید کا پرچار کیا اور قرآن کریم نے بارہا اس چیز کو اجاگر کیا کہ خدائے واحد اللہ تعالی کی ذات ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ وہ سنتا ہے جانتا ہے دیکھتا ہے اور اس کے علم سے کوئی بات مخفی نہیں ہے۔ اسی لیے جو بھی حاجت ہو صرف اسی کے سامنے پیش کرو کیونکہ فقط وہی حاجت روا ہے۔ مگر ہمارے معاشرے کی اکثریت پر اس تعلیم کا کوئی اثر نہیں اور عمومی رویہ یہ ہے کہ کسی کا کاروبار نہیں چل رہا تو فلاں بزرگ سے تعویذ لے آئو۔ کسی عورت کے اولاد نہیں ہو رہی تو فلاں مزار پر جاکر منت مانو۔ اور مرید اپنے پیر کی ایسی صفات بیان کرتے ہیں کہ عام توہم پرست لوگ صرف انہی کو حاجت روا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور اس چیز نے معاشرے کو بری طرح اپنی پکڑ میں لپیٹا ہوا ہے۔ ہر دوسرے شخص نے گلے یا بازو میں تعویذ لٹکا رکھا ہے اور ہر کوئی کسی نہ کسی سے دم کروانے جارہا ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اس مسئلے میں قرآن کریم کی راہنمائی کیا ہے اور سادہ لوح عوام اور توہم پرست لوگوں کی وجہ

سے ان حضرات کی دکانداریاں اپنے عروج پر ہیں اور اس میں ان پڑھ طبقہ اور پڑھا لکھا طبقہ ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں ایسا نہ تو انبیاء کرامؑ کی سنت ہے اور نہ ہی صحابہ کرامؓ کا طریقہ۔ اور نہ ہی علم کی بارگاہ سے ان کو مدد حاصل ہے۔

اب تو کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کا عرس جاری رہتا ہے۔ اور وہاں پر جو کچھ ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ حالانکہ نہ تو انبیاء کرامؑ کی تعلیم ایسی تھی اور نہ ہی بزرگان دین کا شیوہ۔ نام سے یہ لوگ مسلمان ہیں مگر عملی طور پر خدا کی وحدانیت سے انکار اور اس کی صفات میں شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالی فرماتا ہے اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَیَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿ؕ۶۲﴾ (27/62)

"کون ہے جو تکلیف زدہ کی پکار کو قبول کرتا ہے جب وہ پکارے، اور سختی کو دور کر دیتا ہے۔ اور تمہیں زمین کی بادشاہت عطا کرتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے۔ بہت کم ہیں جو نصیحت پکڑتے ہیں۔"

تصوف کے موضوع پر پرویز صاحب کی تصنیف "تصوف کی حقیقت" ایک مبسوط کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے نہ صرف تصوف کے فلسفہ کا علمی محاکمہ کیا ہے بلکہ ان تمام عقائد کا قرآن کریم کی روشنی میں ابطال کیا ہے جو اس وقت رواج پا چکے ہیں۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ "تصوف اور اسلام" اور دوسرا حصہ "تصوف اور اقبال" ہے۔ دوسرے حصے میں پرویز صاحب نے تصوف کے معاملے میں اپنے ممدوح علامہ محمد اقبال پر کڑی تنقید کی ہے۔ کتاب کے شروع کے صفحات میں پرویز صاحب لکھتے ہیں

"اپنے مطالعہ اور عملی تجارب سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو کچھ "روحانیت" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ ایک فن ہے۔ جس طرح جسمانی کسرت سے انسان کی طبیعی قوتوں میں ناقابل یقین حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس قسم کی ذہنی مشقوں سے انسان کی قوت ارادی اور تخیئلی میں ایسا اضافہ ہو جاتا ہے جس کا عام حالات میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ جسمانی قوت کا مشاہدہ محسوس طور پر ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے کوئی فوق الفطرت تصور نہیں کرتا۔ لیکن قوت ارادی غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے مظاہر فوق الفطرت سمجھے جاتے ہیں۔ جو

قومیں علمی میدانوں میں آگے بڑھ گئی ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہو گئی ہیں۔ جہاں ہنوز توہم پرستی کا دور دورہ ہے۔ وہاں اسے "روحانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں اس نتیجہ پر اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر پہنچا ہوں۔ لیکن میں انہیں بطور سند نہیں پیش کرنا چاہتا۔ میری سند قرآن کریم ہے۔ اس میں اس قسم کی روحانیت کا کوئی ذکر نہیں۔ میرے ذاتی تجربات، قرآن کے اس دعوی کی صرف تائید کرتے ہیں۔ لیکن تصوف کے خلاف میرے نظریات کی وجہ یہی نہیں کہ اس میں اس قسم کے ذاتی تجربات اور واردات کو فوق الفطرت روحانی مشاہدات سمجھ لیا جاتا

ہے۔ میرے اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تصوف کے عقائد، اسلام کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے الدین (اسلام) کا مقصود و منتہی یہ ہے کہ

ا۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے۔ اور

۲۔ ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے۔ جس کی رو سے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان قوتوں کو نوع انسان کی منفعت، بہبود اور نشو و نما کے لیے اس طرح صَرف میں لایا جائے کہ یہاں کی زندگی بھی سرفرازیوں اور کامرانیوں کی ہو۔ اور انسان اخروی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔

یہ ہے دین کا ماحصل۔ تصوف ان ہر دو مقاصد حیات کے خلاف ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ

ا۔ یہ کائنات باطل ہے۔ اس کا در حقیقت وجود ہی نہیں۔ لہذا فطرت کی قوتوں اور ان کی تسخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور

۲۔ انسانی زندگی کا مقصد ایک فرد کی "روحانی" ترقی ہے جو مختلف قسم کے مراقبوں اور ریاضتوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس میں اجتماعیت کا تصور ہی نہیں۔ کشف والہام اور کرامات اسی روحانی ترقی کے مظاہر ہیں۔

۳۔ قرآن اپنی تعلیم اور پیام کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرتا ہے۔ اور دلائل و براہین کی روشنی میں منواتا ہے۔ تصوف علم و عقل کا دشمن اور دلیل و برہان کا نقیض ہے۔

آپ نے دیکھا کہ مسلک اور عقیدہ کے لحاظ سے تصوف اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(تصوف کی حقیقت۔ صفحہ م۔ن)

اب ہم ذیل میں کتاب کے مشمولات درج کرتے ہیں تاکہ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

حصہ اول (تصوف اور اسلام)

ا۔علم بالحواس کی اہمیت ۲۔وحیءخداوندی ۳۔تصوف (قدیم مذاہب میں)

۴۔روحانیت ۵۔اسلام میں تصوف کہاں سے آیا

۶۔مسلمان صوفیا اور ان کے عقائد (۱)

ا۔حلول ب۔وحدت الوجود ج۔وحدت الشہود

۷۔مسلمان صوفیاء اور ان کے عقائد (۲)

۸۔کرامات

ا۔پیشین گوئیاں ب۔جادو کی حقیقت

ج۔مسمریزم د۔ہپناٹزم

۹۔یہ ہوتا کیسے ہے ۱۰۔اولیاء اللہ کون ہیں۔

۱۱۔مقام نبوت و منصب امت

حصہ دوم (تصوف اور اقبال)

ا۔اقبال نثر میں ۲۔معرکہءاقبال و تصوف

۳۔شعر کی زبان میں

ا۔وحدت الوجود ب۔باطنی معانی ج۔عقل و عشق د۔فقر ر۔دو قسم کا تصوف ز۔اقبال کا فلسفہءتصوف

یہ تھے مشمولات "تصوف کی حقیقت" کے۔ اس کتاب نے قوم کے پڑھے لکھے طبقے کو تصوف سے بچنے اور پیری فقیری کی راہ سے روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ختم نبوت

ختم نبوت کے موضوع پر بھی پرویز صاحب نے انتہائی قابل تعریف کام کیا ہے۔ ان کی تصنیف کا نام "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" ہے۔ اس میں انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مذہبی تصورات کو علمی اور عقلی طور پر غلط ثابت کیا ہے۔ آیئے اس کتاب کے کچھ اقتباسات دیکھتے ہیں۔

"میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں، میں سیدھا سادھا مسلمان ہوں اور قرآن کا ادنی طالب علم۔ اور اس کی تعلیم کا مبلغ۔ ختم نبوت چونکہ (میری قرآنی بصیرت کی رو سے) دین کی اصل اور اسلام کی بنیاد ہے۔ اس لیے میں اسے اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کو قرآن کریم کی روشنی میں واضح طور پر سامنے لائوں۔ میں نہ کسی بحث میں پڑنا چاہتا ہوں نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا۔ میں اس موضوع کو علمی سطح پر رکھنا چاہتا ہوں۔ مرزا صاحب کی تحریروں میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جسے "عام بازاری سطح" پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے احتراز کروں گا۔ مرزا صاحب کا دعوٰی نبوت کا ہو یا مثیل مسیح وغیرہ کا۔ میری تحقیق کی رو سے یہ تمام دعاوی قرآن کریم کے خلاف اور کذب و افتراء ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ایک جماعت کے نزدیک واجب الاحترام ہیں اور قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ تم مشرکین کے معبودوں کے متعلق بھی کوئی دلآزار بات نہ کرو۔(6/109) اس لیے انہیں "مرزا صاحب" کہہ کر پکاروں گا۔ مرزائی حضرات اپنے آپ کو "احمدی" کہتے ہیں۔ لیکن میں ان کی اس نسبت

کو صحیح نہیں سمجھتا۔ کیونکہ احمدؐ، حضور نبی اکرمؐ کا اسم گرامی تھا۔ اور یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی جہت سے اپنے آپ کو احمدی نہیں کہتے بلکہ مرزا غلام احمد صاحب کی نسبت سے ایسا کہتے ہیں۔ بایں ہمہ میں انہیں "احمدی" کہہ کر ہی پکاروں گا۔ کیونکہ یہ مرزائی کہلانے سے گریز کرتے ہیں۔"

(ختم نبوت اور تحریک احمدیت، سٹوڈنٹ ایڈیشن صفحہ 11)

"قرآن کریم میں نہ کسی مجدد کا ذکر ہے، نہ مہدی کا۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ بذات خود تشریف لانے کا ۔یا ان کے مثیل کے آنے کا۔ "مسیح موعود" کی اصطلاح بھی غیر قرآنی ہے۔ اس میں کسی مسیح کے آنے کا وعدہ نہیں کیا گیا۔ یہ تمام نظریات ہمارے ہاں روایات کے ذریعے جزو

اسلام بن گئے۔ چونکہ یہ تصورات بنیادی طور پر ختم نبوت کے نقیض تھے اس لیے انہوں نے بھی دعوٰئے نبوت کے لیے راستے کھول دیئے۔ میں نے شروع میں کہا ہے کہ ریاست بہاولپور کی عدالت میں یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیر سماعت رہا اور ہندوستان کے جید علما کرام نے حصہ لیا۔ لیکن فاضل جج کو یہ کہنا پڑا کہ ان حضرات کی اس قدر طول طویل بحثوں کے باوجود ان پر مقام نبوت واضح نہیں ہو سکا۔ اور وہ ختم نبوت کی کنہ و حقیقت کو سمجھ نہیں سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تمام حضرات مانتے تھے کہ براہ راست خدا سے علم حاصل کرنے کا امکان، رسول اللہؐ کے بعد بھی باقی ہے اور ایسا علم حاصل کرنے والے حضورؐ کے بعد آتے رہیں گے۔ اس عقیدہ کی موجودگی میں نہ حقیقت نبوت واضح ہو سکتی ہے نہ ختم نبوت کی اہمیت مبرہن۔ اس کے برعکس، یہ عقیدہ دعوٰئے نبوت کے حق میں دلائل مہیا کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔" (صفحہ 42)

"حقیقت یہ ہے کہ "احمدیت" کی تحریک مذہبی تھی ہی نہیں۔ یہ ایک سیاسی تحریک تھی جو انگریزوں کی پیدا (یا پرورش) کردہ تھی۔ تفصیل اس اجمال کی غور سے سننے کے قابل ہے۔

انگریز نے سات سمندر پار سے آکر ہندوستان میں حکومت قائم کی۔ اپنی حکومت کے استحکام میں اسے اگر کوئی خطرہ نظر آتا تھا تو وہ مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ وہ سیّد احمد (شہید) بریلوی اور شاہ اسمٰعیل (شہید) دہلوی کی تحریک جہاد میں دیکھ چکا تھا کہ امت مسلمہ کے اس راکھ کے ڈھیر میں ابھی وہ چنگاریاں دبی ہوئی ہیں جو تھوڑی سی موافق ہوا سے شعلہء جوالہ بن سکتی ہیں۔ بظاہر وہ تحریک بالاکوٹ میں دفن ہوچکی تھی۔ لیکن اس کی روح بدستور زندہ تھی اور 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد "وہابی تحریک" کی شکل میں سلگ اور سرک رہی تھی۔ انگریز اس سے خائف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے تشدد سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسے مذہب ہی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے پہلے انہوں نے چند علماء کو تیار کیا کہ وہ جہاد کے ناجائز ہونے کا فتوی دیں۔ لیکن یہ حربہ کارگر نہ ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے سوچا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک باقاعدہ تحریک چلائی جانی چاہئے۔

مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ آخری زمانہ میں امام مہدی کا ظہور اور حضرت عیسیٰؑ کا آسمان سے نزول ہو گا۔ ان کی زیر سیاست و امامت اسلام کا پھر سے غلبہ ہو جائے گا۔ اس تحریک کے لئے

جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک ایسا مہدی اور مسیح موعود آجائے جو ان کے جذبہء انتظار کی بھی تسکین کردے اور جہاد کے خطرہ کو بھی دور۔۔۔۔۔ یہ تھی اس تحریک کی وجہء تخلیق اور یہ تھا وہ مقصد جسے مرزا صاحب نے پورا کرنے کی مذموم کوشش کی۔"

(صفحہ 130)

"آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ رسول اللہؐ کے بعد، باب نبوت کے کھل جانے کا بنیادی سبب "ایک آنے والے کے انتظار" کا عقیدہ ہے۔ ختم نبوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے آنے والوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ جس نے آخری بار آنا تھا چودہ سو سال پہلے آگیا۔ اب خدا کی طرف سے کوئی نہیں آئے گا۔ نہ ہی اب کوئی

خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل کر سکے گا۔ خدا نے جو کچھ بنی نوع انسان سے کہنا تھا اسے اس نے آخری مرتبہ کہہ دیا، اور اب وہ قرآن مجید کے اندر مکمل شکل میں محفوظ ہے۔ تمّتْ کَلِمتُ رَبّکَ (6/115) کے معنی یہی ہیں کہ خدا نے جو باتیں (کلام) انسانوں سے کرنا تھیں ان کا اتمام ہو گیا۔ اب کوئی ایسی بات باقی نہیں رہی جسے اس نے انسانوں سے کرنا ہو۔ لہٰذا خدا کے ساتھ مخاطبات و مکالمات کا امکان تمّتْ کَلِمتُ رَبّکَ کے منافی اور عقیدہء ختم نبوت کے متناقض ہے۔ "آنے والے" کا نظریہ یکسر غیر قرآنی ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا۔ دنیا کے ہر مذہب میں "آنے والے" کا عقیدہ تھا اور اسلام کو ان پر اس لحاظ سے برتری حاصل تھی کہ اس میں "آنے والے" کا عقیدہ نہیں تھا جو اس کے مکمل ہونے کی دلیل تھی۔ ان اہل مذاہب نے اسلام کی اس برتری کو ختم کرنے کے لیے وضعی روایات کے ذریعے "آنے والے" کا عقیدہ ہمارے ہاں بھی رائج کر دیا۔ اور اسے اس قدر اہمیت دی کہ وہ کفر و اسلام کا معیار قرار پا گیا۔ جب تک یہ عقیدہ ہم میں باقی رہے گا جھوٹے مدعی پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہم اپنے ہر عقیدہ اور نظریہ کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار خدا کی کتاب (قرآن مجید) کو قرار دیں۔" (صفحہ 196-197)

حدیث

اب آتا ہے حدیث کا موضوع۔ اس کی وجہ سے علامہ غلام احمد پرویز صاحب کی شخصیت بڑی متنازعہ رہی۔ پرویز صاحب نے مجموعہ روایات کو بھی قرآن کریم اور عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور ان کی اس حیثیت کو براہ راست تنقید کا نشانہ بنایا جو اس وقت معاشرے میں رائج ہے۔ ان کی اس موضوع پر تصنیف "مقام حدیث"

ہے۔ اور ہمارا علماء کا طبقہ بجائے اس کے کہ عقل و بصیرت اور دلائل و براہین کی روشنی میں پرویز صاحب کے اعتراضات کا جواب دیتا۔ الٹا ایک ہزار علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امت مسلمہ جتنے بھی فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ روایات ہی ہیں۔ اور مذہبی طبقہ کی یہ کمزوری (فرقہ بندی) پرویز صاحب کے لیے خاصا فائدہ مند ثابت ہوئی اور اس پر انہوں نے مذہبی علماء کو خوب تنقید کا نشانہ بنایا۔ اور قوم کا پڑھا لکھا طبقہ ان دلائل کو قبول کرنے لگا۔

اس وقت جتنے بھی فرقے موجود ہیں۔ ان کا مختلف مسائل پر آپس میں شدید اختلاف ہے۔ اور ان مسائل کی بنیاد روایات ہیں۔ اور عملی طور پر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی روایات کا منکر ہو رہا ہے۔ اور اس بنیاد پر تمام فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن پرویز صاحب کی یہ بات قابل تعریف ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کو معیار بنایا جائے اور اس کے مطابق جو روایات ہیں انہیں قبول کیا جائے۔ اور جو اس کے خلاف جاتی ہیں انہیں رد کر دیا جائے۔ اور ایسی بہت سی روایات پرویز صاحب نے "مقام حدیث" میں بیان کی ہیں۔

صحاح ستہ میں سب سے اعلیٰ مقام بخاری شریف کو حاصل ہے۔ جسے "اصح الکتب بعد از کتاب اللہ" کہا جاتا ہے۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ میں بذات خود بخاری شریف خریدنے بازار گیا تو دکاندار نے تین قسم کی "بخاری شریف" میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے کہا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ دکاندار بولا۔ ایک بخاری شریف "اہلسنت" حضرات کی ہے۔ دوسری بخاری شریف "اہلحدیث" حضرات کی ہے۔ اور تیسری بخاری شریف "دیو بند" حضرات کی ہے۔ میں تو سر پکڑ کر واپس آ گیا۔ یعنی ہر فرقے نے اپنی پسند کی احادیث کے مجموعے متعین کئے ہوئے ہیں۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ نے تو ایک ہی کتاب تحریر فرمائی تھی۔

اس کے بعد ایک بہت بڑا مسئلہ یہ کہ علماء حضرات کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر احادیث کی روسے ہی جائزہے اور یہ وہ تفسیر ہے جسے حضورؐ نے خود بیان کیا ہے۔ اس چیز نے من پسند تفاسیر کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا مظاہرہ آپ قرآن کریم کی ان تفاسیر میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان میں تراجم میں تو کم ہی اختلاف ہے مگر حاشیہ پر اپنی پسند کی روایات کے ذریعے قرآن کریم کو اپنے مسلک کے نظریات میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے بعد سب سے اہم مسئلہ یہ کہ ان کتب روایات کے اندر حضور نبی کریمؐ، امہات المومنینؓ اور صحابہ کبارؓ کی ذات پر جو کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ اس کے متعلق علماء حضرات خاموش ہیں۔ اکا دکا کسی عالم سے بات ہوتی ہے تو وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ان کتب میں وضعی روایات یا اسرائیلیات بھی موجود ہیں۔ مگر اس بات کا سہرا علامہ غلام احمد پرویز صاحب کے سر ہی جاتا ہے جنہوں نے ایسی غلط روایات کو جن میں ابنیائے کرامؑ، امہات المومنینؓ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو، ان کتب سے نکالنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کتب روایات میں موجود ''باب الغسل، باب الحیض، باب النکاح، باب الطلاق'' وغیرہ میں ایسی روایات بیان کی گئی ہیں جو معاذاللہ کوئی باپ بیٹی کے سامنے نہیں پڑھ سکتا اور کوئی بہن اپنے بھائی کے سامنے نہیں پڑھ سکتی۔ اس کے جواب میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ ''شرع میں کوئی شرم نہیں'' ۔ ان سے پوچھا جائے کہ کیا اللہ اور رسولؐ سے زیادہ بھی کوئی حیادار ہے؟ پورے قرآن کریم میں کوئی ایک ایسی بات جو اخلاقی لحاظ سے قابل گرفت ہو تو کوئی نکال کر دکھائے۔ یہاں تک کے نجی زندگی کے معاملات میں بھی اشارے کنائے استعمال ہوئے ہیں۔ جس ذاتؐ کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ اے نبی کریمؐ! آپ تو اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ '' وہ ذات کس طرح اخلاق سے گری بات بیان کر سکتی ہے۔ یا اپنی نجی زندگی کی تفصیلات بیان کر سکتی ہے۔ علمائے کرام کی قیامت کے روز اس بات پر سخت پکڑ ہو جانی ہے۔ اللہ تعالی ہمارے علمائے کرام کو توفیق دے کہ وہ قرآن کریم کی روشنی میں ان روایات کی حدود کا تعین کر سکیں۔

آیئے اب علامہ غلام احمد پرویز صاحب کی کتاب ''مقام حدیث'' کے کچھ اقتباسات

نقل کرتے ہیں جن سے واضح ہو گا کہ اصل میں "حدیث" کے موضوع پر پرویز صاحب کا نقطہء نظر کیا ہے۔

"پھر سن لیجئے کہ اگر قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کے متعلق یقین سے کہا جا سکے کہ وہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے تو اس کے سامنے کونسے مسلمان کا سر نہیں جھکے گا؟ لیکن جب واقعہ یہ ہو کہ آپ کسی حدیث کے متعلق بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ قول رسولؐ ہے۔ تو اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ قرآن کی یہ تفسیر رسول اللہؐ کی نہیں ہے تو وہ رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیر سے انکار نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے صرف یہ ہے کہ جس تفسیر کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ در حقیقت رسول اللہؐ کی ہے نہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر امام بخاریؒ پانچ لاکھ چورانوے ہزار احادیث کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ان کی دانست میں وہ رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں۔ اور اس سے وہ منکر حدیث قرار نہیں پاتے۔ تو اگر آج کوئی شخص ایک حدیث کے متعلق کہتا ہے کہ اس کی بصیرت قرآنی کی رو سے وہ رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتی۔ تو وہ کافر اور خارج از اسلام کس طرح قرار پا سکتا ہے۔؟ وہ در حقیقت ایک جامع حدیث کے فیصلے یا راوی کی روایت کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے۔ ارشاد نبویؐ سے انکار نہیں کرتا۔ وہ قول رسول سے انکار نہیں کرتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جس قول کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ رسول اللہؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔" (مقام حدیث 31)

"ہمارے احادیث کے مجموعوں میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی ہے جن کا تعلق نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے حالات و کوائف سے ہے۔ حضورؐ کی سیرت اقدس، انسانی شرف و مجد کی معراج کبری تھی۔ لیکن بد قسمتی سے ان روایات میں بعض ایسی بھی ہیں جن سے آپ کی سیرت داغدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ حضورؐ کی سیرت مقدسہ قرآن کریم کی روشنی میں از سر نو مرتب کی جائے۔ اور کتب روایات میں سے صرف وہی حصہ لیا جائے جو قرآن کریم کے مطابق ہو۔ جو روایات قرآن کریم کے خلاف ہوں یا ان سے حضورؐ یا صحابہ کرامؓ کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو۔ انہیں مسترد کر دیا جائے۔" (صفحہ 49)

"حدیث کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں میرا مسلک یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کریم

کے خلاف ہو، میں اسے صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ حضور نبی کریمؐ کا کوئی ارشاد یا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا تھا۔ ایسی حدیث کے متعلق میں کہتا یہ ہوں کہ وہ حضورؐ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ اسے آپؐ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ میں حضورؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ خلاف قرآن حدیثوں کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ حضورؐ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں۔ جو حدیثیں قرآن کریم سے نہیں ٹکراتیں، میں انہیں صحیح تسلیم کرتا ہوں۔ میری متعدد تصانیف میں اس قسم کی سینکڑوں حدیثیں موجود ہیں۔" (قرآنی فیصلے ، جلد پنجم، صفحہ 318)

"جو شخص رسول اللہؐ کے کسی ارشاد یا حضورؐ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے۔ میرے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ اسلئے کہ حضورؐ کے ارشادات و اعمال حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے۔ جسے خدا نے تمام انسانیت کے لیے اسوئہ حسنہ قرار دیا ہے۔ اس اسوئہ حسنہ سے انکار نہ صرف انکار رسالت ہے بلکہ ارشاد خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے۔" (سوچا کرو)

{☆☆☆☆☆}

نقدِ امتیاز *

صفحہ نمبر 147۔

قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھنے کے بعد چار پرندے پکڑے ہوں اور پھر انھیں اپنے سے مانوس کرنے کے بعد انھیں ذبح کیا ہو یا انھیں الگ الگ پہاڑوں پر رکھ کر انھیں بلایا ہو۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ جوں ہی اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا۔ بات ابراہیمؑ کی سمجھ میں آگئی۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسے آیت مباہلہ میں نصاریٰ کو چیلنج دیا گیا مگر وہ مقابلہ پر آئے ہی نہیں۔ لہٰذا جس طرح مباہلہ ہوا ہی نہیں۔ اسی طرح ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جو بات سمجھائی وہ انھیں سمجھ میں آگئی کہ روزمرہ کے مشاہدہ میں یہ آنے والی بات ہے۔

صفحہ نمبر 149۔ پہلا پیرا

ہماری رائے میں یہ پیراگراف حذف کرنا چاہیے کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ نہ ہی پرندے پکڑے گئے نہ ہی ذبح کئے گئے جیسا کہ پیچھے حاشیہ دیا گیا ہے۔

صفحہ نمبر 158۔

عبدالکریم اثری صاحب تفسیر عروۃ الوثقیٰ نے ان آیات کی الگ سے توجیح کی ہے۔ آں محترم کی رائے ہے کہ سلیمانؑ کو شرعاً ملکہ کے تخت کو بغیر بتائے اٹھوانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیونکہ اس طرح تو ایک نبی پر سرقہ

کا الزام آتا ہے۔ شیخ کہتے ہیں کہ لوگ اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ کیسے منگوایا۔ اور ہم کہتے ہیں کس حیثیت سے منگوایا؟ اس کے لیے تخت یعنی پروٹوکول کے حساب سے جس پر اس نے آکر بیٹھنا ہے اور تخت بھی بعینہٖ ویسا ہی بنوایا بس تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی۔ ہم روزمرہ کی زبان میں تمہاری چائے بولتے ہیں تو تمہارے لیے چائے۔ کسی مہمان سے

* محترم امتیاز صاحب (راولپنڈی) نے اس کتاب پر یہ تبصرہ لکھا ہے۔ جو من و عن شائع کیا جارہا ہے۔

کہتے ہیں تمہارا کمرہ یہ ہے تو اس سے مراد اس کے لیے کمرہ ہوتا ہے نہ کہ کمرہ کی ملکیت مراد ہوتی ہے۔ بس اس اسلوب پر "بعرشھا" سے مراد اس کے لیے تخت اور " الذی عندہ علم من الکتب" سے مراد وہ شخص ہے جو اعلی درجہ کا کاریگر تھا۔ جو اس کام میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ کتاب سے مراد آسمانی کتاب نہیں بلکہ اس علم کی کتاب تھی جس سے فنی کام لیا جائے۔ آج بھی ہر شعبہ کی تکنیک کے لیے کتابیں ہوتی ہیں۔ اگر آسمانی کتاب مراد لیں تو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف ایک آدمی کو کتاب کا علم دیا گیا تھا؟ اور ایسی کون سی کتاب تھی جو دیگر رسولوں کو نہیں ملی؟ نہ کسی اور رسول کے صحابی ایسا علم جانتے تھے کہ سینکڑوں میل دور کی منوں وزنی چیز سیکنڈوں میں اٹھالائیں؟

شیخ عبد الکریم کی تاویل از حد قابل غور ہے۔

صفحہ نمبر 162۔

قرآن میں کہاں ہے کہ عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے؟ 114 سورتوں میں تو نہیں۔

وفات عام انسانوں کی طرح نہیں یہ کہاں ہے؟ قرآن تو انکی وفات کا ذکر کرتا ہے۔19 /33، 3/55، 5/117۔ رفع کا معنی اگر حقیقی کرتے ہیں تو پھر الیہ کا معنی بھی حقیقی کرنا چاہیے۔ جو ہو نہیں سکتا۔ یعنی اللہ کی طرف (الیہ) جہاں اللہ وہاں ہی مسیح کو بھی ماننا پڑے گا۔ فافہم فتدبر والہذا آیت کا معنی مجازی ہی ہو سکتا ہے۔

صفحہ نمبر 173۔

قرآن کریم میں بن باپ کا لفظ نہیں بلکہ کسی حدیث میں بھی بن باپ کا لفظ نہیں۔

صفحہ نمبر 175۔

دونوں کو ایک طرح کے جواب سے بات ثابت ہوتی ہے کہ جیسے یحیٰؑ پیدا ہوئے۔ ماں باپ کے ملاپ سے ۔ویسے ہی سیدنا عیسیٰؑ بھی پیدا ہوئے۔ فافہم فتدبروا

صفحہ نمبر 176۔

دیکھیں جو قانون پیدائش وحیات وموت کا یحیٰؑ کے لیے بتایا ہے وہی سیدنا عیسیٰؑ کے لیے بھی اگلی آیات میں بتایا گیا ہے۔ دونوں انبیا کی پیدائش وحیات وموت میں کوئی فرق نہیں۔

صفحہ نمبر 177۔

اللہ تعالی ہمیں عدل سے بات کرنے اور عدل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ آپ کی ولادت و وفات عیسیٰؑ سے متعلق تقریباً تمام شرح غلط ہے۔ اگر صرف زکریاؑ کی بیوی ہی درست کی گئی تھیں اور زکریاؑ درست نہیں کئے گئے تھے تو پھر تو یحییٰؑ بھی بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ جس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ قرآن میں ہے "اصلحنا لہ زوجہ" ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی کو درست کر دیا۔ لہ کے لفظ نے صاف اشارہ کر دیا کہ نقص صرف بیوی تھا۔ جسکی وجہ سے اولاد نہیں ہو رہی تھی۔ زکریاؑ میں سوائے بڑھاپے کے کوئی نقص نہیں تھا اور بوڑھا آدمی جماع کر سکتا ہے۔ آج کل تو میڈیا پر آئے دن خبریں آتی ہیں۔ کہ 70-75 سالہ بوڑھے نے جوان لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ پھر انکی اولاد بھی ہوتی ہے۔ ورنہ اگر یہ مان لیں کہ صرف بیوی کو درست کیا تھا اور زکریاؑ کو درست نہ کیا جاتا تو یا تو یہ مانیں کہ یحییٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ یا یہ مانیں کہ اللہ تعالی نے صرف بیوی کو ٹھیک کیا خاوند کو نہ کیا پھر تو اللہ تعالی کی غلطی نکلی۔ اور پھر یہ بھی بتانا آپ کی ذمہ داری ہو گی کہ یحیٰؑ کیسے پیدا ہوئے؟ اگر آپ کہیں کہ بطور معجزہ تو پھر بیوی کو بھی ٹھیک کرنیکی کیا ضرورت تھی۔ پھر غور فرمائیں زکریاؑ کو بشارت دینے کے بعد ولادت یحییٰؑ کا ذکر نہیں بلکہ فرمایا جاتا ہے۔ اے یحیٰؑ کتاب کو مضبوطی سے پکڑو۔ پیدا ہوئے، جوان ہوئے، نبی بنائے گئے یہ سب باتیں بدیہی تھیں لہذا حذف کر دی گئیں۔ یحییٰؑ کو نبوت جب دی گئی تو قرآن نے اس عمر کے لیے جیسا کہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا ترجمہ لڑکپن کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لڑکپن سے مراد 8-10 سال کی عمر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کتاب عاقل بالغ سمجھ دار انسانوں کو ہی دی جاتی ہے یہاں صبیّاً سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ دیگر انبیا کے مقابلہ میں کم عمری میں (مثلاً 20 سال یا اسکے قریب ہی کی عمر) نبوت دی گئی۔ اسی طرح عیسیٰؑ سے متعلق جو گود میں بولنا مراد لیا جاتا ہے تو درست نہیں۔ اللہ تعالی نے کیا انھیں گود میں ہی نبوت عطا فرمائی اور جو بچہ کتاب اٹھا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے تبلیغ کتاب پر مامور کیا تھا۔ سب سے قابل غور بات یہ ہے کہ اگر الزام سیدہ مریم پر بدکاری کا تھا۔ تو پھر عیسیٰؑ کو جواب میں کہنا چاہیے تھا کہ میں بن باپ کے اللہ کی قدرت سے پیدا ہوا ہوں۔ میری ماں بے قصور ہے اور پاکدامن ہے۔ مگر قرآن میں تو یہ جواب نقل نہیں ہوا۔ بلکہ فرمایا میں اللہ کا بندہ ہوں اس

نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور نبی بنایا ہے۔ بتائیں ماں کی براۃ اس جواب سے کیسے ثابت ہوئی؟ لہذا نہ ہی عیسیٰؑ دودھ پیتے بچے تھے نہ ہی مریم پر بدکاری کا الزام تھا نہ ہی یحییٰؑ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

مزید دیکھیں سیدہ مریمؑ کو بھی جب بچہ بشارت دی گئی تو انھوں نے بھی دو وجہ سے بچہ پیدا ہونے پر تعجب کا اظہار کیا۔ 1۔ لم یمسسنی بشر 2۔ لم اک بغیا انسان کو بچہ صرف دو طرح ہو سکتا ہے جائز یا ناجائز۔ لم اک بغیا میں ناجائز بچہ کی نفی کی اور ظاہر ہے کہ اس سے پہلے لم یمسسنی بشر میں جائز بچہ کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں بشر سے مراد خاوند ہے کہ اس کے مقابل زنا یا بدکاری کی نفی کی گئی ہے۔ پھر یہاں مریمؑ کو بھی اللہ تعالی کی جانب سے وہی بات کہی گئی جو زکریاؑ کو کہی گئی تھی 'کذلک' اب اگر یحییٰؑ کذلک کے نتیجہ میں فطری طور پر پیدا ہوئے تو عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کذلک کے لفظ کی وجہ سے اسی طرح ہوئی۔ جیسے یحییٰؑ پیدا ہوئے۔ سورۃ الانعام آیات 84-87 میں 18 انبیا کا ذکر ہے جن میں عیسیٰؑ بھی شامل ہیں۔ اور ان سب کے آباء کا ذکر ہے لہذا قرآن میں عیسیٰؑ کے والد کا ذکر آیا ہے۔ پھر انہی کے بہن بھائیوں اور اولادوں کا بھی ذکر ہے۔ اب عیسیٰؑ کے اولاد تھی تو پھر شادی بھی ہوگی۔ بہن بھائی تھے تو انکی والدہ کی شادی بھی قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔

صفحہ نمبر 180۔

1۔ یحییٰؑ کے لیے بھی یہی لفظ صبیّا آیا ہے وہاں کوئی بھی شیر خوارگی مراد نہیں لیتا۔ اس میں یحییٰؑ کو صبیا اللہ تعالی نے کہا اور عیسیٰؑ کو فی المھد صبیا لوگ کہہ رہے ہیں جو مریم سے بھی بڑے ہیں۔ قرینہ اس کا یہ ہے کہ وہ مریم کے ماں باپ کو بطور مثال پیش کر رہے ہیں۔ لہذا عیسیٰؑ کے جواب سے کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماں کی صفائی پیش کر رہے ہیں؟ لہذا فی المھد صبیا اللہ کا قول نہیں مریم کے قبیلہ کے بزرگوں کا ہے۔

2۔ قرآن میں ہے اللہ کے اولاد کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی تو بیوی ہی نہیں۔ اس مقام سے ظاہر ہے وہ جس کو بھی ولد کہیں اس کے لیے ماں باپ کا ہونا لازم ہے۔ دیکھیں الانعام 101

3۔ یہ بھی کمزور بلکہ غلط دلیل ہے۔ پورے قرآن میں سب سے زیادہ موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ اور جگہ جگہ ام موسیٰ۔ موسیٰؑ کی والدہ کا ذکر ہے والد کا ذکر ایک مقام پر بھی نہیں۔ والدہ کی نسبت سے تذکرہ کی دو وجہیں ہیں۔ 1۔ انکی ماں بھی انسان تھیں الہ نہیں۔ 2۔ تمام مصائب کو سیدہ مریمؑ نے ہی جھیلا۔ آپ غور فرمائیں عیسیٰؑ کو بن باپ کے پیدا کرنا تھا تو قرآن میں کہہ دیا جاتا کہ بن باپ کے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن میں کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ معجزہ بھی لوگوں کو اس وقت دکھایا جاتا ہے جب نبی کی نبوت کو چیلنج کیا جائے۔ یہاں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔

صفحہ نمبر 181۔

1۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ عیسائیوں کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ عیسیٰؑ بھی رسول ہیں الہ نہیں۔ اور تین نہ کہو میں مریمؑ کی الوہیت کی بھی نفی ہے باقی روح کے معنی کے لیے 78/38، 26/193، 40/15، 16/2، 42/52 وغیرہ آیات پر تدبر فرمائیں۔

مائدہ آیت نمبر 75 میں بھی اثبات رسالت عیسیٰؑ اور ابطال الوہیت عیسیٰؑ و مادر عیسیٰؑ کی تعلیم ہے کھانا۔ کھانے والے انسان ہوتے ہیں۔ ام موسیٰؑ کے حوالہ جات کے لیے 7/150، 28/10 اور 20/94 میں ہارونؑ موسیٰؑ کو اے میری ماں کے بیٹے کہہ رہے ہیں کیوں؟ کیونکہ انکی والدہ کی بہت قربانیاں تھیں۔ سورۃ الاعراف کی آیت 150 میں بھی ہارونؑ نے انھیں اے میری ماں کے بیٹے ہی کہا ہے۔ اب اگر عیسیٰؑ ابن مریم سے عیسیٰؑ بغیر باپ کے ثابت ہوتے ہیں تو پھر موسیٰؑ بھی بن باپ کے بلکہ ہارونؑ بھی بن باپ کے ثابت ہوتے ہیں۔

2۔ اس آیت سے پیدائش آدم و عیسی میں مثلیت ثابت کرنا قرآن سے حد درجہ عدم تغافل کی دلیل ہے۔ آیت میں پیدائش کا کوئی اشارہ تک بھی نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ آدمؑ پیدا ہوئے ہی نہیں کیونکہ ان کے ماں باپ تو تھے ہی نہیں۔ اور نہ ہی قرآن میں انھیں ولد کہا گیا ہے۔ عیسیٰؑ کو ولد کہا گیا ہے۔ لہٰذا آدم سے پیدائش میں مثلیت ہو نہیں سکتی۔ حق بات یہ ہے کہ آدم سے مثلیت انسان ہونیکی حیثیت میں ہے نہ آدم الہ تھے نہ ہی کسی نے آدم کو الہ مانا۔ ویسے ہی عیسیٰؑ بھی انسان ہیں الہ نہیں۔

صفحہ نمبر184۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوا کہ ابراہیمؑ و زکریاؑ کو بھی بچے فطری عمل کے ذریعہ ہی عطا ہوئے۔ اور انسانی ضابطوں کے تحت ہی اولاد دی گئی۔

صفحہ نمبر189۔

ولادت مسیح کے باب میں اگر پرویز صاحب کمزور باتیں لکھ گئے تو آپ بھی وہی خطا کر رہے ہیں پہلے لکھا کہ صرف زکریاؑ کی بیوی تندرست ہوئیں۔ اب صرف 'بوالدتی' سے استدلال پھر ایسی ہی بات ہے قرآن عربی مبین میں ہے اور تمام ضروری باتوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔6/114، 10/37، 12/111 بے شمار بچوں کے باپ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ لکھا جا چکا ہے کہ موسیٰؑ کی بھی صرف والدہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ بعینہٖ یہاں بھی یہ معاملہ ہے۔ قرآن صاف کہہ سکتا تھا کہ بن باپ کے عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ صفحہ 146 پر آپ نے لکھا ہے کہ "عیسیٰؑ خدا کی قدرت سے بن باپ کے پیدا ہوئے" اب صرف بوالدتی سے بن باپ کے پیدائش ثابت کرنا اسی غلطی کا اعادہ ہے۔ جو حضرت پرویز کر گئے ہیں۔ یعنی اپنی بات کو خدا کے کلام میں ڈالنا۔ آپ سورۃ

انعام پر غور فرمائیں۔ ومن ابائھم وذریتھم واخوانھم یہ تینوں رشتے عیسیٰؑ کے والد، ان کی والدہ، ان کی والدہ کی شادی اور عیسیٰؑ کی اولاد بتا رہے ہیں۔ حیرانی اور افسوس کہ مسلمان مسیح علیہ السلام کے لیے تینوں رشتوں کے منکر ہیں۔ عیسیٰؑ کی ذریت مانیں تو انکی شادی اور بھائی بہن مانیں تو مریم کی بھی شادی ثابت ہو جاتی ہے۔

صفحہ نمبر 193۔

دھیان رہے رفع کا معنی اگر حقیقی کریں تو الیہ کا بھی حقیقی کرنا پڑے گا۔ جو ناممکن ہے لہذا رفع کا معنی بھی مجازی ہی کرنا پڑے گا۔

صفحہ نمبر 200۔

یہودی الزام لگا رہے ہیں کہ عیسیٰؑ کو قتل کر دیا ہے اور قتل بھی صلیب پر چڑھا کر، بہت بدترین موت۔ بس قرآن سیدنا عیسیٰؑ کے قتل و صلیب کی نفی فرما رہا ہے نہ کہ موت کی۔ یہود کا دعوی غلط تھا۔ قرآن نے قطعی طور پر فرما دیا وما قتلوہ یقینا۔ آپ جو معنی فرما رہے ہیں "میں تجھے پورا پورا لے لوں گا" یہ معنی قرآن میں استعمال ہی نہیں ہوا۔ محمد اور یوسف علیہما السلام کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وہاں موت ہی معنی کئے گئے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر عیسیٰؑ کو زندہ جسد مادی کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔ تو اب کبھی زمین پر واپس نہ آئیں گے۔ کیونکہ اگر واپس

نزول فرمائیں تو قرآن میں ان آیات کے مفہوم میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ قرآن میں ان آیات کے تحت مان رہے ہیں کہ عیسیٰؑ آسمانوں پر زندہ ہیں دراں حالانکہ وہ زمین پر زندہ چل پھر رہے ہوں گے۔ اور کچھ عرصہ بعد انکی وفات ہو گی تو پھر ہم قرآن میں پڑھ رہے ہونگے کہ عیسیٰؑ آسمانوں پر زندہ ہیں دراں حالیکہ انکی قبر زمین پر ہو گی۔

پھر سورہ صف میں بھی ان کا قول نقل ہوا ہے۔ کہ ''مبشراً برسول یاتی من بعد اسمہ احمد'' اب وہ تو کہہ گئے ہیں کہ میرے بعد احمد آئیں گے۔ جبکہ احمد کے بعد پھر عیسیٰؑ آئیں گے۔

''متوفیک'' کا معنی ابوالکلام آزاد اور عبد الحق حقانی نے اپنی اپنی تفاسیر میں ''جب تونے میرا وقت پورا کر دیا'' جب تونے مجھے وفات دی''۔ کیا یہ بھی درست لگتا ہے 13 / 40 میں محمدؐ کے لئے موت ہی مانا گیا ہے۔

صفحہ نمبر 201۔

الیہ کا معنی آپ بھی مجازی ہی کر رہے ہیں۔ تو رفع کا بھی معنی مجازی کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی آیت کے آدھے ٹکڑے کا معنی مجازی کریں اور آدھے کا حقیقی۔ سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 144 کا ترجمہ کسی بھی قاعدہ سے وہ نہیں بنتا جو آپ اور جمہور علما کر رہے ہیں۔ تقلب کا معنی قرآن میں اٹھنا آیا ہی نہیں۔ 33/ 66، 3/ 144، 6/ 110 اور فی السماء کا معنی آسمان کی طرف ہو ہی نہیں سکتا۔ فلنولینک بغیر کسی صلہ مثلاً عن یا الی کے آئے تو اس کا معنی بھی پھیرنا ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ تولیت کا معنی دیتا ہے۔ انفال آیت 34 پڑھیں اور البقرۃ 142 میں صلہ کے ساتھ (عن) آیا ہے۔ وہاں 'پھرنا' مراد ہے۔ قرآن میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کا آسمان پر ہونا آیا ہے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی طور پر ہی بلند ترین ہستی کے لیے بلند ترین مقام کے طور پر آیا ہے۔ خود آگے آپکی وضاحت بھی کمزور ہے کہ ذہن اوپر اللہ کی طرف ہی جائے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہے مگر اللہ تعالیٰ کسی ایک مقام پر تو انسانوں کی طرح نہیں رہتے۔ جبکہ عیسیٰؑ انسان ہیں وہ اگر آسمان پر ہوں تو کسی ایک جگہ پر ہو سکتے ہیں۔ حق بات یہی لگتی ہے کہ مسیح علیہ السلام کے لیے توفی کا وہی معنی کرنا چاہیے جو محمد اور یوسف علیہما السلام کے لیے کرتے ہیں۔ اور رفع کا معنی تو مجازی ہی ہو سکتا ہے۔ حقیقی کی گنجائش نہیں کہ رفع کا معنی حقیقی کریں اور الیہ کا مجازی۔

صفحہ نمبر 205۔

1۔ صرف عیسیٰؑ کیلئے رفع کا لفظ اس لیے لایا گیا ہے کہ صرف عیسیٰؑ کو لعنتی کی موت (نعوذ باللہ) مارنے کا دعوی کیا گیا۔ نہ صرف دعوی بلکہ یقین کر لیا گیا کہ عیسیٰؑ کو صلیب پر کیلیں ٹھونک کر مار دیا گیا۔ ان کے لیے قرآن میں مطھرک من الذین کفروا 3/55 کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اس آیت میں متوفیک کا معنی پورا پورا لے لوں گا غلط ہے۔ کوئی مثال قرآن سے یا کلام عرب سے پیش کریں کہ کسی انسان کو پورا جسم سمیت لے لینے کے معنوں میں یہ لفظ آیا ہو۔ کل نفس ذائقۃ الموت میں ہم اللہ کو پابند نہیں بنا سکتے مگر قرآن میں جو بات اللہ تعالی بتا دیں تو وہ قانون بن جاتا ہے۔ اللہ تعالی اپنی کہی ہوئی بات سے نہیں پھرتا۔ قرآن میں جگہ جگہ متوفی موت کے لیے ہی آتا ہے۔ اسماء الرجال کی کتب اٹھائیں۔ ہر راوی کے حالات میں پیدائش کا سند اور مرنے کا سند لکھا ہوتا ہے۔ مرنے کے لئے المتوفی لکھا ہوا ہے۔ مثلاً ابن تیمیہ المتوفی 728ھ۔

متوفیک کا صحیح معنی جس میں "پورا" کا لحاظ ہو وہی ہے۔ جو ابو الکلام نے کیا ہے جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا۔

صفحہ نمبر 218۔

قرآن میں ہے کہ رسول اللہ کو صرف قرآن ہی معجزہ (آیت) کے طور پر ملا تھا۔ العنکبوت 50-51 اور نبی کریم سے معجزات روک دیئے گئے تھے۔ 17/59۔ اور اسرا کے لیے بھی "الرویا" خواب کا لفظ آیا ہے۔ 17/60۔ لہذا "اسرا" بھی خواب تھا۔

صفحہ نمبر 219۔

بے شک پرویز صاحب کا مفہوم نا قابل قبول ہے۔ مگر چونکہ قرآن میں محمدؐ کے لیے معجزات کی نفی ہے ۔(دیگر انبیاء کو معجزات دیئے گئے مگر محمدؐ کو بطور معجزہ صرف قرآن دیا گیا۔) لہذا چاند پھٹنا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ قرآن میں ہے کہ وجمع الشمس والقمر القیامۃ آیت 9۔ چاند پھٹنے کا وقوعہ قیامت کو ہو گا۔

صفحہ نمبر 224۔

1۔ اللہ تعالی کے لیے ہر گز یہ جملہ استعمال نہیں کرنا چاہیے کہ "اللہ تعالی بھی قانون کا پابند نہیں۔" اللہ تعالی نے انسانوں کے عذاب و ثواب اور مغفرت یا عدم مغفرت کے متعلق قرآن میں تفصیلی احکام بیان کر دیئے ہیں۔ منیب و متقین و صادقین کو یقینا نجات ملے گی اور کفار و فاسقین و ظالمین کو یقینا جہنم۔ 3/127-128 میں بھی نبی کریم کو تسلی دی جا رہی ہے کیونکہ جب ان کے مخاطبین ایمان نہ لا کر مستحق عذاب ٹھہر رہے تھے۔ تو نبی کریم از حد رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ آیات ملیں گی جنھیں شیخ القرآن حسین علی اور انکے تلامذہ آیات تسلیہ کہتے تھے۔ لہذا بلا شبہ پرویز صاحب کی بات اپنی جگہ غلط ہے مگر اللہ تعالی قانون کا پابند نہ ہو تو پھر کوئی عقیدہ اپنایا ہی نہیں جا سکتا۔

2۔ ہو سکتا نہیں بلکہ قرآن میں بتا دیا گیا ہے کہ تائب کی توبہ یقینا قبول ہو گی اور اسکی نجات بھی یقینی ہے۔

صفحہ نمبر 399۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ کتب احادیث میں قرآن کریم کی آیات کی تفسیر (جو نبی کریمؐ سے منسوب کی گئی ہے) سے متعلق بھی چند آیات کی تفسیر ہی موجود ہے۔ اگر نبی کریم کی ذمہ داری قرآن کی تفسیر تھی تو لازم تھا کہ ہر آیت کی تفسیر کر کے تشریف لے جاتے۔ حد یہ کہ مشکلات قرآن سے متعلق کسی بھی مشکل مقام کو حدیث سے حل نہیں کیا گیا۔ مثلاً سورۃ ص میں ایوبؑ سے متعلق 41 تا 44 کوئی صحیح روایت موجود نہیں حالانکہ اس مقام کا تقاضہ تھا کہ اسے روایت سے حل کیا جاتا۔ اگر نبی کریم کی ذمہ داری قرآن کی تفسیر بھی تھی تو اس جیسے بہت سے مقامات کی تفسیر کیوں نہیں کی گئی۔ ؟ سورۃ البقرہ 102 میں قصہ ہاروت و ماروت والا مقام بھی مشکلات قرآن میں سے ہے۔ اہل حدیث حضرات اس آیت کے حاشیہ میں تسلیم کرتے ہیں۔ "لیکن کوئی صحیح مرفوع روایت اس بارہ میں ثابت نہیں۔" تفسیر احسن البیان صفحہ 42۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جن مقامات پر قرآن کی تفسیر میں روایات آتی ہیں۔ ان میں بیشتر روایات درست نہیں۔ مثلاً سورۃ قیامۃ 16-19 ، سورۃ جمعہ آیات 9 تا 11 اور سورۃ ابراہیمؑ آیت 27 کی تفسیر میں جو روایات آئی ہیں وہ قرآن کی غلط تفسیر کر رہی ہیں۔ جو ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ نبی کی تفسیر نہیں۔

☆☆☆☆☆